Pakistanipoint
Learning Point

نورِ مُبین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنانِ صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضہ داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہتے یہ حقوق) اللہ کی طرف (مقرر کر دیئے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے (60) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو پیغمبرؐ کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے (ان سے) کہہ دو کہ (وہ) کان (ہی تو) تمہاری بھلائی کے لئے وہ اللہ کا اور مومنوں (کی بات) کا یقین رکھتا ہے اور جو لوگ تم میں ایمان لائے ہیں ان کے لئے رحمت ہے اور جو لوگ رسول اللہؐ کو رنج پہنچاتے ہیں اُن کے لئے عذاب الیم (تیار) ہے (61)

سورۃ التوبہ

pakistanipoint.com

ماہنامہ حکایت لاہور

جلد: 50 | فروری 2020ء | شمارہ: 6

بانی
عنایت اللہؒ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیرہ اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
معاون مدیر: میاں محمد ابراہیم طاہر
اعزازی مدیر: کے ایچ مجاہد
اعزازی مدیر: دستگیر شہزاد
منتظم: سعد شاہد

سرکولیشن مینجر
فضل رزاق
محمد نثار رانجھا

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
محمد زبیر
پرائم کمپیوٹرز۔ لاہور

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

مجلس مشاورت
ابدال بیلا — عظمت فاروق
میم الف — ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نغمہ علی — معظم جاوید بخاری
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564

قیمت: -/140 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے:
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

کہنے کی بات

جنگ بھی ہو اور امن بھی...... دستگیر شہزاد 11

مجاہدے

اینڈ رائڈ موبائل فون ...... کے ایچ مجاہد 14

خطوط و خیال

اظہارِ خیال قارئین 17

روحانیات

روحانیت اور علم الیقین سیّد سلیمان شاہ گیلانی 27

تاریخی ناول

بردہ قسط:12 ریاض عاقب کوہلر 33

ایک تاثر ایک کہانی

خلیج ڈاکٹر مبشر حسن ملک 69

گئے دنوں کا سراغ منزہ نصیر 213

کچھ یادیں کچھ باتیں

کاکا بوہڑی محمد نذیر ملک 81

طنز و مزاح

عدبی عجلاص خادم حسین مجاہد 87

کرے کوئی بھرے کوئی ادریس انور کھوٹ 239

یہ تیرے پُراسرار بندے عنایت اللہ/ انتخاب: اصغر علی جیدی 261

نقطۂ نظر

پاکستان دارالمسائل سیّد ریاض الحسن 93

جگ بیتی

کچا رشتہ ممتاز احمد 97

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

فہرست

چار دیواری کی دنیا		
ماں پھر ماں ہے	فرزانہ نگہت	105
خاکہ		
کتابی کیڑا	کالج فیلو کے قلم سے	110
آپ بیتی		
لمحوں کی صلیب پر	مرزا شبیر بیگ ساجد	113
ناقابل فراموش		
پیرزادہ قسط:1	محمد افضل رحمانی	129
دھرتی گواہ رہنا	سیّدہ شاہدہ شاہ	188
اندمال	اختر شاہ عارف	221
جنگ اور محبت		
نفرت کی فصلیں	دستگیر شہزاد	163
جرم و سزا		
انتقام، سائیں اور منہ بولی بہن	ریاض بٹ	193
مکافاتِ عمل		
بیوہ کی بددعا اور پھانسی کا پھندہ	حکیم مختار احمد ناز	227
سلسلہ وار ناول		
رکھیل آخری قسط	ریاض عاقب کوہلر	241
ضرب سکندری		
سانحہ مشرقی پاکستان	سکندر خان بلوچ	269
منظومات		
مہرباں کیسے کیسے	شرافت ضیاء	226

pakistanipoint.com

جنگ بھی ہو اور امن بھی..... یہ ناممکن ہے!

ہندو مہاراجا ہری سنگھ کے من مانے فیصلے کے نتیجے میں کشمیر کی پہلی جنگ ہوئی۔ جب مجاہدین نے آزادی کی جنگ شروع کر دی۔ 1949ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کرائی اور ایک قرارداد کے ذریعے استصواب رائے کے لئے کہا۔ بھارت نے اپنی افواج نکالنے اور ریفرنڈم کرانے کا اقوامِ متحدہ میں وعدہ کیا مگر اس پر عمل نہ کیا۔ 1965ء میں مسئلہ کشمیر پر دونوں ممالک (پاکستان، بھارت) کی جنگ ہوئی۔ سوویت یونین کی مداخلت سے جنگ بندی ہوئی۔

1971ء میں مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی بھارتی کوشش کے نتیجے میں پاک بھارت جنگ ہوئی جو بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوئی۔ 1972ء میں پاکستان اور بھارت نے شملہ سمجھوتے پر دستخط کئے جس میں تمام معاملات بالخصوص مسئلہ کشمیر کو پُرامن طور پر حل کرنے کا عہد کیا گیا۔

1989ء نام نہاد الیکشن کے بعد کشمیری حریت پسندوں کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ 1996ء کے الیکشن کا کشمیریوں نے بائیکاٹ کیا۔ 1999ء میں بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے لاہور کا دورہ کیا۔ اسی سال کارگل کی محاذ پر دونوں ممالک کی جنگ ہوئی۔ اس کے بعد کشیدگی بڑھ گئی۔ 2000ء میں مسئلہ کشمیر عالمی سطح پر فلیش پوائنٹ بن گیا۔ 24 جولائی 2000ء کو حزب المجاہدین نے جنگ بندی کا اعلان کیا۔ 8/اگست 2000ء کو بھارتی رویے کے باعث اعلان واپس لے لیا۔ علاوہ ازیں پاکستان اور بھارت کے مابین متعدد بار مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں مذاکرات ہو چکے ہیں جو بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بے سود ثابت ہوئے۔

بھارت نے ہمیشہ کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیا ہے۔ جبکہ پاکستان آج بھی بین الاقوامی اصولوں پر قائم ہے اور مسئلہ کشمیر کو ہر سطح پر پُرامن طریقے سے حل کرنے کا خواہاں ہے لیکن بھارت ہر بار چالاکی و

Pakistanipoint.com

عیاری کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔

گزشتہ 72 برسوں سے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی دہشت گردی عروج پر ہے۔ اس وقت پورا کشمیر جیل خانہ بنا ہوا ہے۔ گزشتہ آٹھ مہینوں سے وہاں کرفیو نافذ ہے۔ مواصلات کے تمام ذرائع بند کر دیئے گئے ہیں۔ کشمیریوں کا باہر کی دنیا سے رابطہ کٹ چکا ہے۔ بازار بند ہیں، لوگ گھروں میں محصور ہیں۔ ذخیرہ شدہ کھانے پینے کی اشیاء ختم ہو چکی ہیں۔ بچے دودھ کے لئے بلک رہے ہیں۔ لوگ بھوک اور بیماریوں سے مر رہے ہیں۔ باہر نکل نہیں سکتے وہ اپنے مُردوں کو گھروں میں ہی دفن کرنے پر مجبور ہیں۔ نماز کے لئے مسجد نہیں جا سکتے اور گھروں میں نماز ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ آمدورفت کے تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ نہ کوئی اندر آ سکتا ہے، نہ کوئی باہر جا سکتا ہے۔ ہر طرف موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ بھارتی افواج نام نہاد آپریشن کے بہانے گھر گھر تلاشی لیتی ہیں اور آبرو ریزی کے واقعات معمول بن گئے ہیں۔ کشمیری نوجوانوں کو گھروں سے گرفتار کیا جاتا ہے۔ بعدازاں انہیں شہید یا لاپتہ کر دیا جاتا ہے۔ کشمیری رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا ہے۔

بھارت اور مقبوضہ کشمیر کی جیلوں میں ہزاروں کی تعداد میں کشمیری نظر بند ہیں۔ بھارتی ایجنٹوں کا کشمیریوں کے گھروں میں گھس کر انہیں ذبح کرنا، کشمیری نوجوانوں کو اغوا کرنے کے بعد شہید کر کے برہنہ لاش کو درختوں سے لٹکا دینا ان کی ناک، زبان اور کان کاٹنا، عورتوں کی عزتوں کو پامال کرنا، جعلی مقابلوں میں نوجوانوں کو شہید کرنا، بچوں کو جاسوس قرار دے کر ان پر گولیاں برسا کر قتل کرنا، کشمیری خاندانوں کو دیوار کے ساتھ جمع کر کے ان پر برسٹ کے برسٹ چلا کر ان کی زندگیاں چھین لینا، راہ چلتے کشمیریوں کو تلاشی کے بہانے ہراساں کرنا، ان پر تشدد کرنا، کشمیری لیڈروں کے گھروں پر گرینیڈ سے حملہ کرنا، شہریوں کو ان کے گھروں سمیت بم سے اڑا دینا، آگ لگا کر خاکستر کر دینا۔ کریک ڈاؤن کر کے جھڑپوں میں کشمیریوں کو حراست میں لے کر شہید کرنا۔ مساجد کے پیش اماموں، دُکانداروں اور ان کے ملازمین کو شک کی بنیاد پر گرفتار کر کے بعدازاں انہیں جاسوس قرار دینا اور شہید کرنا، آئے روز کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گولہ باری کرنا جس سے اب تک بے شمار پاکستانی شہید و زخمی ہو چکے ہیں۔ ان ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف مظاہروں پر ظلم و ستم ڈھانا، قتل و غارت گری، دہشت گردی اور انسانیت سوز انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر مبنی یہ بھارتی فوجیوں اور سکیورٹی فورسز کے مظالم کی کھلی فائل ہے۔

کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعے کی اہم ترین وجہ ہے کیونکہ بھارت سارے کشمیر کے

سائل لوٹنا چاہتا ہے اور پاکستان کشمیر کو آزادی دلوانا چاہتا ہے۔ پاکستان اور بھارت جوہری طاقتیں ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان جنگ چھڑ جائے تو پورا جنوبی ایشیا جنگ کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ اس لئے اقوام متحدہ اپنا کردار ادا کرتے ہوئے پورے کشمیر میں اپنی پاس کردہ قراردادوں پر عملدرآمد کراتے ہوئے رائے شماری کرائے تاکہ خطے میں امن وسلامتی پروان چڑھے۔ اس تناظر میں پاکستان اور بھارت دوستی کے آثار نظر نہیں آتے کیونکہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، ایک ہاتھ سے نہیں۔ تاہم بھارت کی کوشش ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے بجتی رہے جو کہ ممکن نہیں۔ جنگ بھی ہو اور امن بھی، یہ ممکن نہیں۔

زندگی کی اڑان ابھی باقی ہے
غزوہ سندھ کا امتحان ابھی باقی ہے
ابھی تو ناپی مٹھی بھر زمین ہم نے
ابھی تو پورا ہندوستان باقی ہے

دستگیر شہزاد

انتقال پُرملال

سینئر شاعر، ادیب وصحافی، تحریک پاکستان کے گولڈ میڈلسٹ، معاون مدیر ''حکایت'' محترم **میاں محمد ابراھیم طاھر** کی بڑی صاحب زادی **2** فروری کو وفات پا گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ادارہ میاں صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے ستدعا ہے کہ مرحومہ کے بلند درجات کے لئے دعائے مغفرت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

خادم حسین مجاھد کو صدمہ

''حکایت'' کے ہر عدلعزیز ادیب، طنز ومزاح نگار **خادم حسین مجاھد** صاحب کی ہمشیرہ گزشتہ دنوں وفات پا گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

pakistanipoint.com

مجاہدے

اینڈرائڈ موبائل فون اور نیٹ کی تباہ کاریاں

پہلے پہل نیٹ پر چیٹ کے لئے چند ایپس (Apps) ہی موجود تھیں مثلاً فیس بک، واٹس ایپ، ایمو، مسنجر اور لائن وغیرہ جن کے نقصانات کے ساتھ ساتھ کافی فوائد بھی تھے مثلاً گپ شپ کے علاوہ دینی، ادبی، علمی اور تدریسی شیئرنگ اور تیز ترین پیغام رسانی مگر اب نیٹ پر چیٹ ایپس کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ مثلاً میلان، بگولو، وگولو، شیئر چیٹ، ٹک ٹاک، لائک وغیرہ وغیرہ جن میں لائیو اور ریکارڈڈ ویڈیو چیٹ ہوتی ہے جو زیادہ تر غیر اخلاقی ہوتی ہے۔ ان میں عموماً کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں تیز میک اپ، بھڑکیلے، چست اور فیشنی لباس میں کسی گانے پر ڈانس کرتی ہیں یا کسی پنجابی سٹیج ڈرامے کے جوک پر پرفارم کرتی ہیں۔ مردانہ آواز پر بھی اور زنانہ آواز پر بھی اور جو کسر ڈرامے میں بھانڈوں نے چھوڑی ہوتی ہے وہ پوری کر دیتی ہیں۔ یہی نہیں گانوں پر نیم عریاں اور مکمل عریاں ڈانس بھی کرتی ہیں ان میں شریف گھرانوں کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو محض نمائش کے شوق میں یہ سب کرتی ہیں کہ ان کو سراہا جائے اور ان میں پیشہ ور لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو اس طرح سے اپنی ایڈورٹائزنگ کرتی ہیں۔ عام طور پر جن لڑکیوں کی لائیو یا ریکارڈڈ ویڈیوز نیٹ پر چل رہی ہوتی ہے ان کے گھر والوں کو اس بارے میں ذرا بھی علم نہیں ہوتا جبکہ بعض گھرانوں میں والدین آزادی اور جدیدیت کا تقاضا سمجھ کر اس پر خوش ہوتے ہیں۔

حکومت کی طرف سے تو اس پر کسی قسم کی روک ٹوک ہے ہی نہیں، والدین بھی لاعلم، بے بس یا مطمئن ہیں تو پھر اسے کون روکے گا۔ نئی نسل خود بخود تو اس آزادی سے دستبردار نہیں ہوگی اور والدین کی طرف سے پابندی بھی کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوگی۔ کیونکہ اکثر والدین اینڈرائڈ موبائلز کے سسٹم سے ہی ناواقف ہیں اور نہ ہی اس کے نقصانات کی شدت کو سمجھتے ہیں۔ اب صرف حکومت ہی رہ جاتی ہے جو اس پر کوئی روک لگا سکتی ہے۔ وہ بھی اگر اس کا دھیان اس طرف ہوا تو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرتی نظام شدید خطرے میں ہے کیونکہ ان چیٹس پر صرف کنوارے لڑکے

Pakistanipoint.com

لڑکیاں ہی نہیں بلکہ شادی شدہ بھی ان کے شانہ بشانہ موجود ہیں کسی کو اپنے مرد سے شکایت ہے اور اس نے لڑکوں سے خود کو کنواری ظاہر کر کے دوستی کر رکھی ہے اور اسی طرح کسی مرد کو اپنی بیوی سے کوئی شکوہ ہے تو اس نے ان گروپس پر کئی لڑکیوں سے دوستی کر رکھی ہے جو اسے کنوارا سمجھتی ہیں کیونکہ اس نے یہی ظاہر کیا ہوا ہے یعنی مغرب کی طرح گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کا سلسلہ چل رہا ہے جو بعد میں Dating تک پہنچ جاتا ہے جس کے بعد بلیک میلنگ ہوتی ہے یا گھر ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ سب اگر نہ بھی ہو تو بدکاری اور بے راہ روی تو کم از کم ہوتی ہی ہے۔ مغرب میں پہلے طلاقیں عام تھیں۔ اب تو وہ بیوی بچوں کی ذمہ داری سے بچ کر بغیر شادی کے بچے پیدا کرنا اور الگ ہو جانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے بچے گورنمنٹ پالتی ہے کہ ان کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے اور وہ کہتی ہے کہ کسی بھی طریقے سے بچے پیدا کرو..... ڈر ہے کہ ہمارے معاشرے کا بھی یہی حال نہ ہو۔ حکومت کو اس سنگین مسئلے پر فوری توجہ دینی چاہئے۔

سوشل میڈیا اور ہماری زندگی

عجب وقت آ گیا ہے کہ دنیا بھر کی اچھی، بُری، مفید، مضر، ضروری اور غیر ضروری معلومات ایک کلک کے فاصلے پر ہیں اور بچہ، جوان، بوڑھا، مرد اور عورت کوئی بھی انہیں حاصل کر سکتا ہے اور آپ چاہ کر بھی ان پر کوئی روک نہیں لگا سکتے۔ ہاں حکومتی سطح پر کسی حد تک ایسا ممکن ہے مگر حکومتوں کو اپنی کرسی بچانے سے فرصت نہیں۔ اس سے ہماری زندگیوں میں جو انقلاب آیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

آج میڈیا کی بدولت ایک فرد دنیا کے ہر معاملے سے باخبر ہے۔ دنیا بھر میں اس کے رابطے میں بے شمار لوگ ہیں لیکن اس کے پاس پڑوس والے اس کے رابطے میں نہیں۔ اکٹھے بیٹھے لوگ بھی ایک دوسرے سے بے خبر اپنے اپنے موبائل پر اپنی اپنی دنیاؤں کی سیر میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگر کسی دوست کو پھیپھڑے کی بھی آتی ہے تو اس کے لئے فکرمند ہو کر کمنٹس کئے جاتے ہیں لیکن گھر میں بیمار پڑے بہن بھائی، بیوی یا ماں باپ کی خبر تک نہیں لی جاتی۔ اکثر اوقات گھر والوں سے بھی اس کا رابطہ نیٹ پر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں تو یہی سمجھیں کہ بندہ آج لائن ہے تو زندہ اور بخیریت ہے۔

پہلے بچوں کو کچھ پوچھنا ہوتا تو بزرگوں سے پوچھتے جو اپنے تجربے کے مطابق مفید اور درست باتیں بتاتے اور ایسی باتیں گول کر جاتے جن سے کچے ذہنوں پر غلط اثرات پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اب تو سب کا ایک ہی بزرگ ہے بابا گوگل جو بغیر کسی پردے کے ہر قسم کی معلومات دے دیتا ہے جو کہ ضروری نہیں درست

ہی ہوں، غلط بھی ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ ان کو اَپ لوڈ کرنے والے بھی انسان ہی ہیں جن کے اپنے مقاصد اور نظریات ہوتے ہیں۔ اس انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بے پناہ فوائد سے انکار نہیں آج ہمیں نیٹ پر وہ کتابیں اور مواد بھی تقریباً مفت دستیاب ہے جو بڑے بڑے محققین اور مولفین کو کسی قیمت پر دستیاب نہ ہوسکا۔

اس انقلاب نے اخلاقی معیارات بھی بدل دیئے ہیں۔ پہلے کوئی حادثہ ہوتا تھا تو لوگ ان کی مدد کرتے تھے، اب ویڈیو بنا کر اَپ لوڈ کر دیتے ہیں اور ساتھ لکھ دیتے ہیں کہ ان کے لئے دعا کریں۔ اگر تحریک آزادی کے وقت میڈیا ہوتا تو شاید ہم گھر بیٹھے لائک اور کمنٹس کے ذریعے جنگِ آزادی لڑتے جیسے آج ہم کشمیر، فلسطین، شام، میانمار اور ڈاکٹر عافیہ کے لئے لڑ رہے ہیں۔

فیس بک کی دنیا عجیب دنیا ہے جہاں ہر لڑکا پرنس ہے تو ہر لڑکی پرنسس لیکن نوے فیصد لڑکیاں دراصل لڑکے ہیں اور دس فیصد لڑکے بھی دراصل لڑکیاں ہیں۔ فیس بک پر جہاں پرانے بچھڑے ملتے ہیں نادر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا بھر کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے وہیں دھوکا، برین واشنگ اور بلیک میلنگ بھی ہوتی ہے۔ دور دیسوں کے باسیوں سے شادیاں بھی ہو جاتی ہیں اور اسی کی وجہ سے طلاقیں بھی ہو جاتی ہیں۔ فیس بک اپنے نظریات اور شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے اور منفی پراپیگنڈے کا بھی اس سے ملک وملت اور مذہب کی خدمت بھی ہوتی ہے اور فرقہ واریت کی تبلیغ بھی۔ مذہب پر حملے بھی ہوتے ہیں اور ملک وملت پر بھی۔

یہ درست ہے کہ کوئی چیز بذات خود اچھی بُری نہیں ہوتی، اس کا استعمال اسے اچھا یا بُرا بناتا ہے لیکن اس میں منفی استعمال کے امکانات زیادہ ہیں اور یہ خودنمائی، خودستائی اور تشہیر کا سستا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے کیونکہ فیس بک پر ہر کسی نے خود پر مصنوعی خول چڑھا رکھا ہے۔ پھر واٹس ایپ اور یوٹیوب ہے جہاں کروڑوں تصاویر اور ویڈیوز موجود ہیں آپ کی دلچسپی کسی بھی موضوع سے ہو لکھیں یا بولیں تو متعلقہ مواد حاضر لیکن اس کے پیچھے جو شیطانی دماغ کام کر رہے ہیں وہ فحش اور متنازعہ مواد کے لنک وقفے وقفے سے بھیجتے رہتے ہیں چاہے آپ مفید معلومات حاصل کرنے بیٹھے ہوں۔ کال گرلز بھی اپنی تشہیر انہی ذرائع سے کرتی ہیں۔ اللہ ہمیں دور جدید کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

کے ایچ مجاہد

Pakistanipoint.com

خطوط و خیال

یہ کالم قارئین کے خطوط اور آراء سے ترتیب دیا جاتا ہے اور ایڈیٹر کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اب قارئین اپنی آراء بذریعہ SMS بھی بھجوا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

دعاؤ کی کرامت

مکرمی سلام مسنون! خیریت موجود و خیریت مطلوب۔ کافی مہینوں کے بعد ''حکایت'' کی محفل میں دوبارہ شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ دل کے مرض کے علاوہ جگر کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ معدہ انتہائی خراب ہو گیا تھا۔ کئی مہینوں تک صاحب فراش رہا۔ آپ کی مہربانی کہ آپ نے قارئین سے دعا کرنے کی اپیل شائع کی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قارئین کی دعائیں ہی ہیں کہ مرض صحت میں تبدیل ہو گیا۔ خون کا لیول آٹھ سے 12 تک صرف پندرہ دن میں پہنچ گیا۔ پندرہ دنوں میں چار بوتلیں خون جسم میں پیدا ہونا صرف دعاؤں کی کرامت ہے، دواؤں سے ایسا ہونا مشکل تھا۔

قارئین سے عرض گزار ہوں کہ مزید دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی روحانی و جسمانی بیماریوں سے محفوظ فرمائیں۔ جن کرم فرماؤں نے فون پر خیریت دریافت فرمائی ان کا اجتماعی شکریہ ادا کرتا ہوں اور دست بہ دعا ہوں اللہ تعالیٰ سب کے اچھے کاموں میں ان کا دست گیر ہو۔

بعض احباب نے بطور مذاق فرمایا کہ آپ کو پیروں فقیروں کی بددعائیں لے ڈوبی ہیں اور آپ پر کسی پیر فقیر نے جادو کر دیا ہے۔ کیوں کہ آپ ان کی روزی روٹی پر لات مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ میں جھوٹے، فراڈیے اور بے دین پیروں اور عاملوں کے کرتوت طشت از بام کرتا ہوں۔ صحیح پیروں اور عاملوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لہٰذا مجھے ان مغضوب الیہ پیروں اور عاملوں کا نہ کوئی ڈر ہے نہ خطرہ اور نہ ان کا جادو وادو مجھ پر چل

PakistaniPoint www.pakistanipoint.com

سکتا ہے۔ ان شاء اللہ!

صرف آپ کے پنجاب میں چالیس ہزار اڈے ایسے ہیں جہاں جھوٹے پیر لوگوں کا مال دھوکے سے کھا رہے ہیں اور ان کی بہو بیٹیوں کی عزتیں لوٹ رہے ہیں۔ بعض ایسے مکار اور دنیادار پیر بھی ہیں جو اپنے آپ کو نماز روزہ سے آزاد کہتے ہیں کہ ہم دل میں پڑھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ہر نماز مدینہ میں جا کر پڑھتے ہیں۔ نماز مدینہ میں لیکن اکل و طعام پاکستان میں، مشروبات پاکستان میں۔ بھلے مانسو! اگر تم نماز مدینہ میں جا کر پڑھتے ہو تو کھانا بھی وہاں سے کھا آیا کرو۔ پاکستان میں جراثیم سے آلودہ پانی پینے کی بجائے مکہ شریف سے زم زم کیوں نہیں پی آتے؟

قارئین محترم! جن خانقاہوں میں کبھی عقاب بسیرا کرتے تھے آج وہاں پر زاغوں کا قبضہ ہے۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں ہیں عقابوں کے نشیمن

جہاں سے کبھی اللہ اللہ کی آوازیں آیا کرتی تھیں، آج وہاں سے کنجریوں کے ناچ اور گانے کی آوازیں آتی ہیں۔ جہاں معرفت کی شراب تقسیم ہوتی تھی آج وہاں بھنگ کے کٹورے بٹتے ہیں۔ جہاں آنے والے غریبوں اور یتیموں کو نوازا جاتا تھا آج ان کو لوٹا جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ ایک المیہ ہے عظیم المیہ!

✉ ---------- محمد افضل رحمانی

"زمین کے خدا" ایک سوال؟

محترم جناب عارف محمود صاحب، السلام علیکم!

میں ماہنامہ "حکایت" کا 2002ء سے قاری ہوں لیکن یہ میرا پہلا پیغام ہے جو میں "حکایت" میں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ اسے شائع ضرور کریں گے۔ میں 2019ء میں رانا اقبال صاحب سے موٹاپے کا علاج کرا رہا تھا اس سلسلے میں میں کے دفتر میں آیا تھا اور آپ سے بنفس نفیس ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آج بھی جب میں حکایت پڑھ رہا ہوتا ہوں تو کوئی دوست ہاتھ سے حکایت لے لے تو میں بڑے فخر سے کہتا ہوں کہ اس میگزین کے دفتر میں جا کر اس کے ایڈیٹر عارف محمود صاحب سے ملاقات کر چکا ہوں تو لوگ بہت حیران ہوتے ہیں کہ واقعی؟

عارف صاحب! میں "حکایت" کی کسی کہانی کے متعلق تبصرہ تو نہیں کروں گا لیکن میں سیدہ شاہدہ شاہ کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا ہوں نومبر 2019ء کے شمارے میں شاہدہ صاحبہ نے ایک کہانی "زمین کے خدا" لکھی جو بہت ہی المناک اور اچھی کہانی تھی لیکن سیدہ صاحبہ سے تھوڑی سی غلطی ہوگئی کہ انہوں نے وقت کا خیال نہ رکھا اور یوں کہانی میں ایک شک سا گزرتا ہے کہ کہیں کہانی فرضی تو نہیں۔ کیونکہ سیدہ صاحبہ نے زبیدہ کی شادی کے وقت عمر 13۔15 سال لکھی ہے اور وہ 2 سال تک اپنے شوہر کی بیوی رہی اس کے بعد وہ بیوہ ہوگئی اس کا شوہر فوجی تھا اس لئے آپریشن ردالفساد میں وہ شہید ہوگیا اور اب زبیدہ 55 سال کی ہے اور اس کی جوان بیٹی بھی تھی جو قتل ہوئی۔

آپریشن ردالفساد 22 فروری 2017ء سے جاری ہے اور 2017ء میں زبیدہ کا شوہر شہید ہوا تو زبیدہ کی عمر اس وقت 17 سال بنتی ہے یہاں شاہدہ صاحبہ نے کہانی کے ٹیمپو کو مزید خراب کیا کہ وقت پر لگا کر گزرتا رہا۔ اور اگر آپریشن ردالفساد کو دیکھا جائے تو اس وقت زبیدہ کی عمر 60 سال بنتی ہے 55 سال نہیں۔

"حکایت" کی وساطت سے سیدہ صاحبہ تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں تاکہ وہ آئندہ ایسی غلطی کا خیال رکھتے

Pakistanipoint.com

ہوئے اچھا کرنے کی کوشش کرسکیں اگر وہ کہتی ہیں کہ آپریشن ردالفساد نہیں کوئی اور آپریشن تھا تب بھی وہ اس کہانی کو اس وقت کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کرسکتیں حتیٰ کہ 1999ء کی کارگل جنگ کے ساتھ بھی نتھی نہیں کرسکتیں کیونکہ یہاں معاملہ زبیدہ کی عمر کا ہے۔ شکریہ!

✉ ---------- سید غلام عباس شاہ۔ حاصلپور

شکریہ کہوٹ صاحب

عزت مآب جناب عارف محمود صاحب،

سلام جمیل! امید ہے بفضل خدا آپ خیر سے ہوں گے۔ ''بیوہ کی بددعا.....'' کا دوسرا حصہ ارسال ہے۔ جن نامساعد حالات میں آپ پرچہ نکال رہے ہیں اس پر آپ کی ہمت اور حوصلہ کو داد دیئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ ''بیوہ کی بددعا اور پھانسی کا پھندا'' پر میرے محترم محمد صدیق اعجاز حسین سٹھار، چوہدری اصغر علی جیدی اور محمد ادریس انور کہوٹ صاحب اور دیگر صاحبان نے بذریعہ فون اور SMS حوصلہ افزائی فرمائی ہے ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

باقی جو کچھ بھی لکھتا ہوں کوشش ہوتی ہے کہ اس کا تسلسل اور روح برقرار رہے۔ خواہ خواہ مرچ مسالہ نہیں لگا سکتا۔ بھائی محمد ادریس انور صاحب سے صرف یہ کہوں گا۔ بقول شاعر

میرے پاس سے جو گزرے میرا حال تک نہ پوچھا
میں کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

میرے غریب خانے سے چند گز کے فاصلے سے گزر گئے اور ایک پیکٹ میرا نام لکھ کر کسی کے ہاتھ تحفہ بھیج دیا گیا تھا۔ بہرحال شکریہ کہوٹ صاحب!

✉ ---------- حکیم مختار احمد ناز۔ چکوال

مریضہ، موت اور مسیحا

محترم بھائی عارف محمود، السلام علیکم! چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوئی ہوں۔ وجہ بے پناہ مصروفیات ہیں۔ اب بھی فرصت کے چند لمحات نکال کر حاضر محفل ہوں۔ جنوری 2020ء کا شمارہ ادارے سے لے کر آخری صفحے تک پڑھ چکی ہوں۔

سب سے پہلے میں بھائی محمد صدیق جنڈ والا، بھائی اعجاز حسین سٹھار، بھائی چوہدری اصغر علی جیدی اور ان تمام قارئین کی مشکور ہوں کہ جو نہ صرف میری کہانیوں کو پڑھتے ہیں بلکہ اپنی دعاؤں سے بھی نوازتے ہیں۔ یہ آپ سب کی دعائیں ہی ہیں جو بار بار بستر علالت سے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ میں محترم بھائی عارف محمود ایڈیٹر ''حکایت'' کی بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے میری علالت کے دوران نہ صرف مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا بلکہ ہر نماز کے بعد میرا نام لے لے کر میری صحت یابی کے لئے بھرپور اور پورے خلوص سے دعائیں کیں۔

کہانیوں میں ''مریضہ، موت اور مسیحا'' نے بے حد متاثر کیا۔ کیونکہ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ مجھے بھی ''آرسینک'' زہر دیا گیا تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم، سی ایم ایچ والوں کی محنت و مسیحائی اور میرے شوہر اور بچوں کی دعائیں تھیں جو مجھے دوبارہ زندگی کی طرف لے آئیں۔ یہاں بھی وجہ حسد ہی تھی۔ بہرحال ایسے لوگوں کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ پاک انہیں نیک ہدایت دے۔

اصغر علی جیدی بھائی کا انتخاب ''درگاہی شاہ'' میں نے اپنے شوہر کی ذاتی لائبریری میں پڑے ہوئے ایک پرانے پرچے میں پڑھا تھا۔ اس سچی کہانی کی صداقت بلاشبہ مسلم ہے کیونکہ ایک ایسا ہی جن ''میرے

نانا جان کے پاس بھی پڑھتا تھا۔ وہ بھی انڈیا میں تھے اور ان کو بھی لوگ میاں جی کہتے تھے۔ ''رکھیل'' بھی ایک اچھی کہانی ہے اور شاید اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ باقی کہانیوں میں بن بجو اور بیلچہ، پنڈت کا پاپ، زمین اور عداوت متاثر کرنے والی کہانیاں ہیں۔ شاعری میں ''خزاؤں کے موسم'' اور محترمہ سکینہ صدف صاحبہ کی غزل اچھی تھی۔

✉ ---------- سیّدہ شاہدہ شاہ۔ جہلم شہر

تمغۂ حُسنِ کارکردگی

محترم برادرم عارف محمود صاحب، السلام علیکم!
امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ میری بے وقت تنقید پر آپ کا اظہار خیال بالکل بجا ہے جس کا جواز میں ''حکایت'' کے ''نومبر'' کے شمارے میں پیش کر چکا ہوں۔ میں آپ کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ تنقید کا انداز ''مضحکہ اڑانے اور دل آزاری والا نہ ہو''۔ بس یہی سمجھ لیں کہ قلم کو جب مہمیز مل جائے تو کم بخت منہ زور ہو جاتا ہے جس کے لئے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔

محترم وسیم رضا صاحب آپ برادرم محمد صدیق صاحب پر ناراضی کا اظہار نہ کریں۔ انہوں نے تو میرا نقطۂ نظر ''ری پلے'' کیا ہے۔ میری آپ سے کوئی ذاتی پُرخاش نہیں ہے۔ بس آپ کی ''ستاروں بھری رات'' پسند نہ آئی تو اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ یہی سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ بایں ہمہ گر میری وجہ سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے معذرت خواہ ہوں۔

محترم سکواڈرن لیڈر (ر) سیّد ریاض الحسن صاحب اپنے مضمون ''پاکستان دارالمسائل'' کے صفحہ 28 پہلے کالم کی لائن نمبر 12 میں رقمطراز ہیں ''اقتدار حاصل کرنے کے لئے بھارت دشمنی بہت بڑا ہتھیار ہے اور پاک ہند تعلقات کو بہتر بنانے والے کو غدار وطن اور بھارتی ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے''۔ میرے قابل صد احترام سید ریاض الحسن صاحب! میں آپ کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے خیال میں آپ قائداعظمؒ کی اس سیاسی بصیرت سے پہلوتہی کر رہے ہیں جو انہوں نے ہندو ذہنیت کو بھانپتے ہوئے ''کانگرس'' پر تین حرف بھیج کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ یہ ہتھیار تو مودی (بلکہ موذی) نہایت بے دردی سے استعمال کر رہا ہے۔ موجودہ حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ہندو وہ سانپ ہے جو کبھی بھی ڈسنے سے باز نہیں آتا۔ مزید برآں حکم خداوندی ہے ''تم یہود و ہنود کو کبھی دوست نہ بناؤ وہ تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ مسلمان کا دوست/ بھائی مسلمان ہی ہے''۔ ''اظہار خیال'' کی تنگی داماں کا احساس ہے ورنہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

حکیم مختار صاحب! کھوئے ہو تم کہاں؟ فتو قتل کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ آپ نے یہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ، وہ ارادہ، کیا ہوا؟ غائب ہی ہو گئے ہو بادشاہو! ملنے جاتا ہوں تو ملتے نہیں، خود سے آتے نہیں۔

محترم اعجاز حسین ستھار بھائی محمد صدیق اور دیگر ''حکایت'' کے قارئین محترم کا بے حد شکریہ جنہوں نے ''وے توں جم جم آویں'' کو پسندیدگی کی سند سے نوازا ہے۔ خاص کر بھائی اعجاز حسین ستھار صاحب نے جن الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں مجھے ''تمغۂ حسنِ کارکردگی'' مل گیا ہے۔ میرے کسی بھائی نے اگر اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہیت و یہ اس کا حق ہے مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ کیونکہ اعجاز بھائی! ''میرے پاس تم ہو''۔

Pakistanipoint.com

✉ ---------- محمد ادریس انور کہوٹ

"حکایت" گھر کے ہر فرد کے لئے

برادرم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! برادرم صدیق جنڈ والا نے پڑھنے والوں کو "حکایت" سے عقیدت کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعی شفاف مواد کے ساتھ چھپنے والا پرچہ ہے جسے گھر میں ہر عمر اور رشتہ ایک ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ حالانکہ جوان طبقہ جذبات میں ہلچل مچا دینے اور محبت کے نام پر ہر حد پار کر لینے والے کرداروں کی کہانیاں ذوق وشوق سے پڑھ کر سارے گرعملی زندگی میں استعمال کرنے کو بے چین رہتے ہیں لیکن یہاں ملک کی تقسیم، جنگ ستمبر، دسمبر، فوجی جوانوں کی قربانیاں اور سبق آموز معاشرتی کہانیاں پڑھ کر میٹھی ڈش میں سرخ مرچ کی طرح بدکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے پھر لکھنے والوں میں بھی زیادہ تعداد ریٹائرڈ اور زمانے کو دل کی بجائے دماغ کی آنکھ سے دیکھنے والوں کی ہے۔ پھر پرنٹ میڈیا کی بجائے سوشل میڈیا کی مصروفیات نے مشرقی ماں کی آغوش کی طرح لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ان حالات میں بچے کھچے قارئین کو مطمئن رکھنا اور اعتماد کی بحالی انتہائی ضروری ہے۔

خادم حسین مجاہد نے "جنسی درندگی، علاج اور اسباب" موجودہ حالات کے مطابق مجاہدانہ کوشش کی ہے۔ اس کا اصل علاج تو وقوعہ کے مقام پر سر عام پھانسی ہے تب لوگ عبرت پکڑیں گے وگرنہ ہماری عدالتوں کی لیت ولعل، وکیلوں، آمدورفت کے اخراجات اور معاشرے میں جگ ہنسائی مظلوم والدین اور قریبی رشتہ داروں کو مایوس کر دیتی ہے۔

"دنیا کا جہنم" میں ایک شخص کی محض نیت خراب کر لینے سے جیسی حالت کا ذکر کیا گیا ہے اگر اس تناظر میں ہم اپنے اعمال، کرتوتوں اور غلیظ منصوبوں کا جائزہ لیں تو اندازہ کیجئے، کیسی سزا کے مستحق ٹھہرائے جائیں گے، پکڑ میں نہ آنے کی وجہ سے بدمست سانڈ بنے ہوئے ہیں۔ کسی کی بہن، بیوی، بیٹی اور حتیٰ کہ ماں جیسی مقدس ہستی کو ہوس بھری نظروں سے دیکھتے اور کھوجتے ہیں۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ حقیقی رشتے آنکھوں کے نیزوں سے بچے رہتے ہیں۔

"زمین" میں سلطان، نواز فیملی ابھی تک پاکستان جانے کی تگ ودو میں دھول، مٹی، خون میں لتھڑے اور بھوک، پیاس سے نبرد آزما بے حال چلے جا رہے ہیں، مشکلات ناپ تول میں ہیں نہ گنی جا سکتی ہیں، منزل کتنی دوری پر ہے کوئی کچھ نہیں جانتا اور کون زندگی کا تحفہ لے کر پاک سرزمین پر پہنچ کر سجدہ ریز ہو، سب تعبیریں حقیقت کی تصویر بننے کی منتظر ہیں لیکن آخری پڑاؤ قریب ہے کس نے دیر پا مصیبت جھیلنے کے بعد خوشیاں سمیٹیں، زخم کھا کر عزت آبرو بچائی اور درد سے بھینچے دانتوں کے ساتھ سکھ کی چاردیواری میں طمانیت محسوس کرتے ہوئے سکھ کا سانس لے کر سجدہ شکر ادا کیا، یہ اگلے ماہ جان پائیں گے۔

"بن، بجو اور بلیچہ" نے شکاری کہانی کی کمی پوری کر دی بلکہ ساتھ لہو گرم رکھنے کا بہانہ بھی ہاتھ آ گیا اور مفت میں گاؤں، بن کی سیر کر لی، کئی پرانی باتیں، کام اور فارغ وقت کی مصروفیات تحریر کی صورت سامنے آئی ہیں تو خواب وخیال بن کر حقیقت حال آنکھوں میں گھومنے لگی اور بچپن کے دور میں پہنچ گیا۔ خوشی کے بن کی عورتیں مٹی کھودنے، ڈھونے اور صحن، دیواریں اور چھتیں لیپتے ہوئے فطری ماحول میں اپنی ماں، بہن، بیٹی اور رشتہ دار عورتیں لگیں تو بے ساختہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ محمد نذیر ملک آبائی علاقہ چھوڑ کر شہر جا بسے ہیں لیکن واقعہ لکھتے ہوئے انہوں نے منظر کشی

Pakistanipoint.com

کرتے ہوئے حقیقت بھرے رنگ لفظوں کی صورت کاغذ پر پھیلا دیئے یوں جانئے ''چس آ گئی ہے''۔

''اُم معبدؓ کا نصیبہ'' نے روح کو سرشار کر دیا ہے۔ واقعی یہ خاتون کسی سکول، ادارہ سے فارغ التحصیل نہ تھی۔ مشاہدہ غیر معمولی ہے جسے اللہ کا خصوصی انعام کہا جا سکتا ہے۔

''عداوت'' جیسے واقعات اور کہانیوں نے کتنے گھر اجاڑے، بچے یتیم ہوئے، جوان لڑکیاں بیوہ ہوئیں اور مائیں گبھرو، شہتیر کی طرح مضبوط جسامت رکھنے والے بیٹوں کی یاد سینے سے لگائے بین کرتی رہتی ہیں۔ یہاں ایک نواز، تاجے کی کوشش اور پیر کا احترام کیا کارنامہ سرانجام دے گا؟ دراصل ایسے باغی ذہن اور ہٹ دھرمی کا رویہ رکھنے والوں کی سوچ کو دینی و دنیاوی تعلیم ہی بدل سکتی ہے۔ ''بے نظیر کا معرکہ'' میں واقعی شکار کی انوکھی کہانی پڑھی ہے۔ ایسے آلات اور ہتھیاروں کا ذکر ہے جو دیکھے نہ نام سنا ہے۔ البتہ آمنے سامنے کی لڑائی میں مزہ آ گیا گوطفیل پارٹی نے درندے پر قابو پا لیا لیکن اسے بہادری، عقل مندی کہیں گے یا یہ کہیں تخت یا تختہ والا کھیل تو نہیں ہے؟

''مریضہ، موت اور مسیحا'' پوری نصف صدی کا قصہ ہے۔ کموں ایک معصوم، پُرامید اور غیر معمولی ذہانت رکھنے والی لڑکی تھی۔ کم عمری، ناتجربہ کاری اور محدود معلومات کے باوجود کتنے خواب آنکھوں میں سجا رکھے تھے، حسب خواہش تعبیر مل جاتی تھی لیکن بے بس پرندے کو بے شمار شکاری نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ اس نے جتنی تکلیفیں دیکھیں، مصیبتوں سے سامنا رہا اور یقینی روشن مستقبل اندھیروں کی نذر ہو گیا۔

''دھوپ چھاؤں'' میں شاہد جسمانی خامی رکھنے کے ساتھ بزدل بھی تھا، احساس کمتری نے ساری صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا۔ وہ ماں کے سامنے ڈٹ سکا نہ بیوی کو مطمئن کر سکا۔ بس حقیقت سے گھبرا کر آنکھیں بند کر کے گوشہ نشین ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ چند سال شیریں نے مشکلات کا سامنا کیا، حالات مخالف چل رہے تھے اور مصیبت کی گھڑی میں خونی رشتے آنکھیں پھیر گئے لیکن نیک نیتی کے معمولی بیج نے تناور درخت کی صورت جنم لیا۔ ایسے پھول، پھل لگے کہ ساری محرومی اور نقصانات پورے ہو گئے۔

''پنڈت کا پاپ'' میں گئو ماتا کی محبت اور جنونی پوجا پاٹ کا عجیب قصہ پڑھا۔ واقعی جو مسلمان ہندو معاشرے میں نہیں رہے ان کی خصلت، مذہبی جوش اور مکاریوں سے ناواقف ہیں نہ ان کی چالبازیوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ہمارے لئے ساری معلومات حیران کن ہیں۔ موجودہ کہانی میں پوری بات ایک فقرے میں سمیٹ دی گئی ہے کہ پنڈت مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ایک باپ بھی تھا، اسی جذبہ نے پاپ کرنے پر مجبور کر دیا۔

''درگاہی شاہ'' سے ملتے جلتے قصے سادہ لوگ گاؤں میں سنانے کو موجود رہے ہیں۔ انسان لاکھ پارسائی کے باوجود گناہ گار ہے۔ ان باتوں پر بحث یا سچ جھوٹ الگ کرنا کم عقلی ہے۔ کوئی سکالر اور مفتی ہی باریکیاں بتا، سمجھا سکتا ہے۔ اپنا دین ایمان پختہ رکھ کر عبادت کریں یہی نجات کا راستہ ہے۔ برادرم اصغر علی جیدی نے کمال کا انتخاب بھیجا ہے۔ نیک خواہشات قبول کریں۔

''دیا جلائے رکھنا'' میں نصیر ایک ناقابل فراموش کردار ہے۔ اسے اپنی جوانی، والدین کے بڑھاپے اور دل میں حسرتیں، ارمان اور خواب سجائے ایک رات کی دلہن کا خیال و فکر نہ تھی، بس وطن کو شر پسندوں کے مظالم اور شیطانی چالوں سے محفوظ بنانا مطمع نظر تھا جس میں بہادری سے جان دے کر کامیاب و کامران ٹھہرا۔

Pakistanipoint.com

''رکھیل'' میں تجسس، ہیجان اور مارا ماری عروج پر ہے۔ شمشیر دادا کو چھپکلی کی طرح مسل دیا گیا، یہ جرائم کی دنیا کا اَن داتا تھا لیکن کسی نے انگلی تک نہیں اٹھائی۔ اس احتجاج نہ ہونے اور خاموشی میں کتنے طوفان چھپے ہیں۔ وقت اور حالات بدلنے کا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کتنے طوفان آئیں، خون بہے اور تباہی پھیلے۔ جیسا تناوش نے ماضی یاد دلا کر کبیر دادا کو کہا کہ ''آپ نے عشاء کی اذان دی لیکن حالات نے نماز پڑھنے کی فرصت نہ دی، اب وہ نماز ادا کر کے سلسلہ جوڑ لو، حالانکہ ایک نیزہ ہے ظلم، جبر، طاقت اور زیادتیوں کا جو کبیر کے سینے میں پیوست ہے۔ جب بچپن یاد آئے تو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ذہن تسلیم نہیں کر رہا کہ کبیر دادا کو حادثہ پیش آیا ہے یوں سارا قصہ ختم ہو جانا ہے لیکن پٹاری کا ڈھکن اٹھنے تک ساتھ چلنا ہو گا۔ ریاض عاقب کوہلر کو سراہنے اور حوصلہ افزائی کے لئے دائیں اور کبھی بائیں پہلو چلے آ رہے ہیں۔

✉ ---------- اعجاز حسین سٹھار۔ نور پور تھل

ٹائٹل زبردست ہے

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! جنوری کا شمارہ مل گیا ہے۔ ٹائٹل زبردست ہے۔ دل بہت افسردہ ہوا، آپ کے مرتب کئے ہوئے شمارے نے خوب ادبی نشہ پورا کیا۔ کے ایچ مجاہد صاحب کا اداریہ جنسی درندگی علاج اور اسباب چشم کشا مضمون ہے۔ ''پاکستان ایک بار پھر پل صراط پر'' دستگیر شہزاد صاحب کا بھی تجزیہ اپنی جگہ زبردست ہے۔

تقسیم پاک و ہند کے موضوع پر محترم سید وسیم رضا سکتر صاحب کی شاہکار کہانی ''زمین'' کی اس وقت کی منظر نگاری عروج پر ہے۔ کرداروں کے خیالات کو قلم کی زبان دینا کھلی حقیقت کا گمان ہے۔ لوگوں کے جلتے گھر جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کے کٹے جسم، ماؤں، بہنوں، بہو، بیٹیوں کی سر عام لوٹی گئیں عصمتیں، شیر خوار بچوں کے لاشے خونی واقعات ہیں۔ سلطان فیملی کا کیا انجام ہوا، اختتامی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

چار دیواری کے موضوع پر مرزا شبیر بیگ ساجد صاحب کی ''دھوپ چھاؤں'' جذبات میں ہلچل مچا گئی۔ دوران مطالعہ میرا غصہ بھی عروج پر تھا۔ ڈانگ اٹھانے کو دل چاہ رہا تھا۔

''بن، بجو اور بیلچہ'' (محمد نذیر ملک) اور ٹائٹل میں بچی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین نے گزرے ہوئے وقتوں کی خوب یاد دلائی۔ کہانی کا ماحول صابر حسین راجپوت والی شکاریات کی کہانی کا بن گیا۔ محترم نذیر ملک صاحب نے پرانے وقتوں کے ان واقعات کو تحریر کر کے دل موہ لیا۔

ایسے ہی چھتوں کی لپائی ہوا کرتی تھی۔ کچے کوٹھے ہر گاؤں کا یہی حال تھا۔ غمی خوشی میں سب کے دکھ سانجھے، گرمیوں میں درختوں کی چھاؤں تلے مل بیٹھنا، لوگ مل بیٹھ کر دنیا جہان کے قصے چھیڑا کرتے تھے لیکن آج کے دور میں زندگی بے حد تیز رفتار ہو گئی ہے۔ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے اپنا جال ایسی مہارت اور چابکدستی سے بُنا ہے کہ شاید ہی کوئی اس کے پھندے سے بچ سکا ہو۔ وہ برکتوں والا دور تھا۔ کاش! پھر سے وہ دن لوٹ آئیں۔ محترم نذیر صاحب! ذرا وضاحت کریں کہ اگر کسی پر مٹی کا تودہ گر پڑے تو انسانی اعضا جسم سے کیسے علیحدہ ہوتے ہیں؟

دنیا کا جہنم۔ عداوت۔ مریضہ، موت اور مسیحا۔ پنڈت کا پاپ۔ دیا جلائے رکھنا ان کہانیوں کا اپنا ہی ایک جداگانہ اسلوب ہے جنہیں ایک بار پڑھنا شروع کیا جائے تو ختم کرنے کو جی نہیں کرتا۔ محترم عارف

صاحب! آپ کی محنت خوب رنگ لا رہی ہے۔ آنے والا ہر شمارہ گزشتہ شمارے کی نسبت زیادہ معیاری معلوم ہوتا ہے۔

''پیکر وفا'' اور ''ام معبدؓ کا نصیبہ'' ایسے مضمون تو ہر شمارے میں شامل ہونے چاہئیں۔

طنز و مزاح پر محترم خادم حسین مجاہد صاحب کا مضمون ''ملفوظاتِ گفتار غازی'' پڑھ کر ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ تحریر کا انداز ایسا کوئی ان کے خلاف احتجاج بھی نہیں کر سکتا کہ کیا لکھا ہے۔ گلاں گلاں وچ بڑا کچھ کہہ گئے۔ مجاہد صاحب! اگر ناراض نہ ہوں تو دل ان کا بھی دوسری شادی کے لئے تیار ہے۔

''درگاہی شاہ'' کے زیر عنوان برادرم اصغر علی جیدی صاحب کا انتخاب بے حد پسند آیا۔

''بردہ'' اور ''رکھیل'' کی رفتار انتہائی تیز ہے، اللہ خیر کرے! غدار کون؟ پاکستان دارالمسائل۔ پی کیپ۔ سانحہ مشرقی پاکستان۔ بے نظیر کا معرکہ۔ من گھڑت افواہیں، کشمیر کی دیوارِ برلن کب گرے گی۔ وہ لوگ کافی متاثر کن مضمون اور کہانیاں ہیں۔

''اظہارِ خیال'' میں میرے خط ''حکایت'' اور ''عقیدت کی انتہا'' کو فون کالوں اور ایس ایم ایس کے ذریعے خوب سراہا گیا، میں ان سب معزز حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

✉ ---------- محمد صدیق۔ جنڈ والا، چونیاں

مہنگائی کا طوفان

مکرمی ط محترمہ برادرم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! جنوری کے شمارہ کا سرورق نئے سال کد مناسبت سے بہترین اور جاذبِ نظر تھا۔

مہنگائی کے حالیہ طوفان نے غریب عوام کا کچومر نکال دیا ہے، جس سے ان کا جینا دوبھر بلکہ حرام ہو گیا ہے۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں، آسمان سے باتیں کر رہی ہیں بلکہ دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں۔ ذخیرہ اندوزوں اور من مانی کرنے والوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لگتا ہے حکومت کرنا اب عمران خان کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس لئے میرا ان کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ حکومت چھوڑ کر عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے ساتھ مل کر میوزیکل شو کیا کریں۔ اگر بلاول بھٹو زرداری کو بھی ساتھ ملا لیں تو یہ سونے پہ سہاگہ ہو گا۔

''رکھیل'' کی تیرہویں قسط تہلکہ خیز ہے جبکہ ''بردہ'' کی گیارہویں قسط بھی کچھ کم نہیں بلاشبہ یہ دونوں ناول ریاض عاقب کوہلر کے شاہکار ہیں۔ سیّد وسیم رضا کا سلام مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ یاد آوری کا شکریہ! ''زمین'' کی آخری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ''پاکستان ایک بار پھر پل صراط پر'' دستگیر شہزاد کا چشم کشا اداریہ ہے۔ ''جنسی درندگی علاج اور اسباب'' خادم حسین مجاہد کا کارآمد مضمون ہے جبکہ ''ملفوظاتِ گفتارِ غازی'' نے اور ''روایتی شعرا کی شاعری'' نے بھی کافی محظوظ کیا۔

''غدار کون'' ادریس انور کہوٹ کی دلیرانہ کاوش ہے۔ جبکہ ''پاکستان دارالمسائل'' میں سید ریاض الحسن نے پاکستان کے موجودہ مسائل کی درست نشاندہی کی ہے۔ میں ان کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔ ''پیکر وفا'' بلال رضوی اور ''ام معبد کا نصیبہ'' محمد اعظم کے عقیدت سے بھرپور مضامین ہیں۔ میں ان دونوں حضرات کو اتنے اچھے مضامین لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

''دنیا کا جہنم'' عارف محمود، ''بن بجو اور بیلچہ'' محمد نذیر ملک اور ''عداوت'' مُرشد علی کی ناقابلِ فراموش کہانیاں ہیں۔ ''پی کیپ'' حفیظ بشر کی عمدہ کاوش ہے۔ شکاریات کے سلسلہ میں ''بے نظیر کا معرکہ'' محمد

شریف منظر کی اچھی کہانی ہے، جبکہ ''دھوپ چھاؤں'' مرزا شبیر بیگ ساجد کی لازوال کہانی ہے۔ ''پنڈت کا پاپ'' اسرار زیدی کا بہترین انتخاب ہے۔ ''مریضہ، موت اور مسیحا'' محمد رضوان قیوم کی خاصی دلچسپ کہانی ہے۔ ''دیا جلائے رکھنا'' سیّدہ شاہدہ شاہ کی قابل ستائش کاوش ہے جسے پڑھ کر بے اختیار لبوں پر یہ شعر آ گیا ؎

سنا ہے کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا
جب تک نہ دیپ جلیں شہیدوں کے لہو سے

✉ ---------- چوہدری اصغر علی جیدی۔ اوکاڑہ

سیّدہ شاہدہ شاہ کے لئے
پرائڈ آف پرفارمنس

عزیزم عارف محمود صاحب، السلام علیکم!

''حکایت'' جنوری میں دو ایسی کہانیاں پیش کی گئیں جو محیر العقول واقعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب سے انسان نے اس دھرتی پر قدم رکھا اس وقت سے لے کر آج تک مافوق العقل مخلوق اُس کے اردگرد فرضی طور پر موجود رہی لیکن ان کے حقیقی وجود کی ماہیت کوئی نہیں جان سکا۔ قرآن پاک میں بلاشبہ جن و انس کا ذکر موجود ہے۔ انسان تو ہمیشہ سے اس دُنیا پر ٹھوس حقیقت کے باوجود ہے جبکہ جنات کے بارے میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں جو قطعاً یقینی نہیں ہیں۔ جہاں تک روایات و قصوں کہانیوں کی بات ہے اس قسم کے بے بنیاد اور بے سر و پا واقعات ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں جو تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ ایک جیسے ہیں اور یہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں۔

کسی پیر کا دیوار کو سانپ کے کوڑے سے چلانا۔ کسی قبرستان میں شام کے بعد کسی تنہا آدمی کو گزرتے ہوئے بکری کے بچے کی آواز آنا، اُسے اٹھانا تو اُس کی ٹانگیں بڑی ہو جانا۔ ایک پیر صاحب کا وعظ و نصیحت کرتے ہوئے ایک گمشدہ لڑکے کو جن کی مدد سے دلی سے اٹھا کر والد کو پیش کر دینا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے علاقہ دامان میں ایک عالم فاضل پیر تھے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) جنات کا اُن کے پاس پڑھنا اور اندھیری میں مٹی کے تیل کے پورے کنستر کو چند منٹوں میں پیش کر دینا وغیرہ وغیرہ۔

راقم نے ساری زندگی کسی حقیقی ولی اللہ کی تلاش میں گزار دی اور ہر ایک سے جنات سے متعلق استفسار کیا لیکن کوئی اس مخلوق کی وضاحت نہیں کر سکا۔ چونکہ موجودہ سائنسی و فکری دور میں انسان اس جنس کے بارے میں کنفیوژن کا شکار ہے اس لئے اس کی توجیح و تصریح کوئی باصفا اللہ والا ہی کر سکتا ہے ورنہ نام نہاد، شعبدہ باز اور ٹھگ پیروں، فقیروں کا کاروبار چلتا رہے گا اور اکثر لوگوں پر اس مخلوق کا خوف طاری رہے گا۔

آخر پر میں بی بی شاہدہ شاہ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے عرض کروں گا کہ وہ قوم کو جھنجوڑنے والے واقعات سناتی رہا کریں، آپ کے قلم میں بڑی توانائی ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو آپ کو ''پرائڈ آف پرفارمنس'' سے ضرور نوازتا۔

✉ ---------- فلک شیر لیل۔ بھکر

◆⌘◆

''زمین''

قارئین! ''زمین'' کی آخری قسط اس شمارے میں شامل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آخری قسط مارچ میں پیش کی جائے گی۔

Pakistanipoint.com

روحانیات

روحانیت اور علم الیقین

روحانیت اور علم الیقین میں دوغلا پن، فریب اور جھوٹ نہیں ہیں اصل سے جفا نہیں اور بے اصل سے وفا نہیں۔

☆ سید سلیمان شاہ گیلانی

تحقیق علم کی جستجو ہے اور علم کا حاصل علم الیقین ہے جو باعث اطمینان قلب و ذہن ہے اور یہی معارفت ہے۔ معارفت کا مطلب کسی حقیقت سے یقین کی حد تک رُوشناس ہو جانا ہے۔ کامل یقین کے ساتھ ہر پہلو سے اور یہ ایک بہت بڑا راز ہے جو صرف تین سطور میں مَیں نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ میدانِ شوق میں جستجو کے قدم بڑھائیں۔ ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ صبر اور محنت کا دامن پکڑیں تو یقیناً معارفت کے لالہ زار میں پہنچ پائیں گے جو موجودہ ماحول کے بے آب و گیاہ صحرا سے ہر لحاظ سے پُرسکون ہے۔ عافیت اور سکون کا ماحول اس طرح واضح ہوگا کہ آپ کا قلب مطمئن ہو کر اور فنا و بقا کی اصل حقیقت کو پالے گا اور محو نظارۂ جمال حقیقی میں غرق ہو کر باقی کے ساتھ باقی اور اپنے وجود

Pakistanipoint.com

سے آزاد ہو جائے گا۔

یہ وہ واضح اور مدلل الفاظ ہیں جو اپنے اندر بے بہا خزانے پوشیدہ کئے، عقل و دانش کے بے پایاں درجات سے لبریز آپ کو دعوتِ فکر دیتے ہیں اور اتنی وسعت کہ عقل و فراست کے گھوڑے جہاں تک بھی دوڑائیں آپ اس کی حد کو نہ پہنچ پائیں گے۔ معارفت کے راز پا لینے پر آپ سراغ زیست پالیں گے۔ ابھی تو آپ وہ کیڑا ہیں جو تتلی کے انڈے میں سے نکلا اور اڑ نہیں سکتا۔ بے بال و پر، رینگنے والا کمزور و ناتواں کیڑا جو پتے اور ڈنٹھل پر زندہ رہتا ہے۔ پھر ایک دن وہ سکڑ گیا اور ایک خول میں بند ہو گیا۔ مراقبہ، مجاہدہ کے خول میں اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ خول پھاڑ کر نکلا ہی نہیں بلکہ اُڑ گیا اور اُڑتا پھرا۔ اب وہ پتے اور ڈنٹھل نہیں کھاتا بلکہ اس کی غذا خوشبو اور شہد ہے اور بسیرا پھولوں کی نازک پنکھڑیوں پر۔ اس طرح تفسیر بھی بدلی، تاثیر بھی۔ بدصورتی سے خوبصورتی ملی، نامکمل سے مکمل ہوا۔

انسان بھٹکا اور گمراہ اس لئے ہوا کہ اس کے سامنے مفروضے ہی مفروضے بیان ہوتے چلے آئے اور حیرت اور تجسس کے گرداب اسے بہائے لئے گئے اور وہ گمراہی اور تباہی کی طرف بہتا چلا گیا۔ بہت سی بے سر و پا باتیں بعض لوگوں سے منسوب ہوئیں اور جب ان باتوں نے ایک زبان سے دوسرے کان کی طرف سفر کیا تو کچھ مسالہ اور لگا دیا گیا اور عجیب و غریب حکایت بڑھتی ہی چلی گئی۔ کسی نے اس پر غور نہیں کیا۔ اپنے آپ سے گم، گرد و پیش سے گم، حال اور مستقبل سے گم اپنی صلاحیتوں سے بے خبر بے علمی اور بے ذوقی کے گرداب میں چکراتے موت کے اندھیرے غار میں اتر گئے۔

یہ بے علمی اور بے ذوقی کا بدترین مظاہرہ ہے کہ ایک آدمی جو اپنی ذات سے بے خبر ہے، مستقبل سے بے خبر ہے، دنیا سے بے خبر ہے اور جو نہیں جانتا کہ آج کیا ہو رہا ہے اور کل کیا ہوگا، وہ ''مسیحا'' بن بیٹھا ہے۔ دعویٰ کرتا ہے کہ میری پھونک جس تک پہنچے گی وہ ہر دکھ تکلیف اور مرض سے آزاد ہو جائے گا۔ بے علم اور بدذوق لوگ بوتلوں میں پانی بھر کر لے جاتے ہیں اور ''مسیحا'' مائیکروفون میں پھونک مارتا ہے۔ بے چارا بدحال غرض مند اتنا بھی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ پھونک پھونک نہیں۔ دم کا اثر تار میں نہیں چڑھتا صرف آواز ہے جسے ایمپلی فائر کئی گنا بڑھا کر لاؤڈ سپیکر کی طرف نکال دیتا ہے مگر لوگ ہاتھوں میں تیل اور پانی کی بوتلیں لئے دیوانہ وار سپیکر کی طرف لپک رہے ہیں اور بوتلیں آگے کئے پھونکوں کا اثر پانی میں جذب کروا رہے ہیں۔

ذرا سوچئے ان حالات میں کہاں ہمیں عقل کی سُوجھے گی۔ سوجھ بوجھ جانے کہاں ہم نے کھو دی اور بے سر و پا باتوں پر یقین کر لیا۔ در سے بے در ہوئے، خانہ خراب پھرے۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو مقدر کو کوسنے دیئے۔ آنسو پونچھے اور پھر کسی دوسرے گندم نما جو فروش حامل کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ کو چھوڑا اور غیر اللہ پر بھروسہ کیا۔

تسلیم کرتا ہوں کہ اللہ کے نیک بندے بھی ہیں جو ایک نظر میں دنیا بدل دیتے ہیں مگر عمل سے، اللہ کے فضل سے، دعا سے، دوا سے اور اعمالِ صالحہ سے۔ وہ یوں دربدر نہیں پھرتے۔ شعبدے نہیں دکھاتے۔ بناوٹ اور ملاوٹ نہیں کرتے۔ شیشہ نہیں دکھاتے۔ جتنا معلوم ہوتا ہے وہ بیان کرتے ہیں اور جو جانتے ہیں وہی بتاتے ہیں۔

مراقبہ، مجاہدہ، مشاہدہ، بھی ایک سائنس ہے اور حقیقی عامل اور فاضل علم میں دسترس رکھتے ہیں، عملی

مشاہدہ کرتے اور غور و فکر سے منزلِ مراد تلاش کرتے ہیں۔ محنت سے، محبت سے اور صبر سے جستجو کرتے ہر چیز کی ماہیت، افادیت، اہمیت اور فضیلت پر تحقیق کرتے اور پھر بیان کرتے ہیں۔ یہ رموز آشنا اور اہل علم لوگ ہیں اور جو اہل کتاب ہیں۔ سائنس کی دو اقسام ہیں۔ ایک روحانیت اور علم الیقین اور دوسری مادیت جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک افزائش اور مادی ترقی اور دوسرا تباہی، بربادی، بیماری اور فنا۔

روحانیت اور علم الیقین میں دوغلاپن، فریب اور جھوٹ نہیں ہیں اصل سے جفا نہیں اور بے اصل سے وفا نہیں۔ روحانیت اور علم الیقین کی سائنس اپنے اندر کی روحانی طاقتوں کو بڑھانے سے جو کیفیات واضح ہوتی ہیں وہ نتیجہ ہیں اس سائنس کا۔ یہ روحانی طاقتیں ہر انسان کے جسم میں موجود ہیں۔ شرط اس کی مشاہدہ مراقبہ اور مجاہدہ ہیں۔ ان اعمال سے یہ بازاری عامل، کامل، پیر فقیر نابلد اور مراقبہ، مجاہدہ، حساب، علم اور روحانیت کی روشنی سے ناآشنا ہیں۔ ان سے پوچھو مؤکل کیا ہوتا ہے، کیسا ہوتا ہے تو سرخ سرخ آنکھیں نکالیں گے، جواب نہیں دیں گے، مؤکل تو انہوں نے خود بھی نہیں دیکھا۔

یہ جو سائنس دان آج کل ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور جراثیم سے جنگی ہتھیار بنا رہے ہیں اور روپیہ پانی کی طرح بہا کر اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ہلاکت کا سامان تیار کر رہے ہیں تو کیوں نہ چند جنات اور چند مؤکلوں کو قابو کر لیا جائے۔ انہیں دشمن کے ملک روانہ کر کے تباہی مچوا دی جائے۔ اخراجات کی بچت ہو گی اور اپنے ہاں ایٹم بموں کے پھٹنے کا خطرہ بھی نہ رہے گا مگر ایسا نہیں ہوسکتا۔ سائنس دان ہر چیز کی دلیل مانگتا ہے۔ حجت مانگتا ہے۔ وہ تجربے کی بنا پر بات کرتا ہے۔ ایک بار دو بار تین بار پھر سمجھ کر فیصلہ کرتا ہے۔

دست و گریباں کے بعد معروف مزاح نگار خادم حسین مجاہد کی
طنز و مزاح پر مشتمل دوسری کتاب

قلم آرائیاں
شائع ہوگئی ہے
صفحات 160
قیمت 120 روپے
مضامین، کہانیاں
رازدارِ حیوانات
پرچہ جات
ازنوابی تا تعصابی
آنجہانی شاعری
ادبی اجلاس
چور کی ڈائری
ملنے کا پتہ: حق پبلشرز A-2 سید پلازہ چیٹر جی روڈ اُردو بازار، لاہور
Ph: 042-7220631, Mob: 0300-9422434

ہماری عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ ہم بابا جی کے پیر دبا رہے ہیں اور یہ جناتی عامل اپنے معتقدوں سے خوشامد اور آؤ بھگت کروا رہے ہیں۔

ایک صوفی صاحب کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ عامل کامل ہیں۔ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ کئی جنات ان کے قبضے میں ہیں اور جنوں کا بادشاہ خود ان کا تابع ہے۔ ہم نے بھی یہ سب کچھ ایک جمعہ کو سنگھورے کی مسجد جو انارکلی دھنی رام روڈ سے ملحقہ گلی میں ہے، سنا۔ معلوم ہوا وہ بزرگ چند روز تک اس مسجد میں آئیں گے۔ ان صوفی صاحب کا تذکرہ ان کی علمیت اور فضیلت ایسے بیان کی گئی کہ ہمیں بھی ملاقات کا شوق چرایا۔ ایک دن ہماری مراد بر آئی۔ صوفی صاحب سچ مچ تشریف لے آئے۔ ہمیں تو جیسے پر لگ گئے۔ سب کام چھوڑ چھاڑ صوفی صاحب کا دیدار کرنے اس مسجد کو روانہ ہوئے۔

وہاں دیکھا صوفی صاحب بیس تیس آدمیوں کے حلقے میں براجمان ہیں۔ جسم کے دبلے پتلے، ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر، کھدر کا لمبا کرتہ اور شلوار پہنے دولہا بنے بیٹھے ہیں۔ بایاں ہاتھ زانو پر تھا اور ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ صوفی صاحب کچھ گفتگو فرماتے تو سب ساکت و جامد ہو جاتے۔ صوفی صاحب کا بایاں ہاتھ حرکت تو کرتا تھا مگر اس ہاتھ کی مٹھی نہیں کھلتی تھی۔ ہم باادب سلام کر کے ایک طرف کو بیٹھ گئے تھے۔ میرے قریب ایک صاحب جو غالباً بہاری تھے، عبدالسلام نام تھا بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ صوفی صاحب اپنا بایاں ہاتھ تو ہلاتے ہیں مگر مٹھی بند ہے۔

''ہش..... ان کے تابع جنات کا بادشاہ ہے اور یہ بند مٹھی اس کی رکھ ہے''۔ عبدالسلام میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جب تک جنات کا بادشاہ صوفی صاحب کے تابع رہے گا تب تک یہ مٹھی بند رہے گی اور ایسا شرط کے تحت ہے۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ عبدالسلام صاحب نے پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''بھائی میاں! جنوں کی رکھ کئی طرح ہوتی ہے۔ کوئی تو چی چی کی انگلی موڑے رکھنے کی رکھ کے تابع ہوتا ہے اور کوئی صرف انگوٹھا دبائے رکھنے سے اور یہ صوفی صاحب کی تو ماشاء اللہ بات ہی کچھ اور ہے۔ جن بے چارے کا تو ڈر کے مارے پیشاب ہی نکل جاتا ہوگا۔

میرا تو جیسے سر چکرا گیا۔ بات بڑی صاف اور واضح تھی کہ صوفی صاحب کسی بچی کا جن نکال رہے تھے اور بچی کا اپنا پیشاب صوفی صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ سے خطا ہوا ہوگا۔ اس کمزور عقیدہ نے جن کا تصور کر لیا۔ کیسے کیسے عقل کے اندھے لوگ ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ کیسی کیسی بے سر و پا باتیں یہ لوگ خود ہی فرض کر لیتے ہیں۔ میں نے صوفی صاحب کی حرکات اور ارشادات کا تقریباً دو گھنٹے مشاہدہ کیا۔ ان میں عاملوں اور بزرگوں والی کوئی خاصیت تو درکنار انہیں معمولی سی آگاہی بھی اس ضمن میں نہیں تھی۔ لوگوں نے جو کچھ بھی ان سے گزارش کی اور صوفی صاحب نے جو بھی گوہر افشانی فرمائی وہ سب باتیں بے سر و پا جاہلانہ گفتگو سے آگے کچھ نہ تھیں۔

غصہ تو مجھے اپنے آپ پر بہت تھا کہاں پھنسایا تھا اپنے آپ کو۔ وہ تو خیریت گزری وہاں میرا واقف کار کوئی نہ تھا۔ میں نے ایک سوال صوفی صاحب سے کر ڈالا۔

''حضرت! یہ جن پہنتے کیا ہوں گے؟ آپ نے تو جن دیکھے ہیں نا!'' اس سوال پر وہاں بیٹھے ہوئے لوگ چونک گئے اور حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ مکمل خاموشی تھی اور لوگ مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے فوراً

عرض کیا۔ ''جناب گستاخی معاف، صرف معلومات کے لئے پوچھتا ہوں اور یہ بھی کہ جن کا قد کاٹھ کیسا ہوتا ہے؟''

عبدالسلام صاحب چیں بہ چیں ہو کر بولے، بھائی! آپ کو ابھی میں نے کچھ عرض کیا تھا۔ ایک اور صاحب بولے، وہ بند مٹھی آپ کو نظر نہیں آتی؟ خواہ مخواہ بے سر و پا سوال کر دیا۔ صوفی صاحب نے بڑی انکساری سے گردن ہلائی اور فرمانے لگے، کوئی بات نہیں بے چارے کو معلوم نہیں ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کے سوال کا جواب دیں گے۔ دیکھو یہ جو مسجد کی دوسری منزل کی چھت ہے اگر جن اس پر بیٹھے تو زمین پر پیر پھر بھی وہ لمبے کرے گا اور کئی تو اس سے بھی لمبے ہوتے ہیں۔ رہی بات پہناوے کی تو میرے عزیز! جنات کرتہ اور شلوار یا تہبند باندھتے ہیں۔ کپڑا سوتی ریشمی یا اونی ہو۔ یہ تو موسم کی بات ہے۔

ان مریدوں کا کیا حال ہوگا جن کے پیروں کا یہ حال ہے؟ یہ کرتہ اور شلوار یا تہبند کی بھی خوب ہی رہی۔ اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ ٹھیک ہے جنوں کے ملبوسات سوتی، ریشمی یا اونی کپڑے کے ہوتے ہیں تو پھر انہیں یہ چیزیں دستیاب کہاں سے ہوتی ہیں؟ اس قسم کے اور بہت سے سوالات ذہن میں ابھرتے چلے جائیں گے۔ ابھی میں اس تذبذب میں گرفتار تھا کہ صوفی صاحب نے فرمایا۔ ''اور وہ جمعرات کو حلوائیوں کی دکان سے مٹھائی بھی خرید کر لے جاتے ہیں''۔

عصر کی اذان ہو چکی تھی اور لوگ نماز کے لئے آنے لگے تھے۔ ان میں کچھ اصحاب میرے واقف کار بھی تھے۔ ایک صاحب نے مجھے زبردستی گھسیٹ کر صوفی صاحب کے قریب کیا۔ تعارف کرایا۔ ''یہ ہیں سلیمان شاہ صاحب''۔ صوفی صاحب ''اچھا اچھا'' کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے میری عزت افزائی کی ہے''۔ اب ان کی بند مٹھی جو جنوں کے بادشاہ کی رکھ تھی میرا نام سنتے ہی کھل گئی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے زور زور سے میرا ہاتھ تھامے مصافحہ کر رہے تھے مگر ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے خاندان، میری ذات اور میرے علم سے واقف تھے لیکن مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے سامنے شرمسار ہونے کے باوجود صوفی صاحب نے اپنی شعبدہ بازی جاری رکھی اور عقیدت مندان کے گرد جمع رہے۔ ایسے صوفی صاحبان کی منڈی کمزور عقیدوں والے لوگ ہی چلایا کرتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ اس قسم کے واقعات مجھے سپردِ قلم کرنے پڑ رہے ہیں جن کا تعلق تو براہِ راست میرے علم سے نہیں ہے لیکن آپ کو اس علم کی ماہیت اور اس علم کے نام پر کی جانے والی جعلسازی کی بھی آگاہی ہونی چاہئے۔ علم اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ ہر چیز کی ایک گنتی ہے۔ ہمیں یہاں پورا پورا اختیار دے کر اپنی اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے اور زیادہ اجاگر کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ انسان کی پیدائش بامقصد ہے بے مقصد نہیں لیکن اس کو کیا کہئے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔ مقناطیسیت ہر چیز میں موجود ہے۔ کشش ثقل کا مؤکل ہر جگہ کارفرما ہے۔ زمین کی کشش ثقل، سیاروں کی کشش ثقل اور مقناطیسی پتھر اور اس سے رگڑ کھائے ہوئے لوہے کی مستعار لی ہوئی مقناطیسیت ہمارے تجربوں اور مشاہدے میں ہے۔

ایسی ہی مقناطیسی کشش انسانوں اور حیوانوں کی آنکھوں میں بھی ہے۔ بلی، مکڑی، سانپ اور کئی درندے اپنے شکار کو صرف دیکھ کر بے حس کر دیتے ہیں۔ انسانی آنکھ میں کشش موجود ہے۔ اس کی طاقت

کو انسان اور زیادہ بڑھا سکتا ہے۔ اس کی بدولت وہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال کر انہیں اپنا تابع بنا سکتا ہے۔ ان کے حواس معطل کر سکتا ہے۔ اپنی مرضی کا بیان دلوا سکتا ہے اور بہت سے کام لے سکتا ہے۔ یہ ایک مؤکل ہے، آپ کا تابعدار، اشاروں پر کام کرنے والا لیکن یہ خود پانی کا گلاس آپ کو اٹھا کر نہیں دے سکتا لیکن دوسرے شخص کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ آپ کے من پسند پانی ٹھنڈا گرم جیسا آپ چاہیں ویسا ہی گلاس بھر کے لا دے گا حالانکہ آپ نے زبان سے، اشاروں سے یا لکھ کر حکم نہیں دیا لیکن اس آدمی نے آپ کی مرضی کے عین مطابق آپ کو پانی کا گلاس فراہم کر دیا۔

تو یہ سب کام بلاواسطہ نہیں ہوئے بلکہ آپ کی ایک پوشیدہ طاقت نے بالواسطہ کئے۔ اگر وہ جو آپ کو پانی کا گلاس لا کر دے رہا ہے، آپ کی اس کشش کی طاقت کو سمجھتا ہے اور خود بھی ایسی طاقت رکھتا ہے تو دونوں طاقتوں میں مقابلہ ہو گا۔ جس کی کشش زیادہ طاقت ور ہو گی وہ کم طاقت والے پر حاوی ہو جائے گا۔ آپ کو تو علم ہی ہے کہ کمزور ہمیشہ محکوم ہوتا ہے۔ اس میں مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ کسی بھی مذہب اور عقیدے کا شخص اپنے اندر یہ طاقت پیدا کر سکتا اور اس طاقت کو بہت زیادہ بڑھا سکتا ہے۔

مذہبی رسومات اگر برحق ہوں تو اس عمل کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ اس کے لئے صاف ستھرا ذہن، راسخ عقیدہ، طلب اور محنت کی ضرورت ہے۔ اگر خیالات پاکیزہ اور نیک نہ ہوں گے، اس کا عامل اس عمل پر عبور تو کجا اس علم سے رابطہ بھی قائم نہیں رکھ سکتا۔ گندے اور منتشر خیالات کا حامل آدمی یہ عمل نہیں کر سکتا۔ اگر ذہن میں یکسوئی نہ ہو گی تو بجائے فائدہ کے نقصان ہو گا۔ اس کو عجیب وغریب شکلیں نظر آئیں گی لیکن وہ جنات، بدروحیں، چڑیلیں یا بھوت پریت کی شکلیں نہیں ہوں گی۔ یہ ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں جو ہماری کمزوری کے تحت صرف ہمیں نظر آئیں گی۔ حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔

اس کیفیت کو نارمل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ منتشر خیالات کو کنٹرول کیا جائے۔ دوسرے کسی عامل کا اثر قبول کیا جائے۔ اگر عامل کا میگنیٹ اس کے مریض کے میگنیٹ کے خلاف یعنی اس کی ضد نہ ہو تو وہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ یہ خون والا حساب ہے۔ اگر خون کا گروپ نہیں ملتا ہے تو مخالف خون جو چڑھایا جا رہا ہے مریض کو اچھا کرنے کی بجائے مار ڈالے گا۔ اس طرح اگر عامل اور معمول میں ہم آہنگی نہ ہو گی تو وہ مار تو نہ ڈالے گا لیکن اس عامل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا، اس لئے ہمیں پہلے اس مریض کی سکریننگ ایک خاص عمل اور حساب سے کرنا پڑے گی اور پھر اس کا علاج ہو پائے گا۔ ظاہر ہے اس سب کے لئے تجربہ، قابلیت، مشاہدہ اور مراقبہ کی ضرورت پڑے گی۔ اگر وہ شخص ان تجربات سے آراستہ ہو گا تب ہی وہ اس کام کو انجام دے سکے گا۔

انسان کے اندر ایسی ایسی لاتعداد طاقتیں خوابیدہ ہیں جو محنت اور کوشش سے بروئے کار لائی جا سکتی ہیں لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ یہ کام بازاری عاملوں، کاملوں، فقیروں، درویشوں، فال رمل دلیل اور ستارہ شناسوں کے بس کے نہیں۔ ہاں، میں ستارہ شناسی کو مانتا ہوں۔ نجوم کی اہمیت کو سمجھتا ہوں لیکن میں علم نجوم کی بات کرتا ہوں اس نجومی کی نہیں کرتا جو فٹ پاتھ پر بیٹھا یا گلی گلی، محلہ محلہ پھر کر آواز لگاتا ہے اور سو دو سو لے کر اگلا پچھلا حساب آپ کو بتاتا ہے۔ ماتھے کی ایسی لکیر بھی آپ کو دکھاتا ہے جو اس سے پہلے آپ کے علم میں تھی ہی نہیں۔

❀❀❀

پردہ

تاریخی ناول

قسط: 12

☆ ریاض عاقب کوہلر

(aqibkohlar@gmail.com)

بنوقیشرہ کے باسی اپنا انجام بھولے نہیں ہوں گے۔ پورے قبیلے میں صرف انھی بندوں کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا تھا جنھیں وہ غلام بنا کر بیچ سکتے تھے۔ ہم بھی یونھی کریں گے بنوقیشرہ کی تباہی کا بدلہ بنوضبع کی مکمل تباہی ہی سے پورا ہوگا۔

تاریخ کے گم گشتہ اوراق سے کشید کی ہوئی سحر انگیز داستان

قُتیلہ کے چہرے پر غصہ ابھرا اپنی تلوار اٹھاتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر امریل بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میرا خیال ہے یہ وہ نہیں ہے۔'' حباشہ کے عقب میں کھڑے ہوئے آدمی نے قُتیلہ کی قامت دیکھتے ہوئے تذبذب سے کہا۔ ''بادیہ بنت شیبہ طویل قامت نہیں ہے اور اس کا جسم بھی مائل بہ فربہی ہے۔ جبکہ یہ چھریرے بدن کی مالک ہے۔''

''کوئی بات نہیں اساف۔'' حباشہ خباثت سے ہنسا۔ ''سردار شماس بن جزع کو یہ پھول پسند نہ بھی آیا تو ہم جیسے قدردانوں کا بھلا ہو.....''

مگر قُتیلہ کی بجلی کے کوندے کی طرح لہرانے والی تلوار نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی گردن اڑتی ہوئی کئی قدم دور جا گری تھی۔ اس کے عقب میں کھڑا اساف ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا تھا۔ اور جب تک اس کی حیرانی ختم ہوتی قُتیلہ دوسری بار تلوار گھما چکی تھی۔ اس مرتبہ اس نے دائیں جانب کے بجائے بائیں جانب سے تلوار گھمائی تھی اور اساف کی گردن، حباشہ کی گردن کے مخالف اتنے ہی فاصلے پر جا پڑی تھی جتنی دور حباشہ کی گردن گئی تھی۔ اسی وقت امریل آندھی و طوفان کی طرح باقی افراد کی طرف بڑھا تھا۔

''امریل ایک کو زندہ چھوڑ دینا۔'' قُتیلہ زور سے چلائی تھی۔ اگر اسے ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو امریل کی تلوار بچ جانے والے آخری آدمی کا مزاج بھی پوچھ چکی ہوتی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا تھا۔ چار آدمی نہایت مختصر وقت میں نیچے گر کر اذیت سے ہاتھ پاؤں جھٹک رہے تھے جبکہ ان کی گردنیں دھوپ میں پڑی تھیں۔ ان کا آخری زندہ رہ جانے والا ساتھی تلوار پھینک کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

خوب صورت نقوش کی حامل لڑکی اتنی ماہر شمشیر زن اور اتنی ظالم ہو گی یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ رہی سہی کسر حبشی امریل کی وحشت نے پوری کر دی تھی۔

قُتیلہ نے حباشہ کے کپڑوں سے صاف کر کے تلوار نیام میں ڈالی اور اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بے رحمی سے بولی۔ ''اب شروع ہو جاؤ تمھاری زندگی کی طوالت بولتے رہنے میں ہے۔''

''میں رحم کا طالب ہوں۔'' بچ جانے والا شخص سخت سہما ہوا تھا۔

قُتیلہ نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔ ''ملکہ قُتیلہ نے تعارف پوچھا ہے، معذرت کرنے کا نہیں کہا ہے۔''

وہ سرعت سے شروع ہو گیا۔ ''میرا نام یزید بن ملحان اور تعلق بنو نوفل سے ہے۔ ہم بنو جساسہ کی سردار زادی بادیہ بنت شیبہ کو ڈھونڈ رہے تھے جس نے ایک فارسی غلام کے ہمراہ راہِ فرار اختیار کی ہوئی

ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اس کی شکل دیکھی ہوئی نہیں تھی بس اتنا معلوم تھا کہ وہ صحرائے عرب کی خوب صورت ترین دوشیزہ ہے۔ آپ کی حسین صورت کو دیکھ کر میرے ساتھیوں کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اور وہ انجانے میں گستاخی کر بیٹھے۔''

قُتیلہ نے اشتیاق سے پوچھا۔''بادیہ بنت شیبہ کا تعلق بنو جساسہ سے ہے اور تمھارا بنونوفل سے پھر تم اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟''

''اس کے حسن کے قصے سن کر کافی قبائل کے سردارزادے اور سردار اس سے شادی کے خواہش مند تھے۔ بادیہ کے والد سردار شیبہ کا کسی ایک قبیلے کے لیے اثبات کرنا باقی قبائل کی خفگی کا باعث بنتا۔ پس اس نے بادیہ کے امیدواروں کے درمیان شمشیر زنی کا مقابلہ کرایا جس میں سردارزادے ہزیل بن شماس کو فتح نصیب ہوئی۔ وعدے کے مطابق بادیہ سے اس کا نکاح ہوگیا۔ بنو جساسہ میں ساری رات جشن منایا جاتا رہا اور صبح کے وقت جب تمام سو گئے تبھی سردار شیبہ کے بھائی شریم کا فارسی النسل غلام یشکر جسے اس نے آزاد کر کے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس نے سردارزادے ہزیل کو قتل کر دیا۔ بنونوفل کے سردار شماس بن جزع نے خون بہا کے طور پر ایک ہزار اونٹوں کے ساتھ یشکر اور بادیہ کا بھی مطالبہ کر دیا۔ اور بنو جساسہ کے انکار پر بنونوفل نے حملہ کر کے تمام قبیلے کا خاتمہ کر دیا لیکن یشکر سردارزادی بادیہ کو لے کر بھاگ نکلا اور اب ہم اسی کی تلاش میں ہیں۔''

قتیلہ نے پوچھا۔''بادیہ کے عاشق نے سردارزادے ہزیل کو مقابلہ کر کے قتل کیا یا نیند کی حالت میں انجام تک پہنچایا۔''

یزید جلدی سے بولا۔''اگر سردارزادہ جاگ رہا ہوتا تو یشکر جیسے دس جوانوں پر بھاری تھا۔ اس غلام نے سوتے میں ہزیل بن شماس کا خون بہایا ہے۔''

قُتیلہ نے منہ بنایا۔''گویا بزدل شخص ہے۔ اور بزدلوں کی ملکہ قُتیلہ کے قبیلے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

ملکان بن نول، یزید کو مخاطب ہوا۔''تمھارے قبیلے کی اور ٹولیاں بھی سردارزادی بادیہ کی تلاش میں نکلی ہوں گی؟''

''ہاں۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

ملکان بن نول نے اگلا سوال پوچھا۔''کیا تمام نے بادیہ بنت شیبہ کو نہیں دیکھا ہوا اور اندازے سے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔''

یزید نے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں، اکثر ٹولیوں کے ہمراہ ایسے افراد موجود ہیں جنھوں نے یشکر کو

دیکھا ہوا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے ہمیں آگے بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔'' ملکان بن نول قُتیلہ کی جانب متوجہ تھا۔

قُتیلہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔''اگر بنو نوفل والوں کے مقدر میں ملکہ قتیلہ کے ہاتھوں قتل ہونا لکھا ہے تو ان کی قسمت۔''

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' ملکان نے یزید کی جانب اشارہ کیا۔

''ہم نے دو دو آدمی قتل کیے ہیں ایک کی گردن پر تلوار چلانا تمھارا بھی فرض بنتا ہے۔'' بے رحمی سے مسکراتے ہوئے وہ لیٹ گئی تھی۔

یزید گڑگڑایا۔''میں رحم کی درخوست کرتا ہوں۔''

''امریل، ملکہ قُتیلہ کو گرمی محسوس ہو رہی ہے۔'' آنکھوں بند کرتے ہوئے اس نے امریل کو آواز دی۔

''جی مالکن۔'' مستعدی سے کہتے ہوئے امریل رسی کھینچ کر کپڑا جھلانے لگا۔

ملکان تلوار بے نیام کرتے ہوئے بچ جانے والے کی طرف بڑھا۔اس نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے ہاتھ باندھ لیے تھے لیکن ملکان بن نول نے بے دردی سے تلوار کا وار کرتے ہوئے اسے بھی ساتھیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ایک مردے کے کپڑوں سے تلوار کی دھار صاف کر کے اس نے تلوار نیام میں کی اور لاشوں کو گھسیٹ کر سائے سے دور پھینکنے لگا۔لاشوں کو ٹھکانے لگا کر اس نے تلواریں اکٹھی کیں اور پھر گھوڑوں کو سنبھالنے لگا۔جب وہ فارغ ہو کر دوبارہ لیٹنے کے لیے پہنچا تب تک قُتیلہ کے گہرے سانس اس کے سو جانے کا اعلان کر رہے تھے۔

☆☆☆

''مجھے سچ جاننا ہے؟'' جبلہ بن کنانہ بغیر کسی تمہید کے عریسہ کو مخاطب ہوا تھا۔

چند لمحے ہاں، ناں کی کشمکش میں رہنے کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔''وہ آئی تھی یہاں۔''

''مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' جبلہ نے بڑی مشکل سے غصے پر قابو پایا تھا۔

''وہ رات گئے یہاں پہنچی تھی چند لمحوں کی خیرات جھولی میں ڈالی اور چلتی بنی۔'' عریسہ کی آواز بھرانے لگی تھی۔

''اس کے جاتے ہی مجھے مطلع کرنا چاہیے تھا۔نہیں تو صبح ہوتے ہی مجھے اطلاع دی جا سکتی تھی۔'' جبلہ سخت خفا تھا۔

Pakistanipoint.com

''وہ کم سن و کم عقل ہے سردار!'' عریسہ سر جھکاتے ہوئے گڑگڑائی۔

جبلہ طنزیہ لہجے میں بولا۔''اہل بنونسر کو اس نے موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، بنو احمر کے دو سرداروں کی گردنیں کاٹ چکی ہے اور وہ اب تک بچی ہے۔''

عریسہ نے نادم انداز میں گردن جھکا لی تھی یوں جیسے قُتیلہ کی ہر غلطی کی وہ ذمہ دار ہو۔

''جانتی ہو مجھے جتانے کے لیے وہ اپنے چھوٹے بھائی طرفہ کے کتے کو بھی ساتھ لے گئی ہے۔ یہ بات مجھے حطام کے غائب ہوتے ہی سے سمجھ لینا چاہیے تھی، مگر میں نے سوچا شاید کہیں مرکھپ گئی ہوگی۔''

''نسر نہ کرے اسے کچھ ہو۔'' عریسہ گھبرا گئی تھی۔

''تمھیں اس کے ساتھ چلا جانا چاہیے تھا۔'' جبلہ کے لہجے میں مشورے کے بجائے بیزاری کا عنصر نمایاں تھا۔

''کیا بنونسر کے لیے عریسہ مفید نہیں رہی۔'' لہجے سے چھلکتے دکھ کو اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''کسی شخص کی ذات سے پہنچنے والے فائدے اور نقصان کا تناسب مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تمھاری وجہ سے بنونسر کسی بھی وقت تباہی کا شکار ہو سکتا ہے۔ جب تک تم یہاں موجود ہو قُتیلہ بنونسر کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اور اس سے کوئی بعید نہیں کہ مستقبل کے سردار طرفہ یا اس کے بھائی سامہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ جس لڑکی کو باپ کا لحاظ نہیں اس کے نزدیک بھائیوں کی کیا اہمیت ہوگی۔ بلکہ طرفہ کا کتا چرا کر اس نے اشارہ بھی دے دیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنے قبیلے میں واپس لوٹ جاؤ۔ وہ صرف تمھاری وجہ سے بنونسر کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اور یقیناً تمھیں اپنا اصل قبیلہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کیوں کہ بنو جساسہ اہلِ حضر ہیں۔''[1]

''اور یہ ہے میری سترہ سالہ خدمتوں کا صلہ۔'' عریسہ کی آنکھوں میں نمی ابھری۔

جبلہ بغیر لگی لپٹی رکھے صاف گوئی سے بولا۔''عریسہ بنت منظر!.....بنونسر میں تمھاری آمد کے شروع کے دو تین ماہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے بعد تمھیں یہاں ہمیشہ عزت ہی ملی ہوگی۔ اور اب بھی یہاں سے بھیجنا حفاظتی تدابیر پر عمل پیرا ہونا ہے نہ کہ تم سے جان چھڑانا۔ بنونسر کے لیے قُتیلہ ناسور کی شکل اختیار کر گئی ہے اور ناسور کا مکمل علاج اسے کاٹ کر بدن سے علاحدہ کر دینے میں ہوتا ہے۔ اگر ناسور کو بدن سے نکالتے وقت تندرست بدن کا کچھ حصہ بھی ساتھ نہ کاٹا جائے تو مکمل شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔''

---

[1] عرب معاشرہ قدیم ترین زمانوں سے دو واضح حصوں میں منقسم چلا آ رہا ہے۔''اہل البدو'' یعنی خانہ بدوش اور''اہل الحضر'' یعنی مقیم لوگ۔ اس بارے پہلے تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔

PakStanPoint.com

عریسہ ملتجی ہوئی۔ ''سردار!..... جب تک وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتی مجھے یہیں رہنے دیں۔ اس نے خود بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے جلد ہی یہاں سے لے جائے گی۔ اور وہ چاہے یا نہیں اس بار میں اس کے ہمراہ چلی جاؤں گی۔''

''فکر نہ کرو، اگر یہاں آئی تو میں اسے بنو جساسہ کا پتا بتا دوں گا۔ لیکن تمھیں مزید یہاں نہیں رکھ سکتا۔ اس کی طرف داری کر کے تم نے قُتیلہ اور بنونسر کے مفادات میں سے قُتیلہ کا انتخاب کیا ہے۔ اور مجھے ڈر ہے کہ اس کی شہ پر تم یہاں کسی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتی ہو۔''

''اتنی گھٹیا لگتی ہوں۔'' عریسہ شاکی ہوئی۔

''محبت بہت کچھ کروا دیتی ہے۔ اگر تم بنونسر کے ساتھ مخلص ہوتیں تو قُتیلہ کی آمد کے بارے مجھ سے کچھ نہ چھپاتیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے وہ پہلے بھی یہاں آتی رہی ہو اور تم نے ہمیں بے خبر رکھا ہو.....''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' عریسہ کراہی۔

''تیار رہنا، شام کو تین افراد تمھارے ہمراہ جائیں گے۔ اور یاد رکھنا کسی طریدہ سے واسطہ رکھنا قبیلے سے غداری کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر میری آنکھوں پر تمھاری خدمات کی پٹی نہ بندھی ہوتی تو یقیناً میرا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا۔'' جبلہ پر اس کی منت زاری کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''سردار، آپ نے مجھ سے شادی نہیں کی لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو خاوند ہی سمجھا ہے۔ میری چھوٹی سی خطا کی اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ قُتیلہ سے محبت کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں طرفہ اور سامہ کو پیار نہیں کرتی۔ آپ کے تینوں بچے ہی مجھے اپنی اولاد لگتے ہیں۔ اب بنو جساسہ میں میرا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک بوڑھی ماں تھی جانے کب کی مر کھپ گئی ہو گی۔''

''تم اعتبار کھو چکی ہو عریسہ۔ میری غلطی کہ ایسا بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔'' لہجے میں خودغرضی سموتے ہوئے جبلہ لمبے ڈگ رکھتا ہوا خیمے سے باہر نکل گیا تھا۔

عریسہ گہرا سانس لیتے ہوئے لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے بنونسر سے جانے کا دکھ نہیں تھا۔ بس یہ اندیشہ تھا کہ جب قُتیلہ وہاں آتی تو اسے نہ پا کر پریشان ہو جاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عریسہ کی غیر موجودی سے بھڑک کر وہ کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھا لیتی اور اکیلی لڑکی اتنے بڑے قبیلے سے ٹکر تو نہیں لے سکتی تھی۔ اہلِ بنو احمر پہلے سے اس کی تلاش میں سرگرداں تھے، اگر ان کے ساتھ بنونسر والے بھی اس کی موت کے درپے ہو جاتے تو اسے صحرائے اعظم میں پناہ ملنا مشکل ہو جاتی۔ قتیلہ کے بچپن میں اس سے ہلکی سی ہمدردی رکھنے والے دل میں قُتیلہ کے جوان ہونے تک اس کی محبت چھتناور درخت کی صورت مکمل بدن میں پھیل گئی تھی۔ اس کی محبت و ہمدردی کا محور و مرکز بس قُتیلہ ہی کا وجود تھا۔ اندیشوں کی بہتات

ے سخت بے چین کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

ان کے بنو قطام پہنچنے تک اکتف بن قیس اور اشل بن حرام، سردار قیدوم کو ان کی جانے کی بابت بتلا چکے تھے۔ یشکر کو وہاں دیکھ کر قیدوم کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

''اکتف اور اشل تو کوئی اور کہانی سنا رہے تھے؟''

یشکر نے وضاحت کی۔''اہلِ بنو عطفان کے سامنے مجھے جھوٹ بولنا پڑ گیا تھا۔ کیوں کہ خصرامہ کی تدفین کے بعد وہ پاگلوں کی طرح ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اور ہم فی الحال تھکے ہیں چند گھڑیاں آرام کر کے ہی سفر کے قابل ہو سکیں گے۔''

قیدوم مسکرایا۔''ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ نیا سردار ربان بن ساعد جانے کب سے قبیلے کی سرداری کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کی خصرامہ بن قلاص سے ہونے والی اَن بن سے تمام واقف ہیں۔ جس شخص کی وجہ سے اسے سرداری ملی وہ کبھی بھی اسے ضائع نہیں کرے گا۔ البتہ خصرامہ کے ہمدردوں کو دکھانے کے لیے شاید وہ چند ٹولیاں تمھاری تلاش میں نکال بھی دے۔ لیکن اس کی پوری کوشش یہی ہو گی کہ ان ٹولیوں کا رخ تمھارے جانے کی سمت کو نہ ہو۔''

یشکر کے چہرے پر اطمینان نمودار ہوا۔''اچھا، آپ کتنی دیر میں ہمارا نکاح پڑھا سکتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی بادیہ نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

قیدوم کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرانی نمودار ہوئی اور پھر وہ خوش دلی سے مسکرا دیا تھا۔

''یقیناً غداء 1 کے تیار ہونے تک اس بابرکت کام سے فارغ ہو جائیں گے۔''

اور پھر سردار قیدوم نے یشکر اور بادیہ کی شادی کر دی تھی۔ یشکر نے صاعقہ اور عنبر کو بادیہ کا حق مہر مقرر کیا تھا۔

''سردارزادی کو ایک گھوڑا اور ایک تلوار مہر میں ملی ہے، واہ.....'' تنہائی ملتے ہی بادیہ متبسم ہوئی۔

''یہ تلوار مجھے اپنے باپ سکندر نے تحفے میں دی تھی اور یہ گھوڑا بھی اپنے باپ شریم سے حاصل ہوا ہے۔ اور میرا سب سے قیمتی سرمایہ یہی تھا جو میں نے تمھارے حوالے کر دیا ہے۔''

بادیہ اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے چاہت بھرے لہجے میں بولی۔''اچھی طرح جانتی ہوں، کہ آپ کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے۔''

''پھر طنزیہ انداز میں صاعقہ اور عنبر کا ذکر کیوں کیا ہے۔ یہ تلوار اردشیر بن بابک بن ساسان کی

---

1. اس دور میں عربوں میں عموماً دو اوقات کا کھانا مستعمل تھا۔ طعامِ صبح جسے غداء کہتے اور طعامِ شب، جسے عشاء کہتے تھے۔

ہے جو محترم و معزز سکندر کے آباؤ اجداد میں نسل در نسل منتقل ہوتی آ رہی ہے۔''

''کیا سکندر آپ کا اصل باپ نہیں ہے۔'' سکندر کا نام لینے پر بادیہ چونک گئی تھی۔

''نہیں۔'' یشکر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''انھوں نے مجھے سوقِ صحار میں کسی بدو سے خریدا تھا۔ میری رگوں میں بھی کسی عرب ہی کا خون دوڑ رہا ہے۔''

بادیہ کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ ''یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہیں بتائی۔''

''محبت کرنے والے حسب نسب اور مال و دولت وغیرہ نہیں دیکھتے۔ بس وہ محبت کرتے ہیں۔ اگر تم سردار زادی کے بجائے ایک لونڈی بھی ہوتیں تو مجھے اتنی ہی پیاری لگتیں اور تب بھی میں تمھیں اپنی سردار زادی اور شہزادی ہی سمجھتا۔''

وہ وارفتگی سے بولی۔ ''لونڈی تو اب بھی ہوں لیکن صرف اپنے یشکر کی۔''

''مجھے یقین تھا کہ اہور مزدا تمھیں میرے نصیب میں ضرور لکھے گا۔ اور دیکھ لو میں نے تمھیں پا لیا۔''

بادیہ نے پوچھا۔ ''یہ اہور مزدا کون ہے کیا یہ عزیٰ اور ہبل سے بھی زیادہ طاقتور ہے؟''

''ہاں اہور مزدا سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ وہ نور کا دیوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بدی کے دیوتا اہرمن سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ بابا جان بتایا کرتے تھے کہ اس کائنات کی عمر بارہ ہزار سال ہے۔ شروع کے تین ہزار سال کے عرصے میں اہور مزدا اور اہرمن، اپنے اپنے عالم میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو امن و آرام سے رہے۔ دونوں عالم کی حدیں صرف ایک جانب سے ملی ہوئی ہیں اور باقی تین اطراف سے دونوں عالم لامتناہی ہیں۔ عالم نور اوپر ہے اور عالم ظلمت نیچے ہے جبکہ ان کے درمیان ہوا ہے۔ پہلے تین ہزار سال کے درمیان اہور مزدا کی مخلوقات امکانی حالت میں رہیں۔ پھر بدی کے دیوتا اہرمن نے نور کو دیکھ لیا اور اسے نابود کرنے کے درپے ہوا۔ نور کے دیوتا اہور مزدا جسے مستقبل کا سب حال معلوم تھا۔ اس نے بدی کے دیوتا اہرمن کو نو ہزار سال کی جنگ کی دعوت دے دی۔ جبکہ اہرمن کو صرف ماضی کا علم تھا چنانچہ وہ رضامند ہو گیا۔ اس کے بعد اہور مزدا نے پیشن گوئی کی کہ اس جنگ کا خاتمہ عالم ظلمت کی شکست پر ہوگا۔ یہ سن کر اہرمن خوف زدہ ہو گیا اور دوبارہ ظلمت میں گھس کر پناہ گزین ہوا۔ وہاں وہ تین ہزار سال تک پڑا رہا۔ اس اثناء میں اہور مزدا نے مخلوقات کو پیدا کرنا شروع کر دیا۔ سب سے آخر میں اس نے گائے اور سب سے پہلا دیوہیکل انسان بنایا جس کا نام گیومرد تھا۔ اور وہ نوع انسانی کا ابتدائی نمونہ تھا۔ تب اہرمن نے ظلمت سے نکل کر اہور مزدا کی مخلوقات پر حملہ کر دیا۔ عناصر کو ناپاک کیا۔ حشرات اور موذی قسم کے کیڑے یعنی سانپ بچھو وغیرہ پیدا کیے۔ اہور مزدا نے آسمان کے آگے ایک خندق کھودی تھی

لیکن اہرمن حملے پر حملے کرتا رہا اور بالآخر اس نے پہلے تو گائے کو اور پھر گیومرد کو مار ڈالا لیکن گیومرد کے تخم سے جو زمین میں پنہاں تھا چالیس برس بعد ایک درخت اگا جس میں سب سے پہلا انسانی جوڑا مشیگ اور مشیانگ پیدا ہوا۔ اور اس طرح نور و ظلمت کی آویزش کا دور شروع ہوا۔

خیر و شر کی اس جنگ میں انسان اچھے برے اعمال کے مطابق اہور مزدا یا اہرمن کے مددگار ہیں۔ جو لوگ نیکی کے راستے پر چلیں گے وہ مرنے کے بعد چنوت پل پر سے آسانی سے گزر کر بہشت میں جا داخل ہوں گے۔ لیکن جب بدکار لوگ اس پر سے گزریں گے تو پل تنگ ہو کر تلوار کی دھار کی مانند باریک ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نیچے گر جائیں گے اور وہاں اپنے گناہوں کے مطابق عذاب سہیں گے۔ جن لوگوں کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے وہ ہمیست گان میں مقیم ہوں گے۔ وہاں نہ جزا ہے نہ سزا۔ نوع بشر کے ابتداء کے تین ہزار سال کے بعد انسان کو سچا مذہب سکھانے کے لیے زرتشت کو بھیجا گیا۔ اس وقت دنیا کی عمر کے صرف تین ہزار سال باقی تھے۔ ہر ہزار سال کے بعد ایک نجات دہندہ بطریق اعجاز زرتشت کے تخم سے جو ایک جھیل میں پوشیدہ ہے پیدا ہوتا ہے جس وقت تیسرا اور آخری نجات دہندہ پیدا ہوگا جو افضل سوشنیس کہلاتا ہے، تو خیر و شر میں آخری اور فیصلہ کن جنگ شروع ہو جائے گی۔ تمام ہیرو اور دیو باہم لڑنے کے لیے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ تمام مردے اٹھائے جائیں گے۔ اور دمدار ستارہ گوچہر زمین پر آ گرے گا۔ زمین میں اس شدت سے آگ لگے گی کہ تمام دھاتیں پگھل کر ایک آتشیں سیلاب کی طرح روئے زمین پر پھیل جائیں گی۔ تمام انسانوں کو جو پہلے سے زندہ ہوں گے یا مردے سے دوبارہ زندہ ہوئے ہوں گے۔ اس سیلاب میں سے گزرنا ہوگا۔ وہ سیلاب نیکو کاروں کے لیے خوشگوار گرم دودھ کی مانند ہوگا۔ اس امتحان کے بعد پاک صاف ہو کر سب لوگ بہشت میں داخل ہو جائیں گے۔ خداؤں اور دیوؤں کی آخری جنگ کے بعد جس کا خاتمہ دیوؤں کی شکست اور تباہی پر ہوگا اہرمن ابدالآباد کے لیے تاریکی میں جا گرے گا اور زمین صاف و ہموار ہو جائے گی اور دنیا اس طرح پاک ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے سکون و امن میں رہے گی۔''1

وہ محویت سے یشکر کی تفصیلی باتیں سن رہی تھی اس کے خاموش ہوتے ہی گویا ہوئی۔ ''کیا بہشت میں سب اکٹھے ہوں گے؟''

یشکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں زمین پر محبت کرنے والے مرد و عورت جنھوں نے اہور مزدا کا ساتھ دیا ہوگا وہ بہشت میں بھی میاں بیوی ہوں گے۔''

''اگر میں عزیٰ کی پوجا کے ساتھ اہور مزدا اور شمس کو بھی دیوتا مان لوں تو کیا میں بہشت میں آپ

---

1 از تاریخ ایران بعہد ساسان۔

کے ساتھ رہ پاؤں گی۔''

''ہاں بالکل رہ پاؤ گی۔اور یاد رکھو جتنے بھی نیکی اور روشنی کے دیوتا ہیں تمام اہورمزدا کی طرف ہیں۔اور جتنی کالی طاقتیں ہیں ساری اہرمن کی مددگار ہیں۔''

''اچھا یہ تلوار میری طرف سے تحفہ رکھ لیں۔'' صاعقہ کو بے نیام کر کے بادیہ نے بوسا دیا اور تلوار یشکر کی طرف بڑھادی۔

''کیا میرا تحفہ پسند نہیں آیا۔'' یشکر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''جان سے بھی زیادہ عزیز ہے لیکن آپ میرے محافظ بھی تو ہیں ناں۔اور یہ تحفہ اس لیے واپس کر رہی ہوں کہ میری حفاظت کر سکیں۔''

یشکر تلوار تھامتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔''میں اپنی سردارزادی کے قدموں میں اتنے زیورات اور ملبوسات ڈھیر کروں گا جتنے فارس کی ملکہ کے پاس بھی نہیں ہوں گے۔''

وہ اس کے کندھے پر سر رکھتے پوچھنے لگی۔''مجھے فارس لے جاؤ گے ناں۔''

''ہاں،صحرائے اعظم کی لاثانی حسینہ کو فارس ضرور لے جاؤں گا۔'' یشکر کے بازوؤں نے اس کے نرم و ملائم جسم کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

☆☆☆

''یہ جان کر اچھا لگا کہ کوئی لڑکی آپ جیسی جنگجو نہ سہی خوب صورت تو ہے۔'' ملکان بن نول مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔دھوپ کی شدت میں کمی ہوتے ہی انھوں نے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔''ملکہ قُتیلہ کو اپنی خوب صورتی سے کوئی غرض نہیں ہے۔بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اچھی خاصی نفرت ہے کیوں کہ ملکہ قُتیلہ کی در بدری کی اصل وجہ یہی صورت ہی تو ہے۔''

''آپ شادی نہیں کریں گی۔'' ملکان کے لہجے میں اشتیاق چھپا تھا۔

قتیلہ نے ترچھی نظر سے اسے گھورا۔''تم کرو گے ملکہ قُتیلہ سے شادی؟''

ملکان جھجکا۔''بات میری پسند یا خواہش کی نہیں ملکہ قُتیلہ کی مرضی کی ہے۔''

''فرض کرو ملکہ قُتیلہ یہی چاہتی ہو۔'' قُتیلہ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھل رہی تھی۔

''میں نے ساری زندگی طبقہ بن عتیبہ کے خواب دیکھے ہیں۔بس میں یہ درخواست کروں گا کہ ملکہ مجھے اس سے شادی کرنے سے نہ روکے۔باقی ملکان بن نول کو ملکہ اپنا غلام پائے گی۔''

قُتیلہ کا مترنم قہقہہ گونجا۔''ملکان بن نول،ملکہ قُتیلہ کی نظریں آج تک کسی ایسے مرد کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوئیں جس کی اجارہ داری اپنے بدن پر قبول کر سکے۔اور یاد رکھنا ملکہ قُتیلہ تمھیں جاں نثار

Pakistanipoint.com

ساتھی سمجھتی ہے۔ کسی خوش فہمی یا حماقت کا ارتکاب کرنے سے پہلے ملکہ قُتیلہ سے مشورہ کر لینا کیوں کہ قُتیلہ کو بنوطرید کے مردوں میں کمی کرنا پسند نہیں ہے۔''

ملکان سنجیدگی سے بولا۔''ملکہ، میں نے کبھی ایسی خواہش دل میں نہیں پالی ہے۔ پہلے آپ سے متاثر تھا اور اب عقیدت رکھتا ہوں۔ آپ کو ملکہ کہتا نہیں سمجھتا بھی ہوں۔''

''ملکہ قُتیلہ مردوں کی نظریں پہچانتی ہے ملکان!'' وہ بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔

امریل خاموش تھا۔ اور وہ عموماً خاموش رہنا ہی پسند کرتا تھا۔ بنونوفل اور بنواحمر والے سواروں کے گھوڑے اس کی زین سے بندھے اس کے پیچھے ایک قطار میں دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

''اب منزل کتنی دور ہے۔'' وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔

''اگر اسی رفتار سے دوڑتے رہے تو شعریٰ یمانیہ [1] کے غروب سے گھڑی بھر پہلے پہنچ جائیں گے۔'' ملکان بن نول نے آسمان دنیا کے روشن ستارے کا نام لیا۔

قُتیلہ نے پوچھا۔''کیا طبقہ بھی تمھیں پسند کرتی ہے کہ یا اسے زبردستی لانا پڑے گا۔''

ملکان خوش دلی سے بولا۔''اسی کی ایما پر تو میں نے دو قتل کیے تھے۔''

''اگر وہ اتنی ہی پیاری تھی تو تمھیں پہلے شادی کر لینا چاہیے تھی۔''

''میں نے اس کی شادی ہو جانے کے بعد پہلی بار اسے دیکھا تھا۔'' ملکان تفصیل بتاتا ہوا بولا۔ ''طبقہ کا پہلا شوہر قیس میرا واقف کار تھا۔ اور اسی سے تعلق کی وجہ سے مجھے طبقہ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اور تب ہمیں محسوس ہوا کہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ پس میں نے قیس کو منت کی تھی کہ وہ کوئی بھی قیمت لے کر طبقہ کو آزاد کر دے مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً مجھے انتہائی قدم اٹھانا پڑا تھا۔ قیس کے بعد اس کے دوسرے بھائی کو بھی میں نے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ طبقہ سے دور رہے مگر اسے بھی طبقہ کی خوب صورتی لے ڈوبی۔''

---

[1] یاد رہے کہ آسمان پر نظر آنے والے ستارے زمین کی مخصوص حرکت کی وجہ سے سورج کی طرح مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتے نظر آتے ہیں۔ اور ہر ستارہ چار منٹ کم چوبیس گھنٹے میں چکر مکمل کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جو ستارہ آج رات کے نو بجے آسمان پر جس مقام پر دکھائی دے گا۔ اگلے دن اس مقام پر مقررہ وقت سے چار منٹ پہلے پہنچ جائے گا۔ اس طرح ہفتہ میں آدھا گھنٹا اور تین ماہ کے بعد چھ گھنٹے کا فرق پڑے گا۔ اور عرب ستاروں کی حرکت پر بہت گہری نگاہ رکھتے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا تھا کہ کس مشہور ستارے کے طلوع کا وقت کیا ہے اور اس نے غروب کس وقت ہونا ہے۔ ستاروں سے راستا معلوم کرنے کے علاوہ وہ ان سے اوقات معلوم کرنے کا کام بھی لیتے تھے۔ مختلف ستاروں کے طلوع و غروب کا موسمی تغیرات سے کیا ربط ہے یہ انھیں اچھی طرح پتا تھا۔ اس بارے انھوں نے منظوم گر تیار کر رکھے تھے۔ مثلاً ''جب تیسری کا چاند ثریا میں آجائے تو سمجھو جاڑا آگیا۔ یا'' جب چودھویں کے چاند اور ثریا کی یکجائی ہو تو آغازِ سرما کی خنکی آجاتی ہے۔

''کیا وہ ملکہ قُتیلہ سے بھی خوب صورت ہے؟'' قتیلہ نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔
ملکان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، پر مجھے لگتی ہے۔''
قُتیلہ خاموش رہی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد بھی وہ چلتے رہے تھے۔ ملکان نے ستاروں کی مدد سے اپنا رخ بنو عذرہ کی سمت ہی رکھا تھا۔ نصف رات بیت چکی تھی جب وہ بنو عذرہ کے مضافات میں پہنچے۔

آبادی میں داخلے سے پہلے قُتیلہ کے حکم پر تمام رک گئے تھے۔
وہ امریل کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''امریل تمھیں یہیں رہ کر ہمارا انتظار کرنا ہوگا۔''
امریل کے چہرے پر خفگی نمودار ہوئی۔ ''مالکن کو امریل کی منشا کا پتا ہے۔''
وہ رکھائی سے بولی۔ ''ملکہ قتیلہ کسی کی منشا کی پابند نہیں ہے امریل۔''
وہ معترض ہوا۔ ''مالکن!.....ملکان بن نول مجھ سے اچھا لڑاکا نہیں ہے۔ وہ آپ کی حفاظت مجھ سے بہتر نہیں کر سکتا۔''

خلاف طبیعت وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''امریل!.....تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ملکہ قُتیلہ کو کسی محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی ملکان کو بہتر سمجھنے کی وجہ سے نہیں، علاقہ پہچاننے کی وجہ سے ترجیح دی ہے۔ اور تمھیں یہاں چھوڑنے کا مقصد گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا ہے تاکہ ہمیں بھاگتے ہوئے کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ اور قبیلے میں حطام کو ساتھ لے کر داخل ہوئے تو اس نے بنو عذرہ کے کتوں پر بھونک بھونک کر ہر سوئے ہوئے آدمی کو جگا دینا ہے۔''

''غلام شرمندہ ہے۔'' امریل نے خفیف لہجے میں اقرار کیا۔
''چلو ملکان۔'' قُتیلہ گھوڑے سے اترتے ہوئے بولی۔ امریل کی بات کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

ملکان سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ملکہ قتیلہ تلوار بے نیام کرتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لی تھی۔
ملکان اُسے بنو عذرہ کی مختلف گلیوں سے گزارتے ہوئے ایک حویلی نما مکان کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔
''یہ ہے بنو عذرہ کی شہزادی کی حویلی؟'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔
''جی ملکہ۔'' ملکان بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔
''دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہونا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے قُتیلہ نے اسے نیچے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ملکان اس کا مقصد فوراً جان گیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ قُتیلہ نے تلوار نیام میں کرتے ہوئے اس کے کندھوں پر پاؤں رکھے اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہو

Pakistanipoint.com

گیا۔ دیوار کا کنارہ اب بھی قتیلہ کی رسائی سے دو تین ہاتھ اوپر تھا۔ ذرا سا جھکتے ہوئے وہ زور سے اچھ
اگلے ہی لمحے وہ دیوار کی کگر میں انگلیاں پھنسا چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بازوؤں کے سہارے آ
سے اوپر اٹھتی گئی۔ بیس اکیس کا چاند اس وقت تک طلوع ہو کر کافی اوپر آ چکا تھا۔ چوڑی دیوار پر لیٹ
اس نے صحن کا جائزہ لیا وسیع صحن میں اسے کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف حویلی کے دروازے
سامنے ایک آدمی چارپائی پر لیٹا ہوا نظر آیا۔ حویلی کے اندر کی جانب لٹک کر وہ پنجوں کے بل زمین
کودی۔ نیچے گرتے ساتھ وہ دیوار کی جڑ میں دبک کر بیٹھ گئی تھی لیکن چارپائی پر لیٹے آدمی کی نیند میں
خلل نہیں پڑا تھا۔ لمحہ بھر ٹھہر کر وہ دبے قدموں اس کے قریب پہنچی۔ وہ اونی کمبل میں غائب تھا۔ تیز د
خنجر نکال کر اس نے ایک جھٹکے سے سوئے ہوئے شخص کے سر سے کمبل اتارا اور اس سے پہلے کہ وہ ہ
کر اٹھ سکتا قتیلہ کا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا تھا۔

اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ زور سے مچلا لیکن اتنی دیر میں تیز دھار خنجر اس کے گلے کو آ
سے زیادہ کاٹ چکا تھا۔ اس کا جسم اذیت سے پھڑکنے لگا تھا۔ قتیلہ نے اسے چارپائی سے نیچے پھینکا
کہ چارپائی پر اس کے تڑپنے کی وجہ سے آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اسے ایڑیاں رگڑتا چھوڑ کر وہ حویلی کے بڑے دروازے کے قریب ہوئی اور اس میں بنی
کھڑکی کھول کر ملکان کو اندر بلا لیا۔

''اس کے کمرے سے واقف ہو نا؟'' قتیلہ نے سرگوشی کی۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ملکان رہنمائی کے لیے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک اند
کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ قتیلہ نے ہاتھ اٹھا کر ہلکی سی دستک دی۔

''کون؟'' کسی مرد کے پاؤں کی چاپ ابھری۔

''مالک دروازہ کھولیں۔'' قتیلہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا۔ اس کی مترنم آواز ایسی نہیں تھ
کوئی مرد خطرہ محسوس کرتا۔ دروازہ فوراً کھلا۔ کمرے میں قندیل روشن تھی لیکن دروازہ کھولنے والے کی
کی طرف پیٹھ تھی اس لیے وہ صحیح طریقے سے اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یوں بھی اسے کسی کی شکل
کوئی غرض نہیں تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اس کا دایاں بازو سرعت سے حرکت میں آیا اور تلوار کی نوک د
کھولنے والے کے گلے کے نرم گوشت میں دھنستی چلی گئی۔ ایسے وقت وہ ہمیشہ گلے ہی کو نشانہ بنا
تاکہ مخالف کو چیخنے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ خرخراتا ہوا نیچے گر گیا تھا۔

اس کی لاش کو پھلانگتے ہوئے دونوں اندر داخل ہوئے۔ پچیس چھبیس سال کی ایک عور
وقت جاگی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سریلی چیخ بلند کرتی۔ ملکان سرعت سے بولا۔

''طبقہ!.....میں ہوں ملکان۔''

چیخنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے وہ اچھل کر بستر سے اتری اور ملکان سے لپٹ گئی تھی۔

''یہ چونچلے خطرے کی حدود سے نکلنے کے بعد اچھے لگتے ہیں۔'' درشت لہجے میں کہتے ہوئے قتیلہ پیچھے مڑ گئی تھی۔

''جی ملکہ۔'' مؤدب لہجے میں کہتے ہوئے ملکان بڑی مشکل سے طبقہ سے علاحدہ ہوا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔

''مجھے زیورات تو اٹھانے دو۔'' اس صورتِ حال میں بھی ایک عورت کو اپنے زیورات نہیں بھولے تھے۔

''جلدی کرو۔'' ملکان نے اثبات میں سر ہلایا۔

طبقہ نے سرعت سے لکڑی کا صندوق کھولا اور زیورات کی پوٹلی اٹھا کر بغل میں دبا لی۔ اگلے دو تین لمحوں میں وہ داخلی دروازے پر منتظر کھڑی قتیلہ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ انھیں قریب آتا دیکھ کر قتیلہ حویلی سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ امریل کے پاس پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

سردار قیدوم کے اندازے صحیح ثابت ہوئے تھے۔ بنو عطفان کے نئے سردار ربان بن ساعد نے یشکر اور بادیہ کی تلاش میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ بادیہ کی محبت پا کر یشکر نے ہر قسم کے اندیشے، خطرات پسِ پشت ڈال دیے تھے۔ اس کا دل ہی آگے سفر کرنے کو نہیں کر رہا تھا۔ وہ دن رات بادیہ کے ساتھ جھونپڑے میں گھسا رہتا۔ بادیہ کی وارفتگی اور محبت بھی یشکر سے کسی درجہ کم نہیں تھی۔ چار دن بنو قطام میں گزار کر یشکر بادل نخواستہ آگے جانے کو تیار ہوا۔ اس کا ارادہ فارس جانے کا تھا۔ اسے امید تھی کہ سکندر کی غیر موجودی میں بھی شہنشاہِ ایران نے اسے سکندر کی جگہ بہ طور محافظ رکھ لینا تھا۔ سکندر کی جائیداد وغیرہ واپس حاصل کر کے وہ بادیہ کو عیش و آرام والی زندگی مہیا کر سکتا تھا۔

''میرا تو مشورہ ہے کہ کچھ عرصہ ہمیں خدمت کا موقع دیتے۔'' اسے جانے پر تیار دیکھ کر سردار قیدوم نے خلوص بھرے لہجے میں مشورہ دیا تھا۔

''شکریہ سردار!.....مگر ہمیں جلد از جلد فارس پہنچنا ہوگا۔ اہل بنو نوفل کسی بھی وقت ادھر کا رخ کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں پناہ دینے کی وجہ سے وہ بنو قطام کے خلاف بھی کارروائی کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔''

سردار قیدوم نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اہلِ بنوقطام اپنے مہمانوں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔''

یشکر جلدی سے بولا۔ ''میں نے آپ کی شجاعت یا خلوص پر شک کا اظہار نہیں کیا سردار۔ میں بس فضول جنگ سے بچنے کی تگ و دو میں ہوں۔ سردار زادی کے حصول کے بعد میری کوئی خواہش اور تمنا ادھوری نہیں رہ گئی۔ اب بقیہ زندگی امن و سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ اور اس وقت سرزمین ایران ہی میری امیدوں پر پورا اتر سکتی ہے۔''

''خوش رہو جوان۔'' وارفتگی سے بغل گیر ہوتے ہوئے اس نے یشکر کے دونوں گالوں پر بوسا دیا اور بادیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ یشکر نے پہلے بادیہ کو عنبر پر سوار کرایا اور پھر خود اس کے سفید گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ شادی سے پہلے اس کا ارادہ بادیہ کو بنو اسد پہنچانے کا تھا اس لیے اس کا رخ شمال مغرب کی جانب تھا۔ مگر اب ایران جانے کے لیے اسے جانے کی سمت تبدیل کرنا پڑ رہی تھی۔ اگر وہ مشرق کا رخ کرتا تو اسے بنو جمرہ کے قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا اور وہ ان کا کافی نقصان کر چکا تھا۔ اس نے مشرق کے بجائے شمال مشرق کا رخ کیا۔ بنو کاظمہ یا بکر بن وائل کے قبائل میں جا کر وہ خلیج العربی کو بحری جہاز کے ذریعے عبور کر کے ایران کا رخ کر سکتا تھا۔

سفر کا آغاز انھوں نے سورج نکلنے سے پہلے کیا تھا۔ دوپہر تک وہ بنوقطام کو کافی پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ صحرائے عرب میں سفر کرنے والے وادیوں سے شاہراؤں کا کام لیتے تھے۔ اور یہ وادیاں ہاتھ کی لکیروں کی طرح صحرائے اعظم میں بکھری ہوئی ہیں۔ پانی کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے ان وادیوں میں سفر کرنا بہت زیادہ مفید تھا۔ کیوں کہ وادیوں کی تہوں میں محفوظ پانی قافلوں کے کام آتا۔ اور وادیوں میں اُگنے والا سبزہ مسافروں کے مویشیوں کی خوراک کی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ یشکر پہلے جس وادی میں محوِ سفر تھا اسے بنو جمرہ کی وجہ سے ترک کرنا پڑ گیا تھا۔ بنوقطام سے نکلتے وقت اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی کسی وادی میں جا نکلے گا۔ لیکن بدقسمتی سے اسے ناکامی ہوئی تھی۔

دھوپ کی شدت میں تیزی آتے ہی انھوں نے چند جھاڑیوں کے نیچے پناہ ڈھونڈی۔ جونھی سورج کے زوال کا سفر شروع ہوا وہ آگے بڑھ گئے۔ سہ پہر کے وقت اسے مشرق کی جانب سے کالی گھٹا اٹھتی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر تشویش ظاہر ہوئی۔ بادیہ نے بھی وہ آفت دیکھ لی تھی۔ اس نے فوراً یشکر کو آواز دی۔

''دیکھ لیا ہے۔'' لہجے میں اطمینان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے دائیں بائیں پناہ کی تلاش میں نظریں دوڑانا شروع کر دی تھیں۔ لیکن ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔

بادیہ سراسیمہ آواز میں بولی۔ ''کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی۔''

''یشکر تمھارے ساتھ ہے سردارزادی۔''اس نے با اعتماد اور جرات آمیز لہجے میں کہا۔لیکن اس حوصلے کے پس پردہ چھپے اندیشے بادیہ کی نظر سے اوجھل نہیں تھے۔وہ اس قدرتی آفت کی تباہ کاری سے اچھی طرح واقف تھی۔اور یہ بھی جانتی تھی کہ ایسی آفات کا مقابلہ کرنا ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

جب تک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے شروع نہیں ہو گئے تھے وہ گھوڑے دوڑاتے رہے۔اس دوران یشکر کی آنکھیں کسی مناسب پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔مگر چاروں طرف پھیلی ریت میں وہ کوئی جائے پناہ تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

امریل نے پُر جوش لہجے میں پوچھا۔''مالکن،غلام تیر چلانے کی اجازت چاہتا ہے۔''ایک ٹیکری پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے وہ نشیب میں ہرن کے جوڑے کو دیکھ رہے تھے۔وہاں وہ دن چڑھے پہنچے تھے۔سہ پہر کے وقت قُتیلہ، امریل کو ساتھ لے کر شکار کی تلاش میں نکلی تھی کہ وہ رات سے بھوکے تھے۔ملکان اور طبقہ کو انھوں نے گھوڑوں کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا تھا۔ان کی خوش قسمتی تھی کہ دو تین فرلانگ کے بعد ہی انھیں شکار نظر آ گیا تھا۔وہ پتھریلی زمین تھی اور گزشتہ ہفتے ہونے والی بارش کا پانی اب تک ایک گڑھے میں موجود تھا۔وہ جانور وہیں سے پیاس بجھا رہے تھے۔

قُتیلہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔''دونوں کا شکار کر لو گے؟''

امریل کے کو اس کے سوال پر حیرت ہوئی تھی۔''ایک وقت میں ایک ہی کا شکار ممکن ہے مالکن۔''

قُتیلہ اطمینان سے بولی۔''ایسا بس تم سمجھتے ہو۔''یہ کہتے ہوئے اس نے چلّے میں تیر جوڑ کر نز پر نشانہ سادھا اور پھر تیر کو ستر اسی درجے کا زاویہ دے کر تیر چھوڑ دیا،اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے دوسرا تیر کمان میں ڈال کر مادہ پر نشانہ سادھتے ہوئے سیدھا چھوڑ دیا تھا۔

تیروں نے ایک ساتھ ہدف کو ڈھونڈا تھا۔دونوں ہرن ناگہانی پڑنے والی آفت سے زور سے اچھلے اور پھر نیچے گر کر تڑپنے لگے تھے۔

قُتیلہ کمان پیٹھ پیچھے لٹکا کر نشیب کی طرف بھاگ پڑی تھی جبکہ امریل ہکا بکا اس وحشی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو فنون سپہ گری میں کمال کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔جس انداز میں اس نے ایک ساتھ دونوں ہرنوں کو شکار کیا تھا ایسا امریل خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

قتیلہ تڑپتے ہوئے ہرنوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔وہ حیرانی پر قابو پا کر اس کے پیچھے بھاگا۔اس کے قریب پہنچنے تک وہ دونوں جانوروں کے گلے پر خنجر پھیر چکی تھی۔

Pakistanipoint.com

''مالکن، مجھے بھی ایسی تیز اندازی سیکھنا ہے۔'' قُتیلہ کے پاس جاتے ہی دل میں چھپی خواہش سوال بن کر اس کے ہونٹوں پر مچلی۔

''منع کس نے کیا ہے۔'' قُتیلہ کے چہرے پر وہی بے پروائی تھی جو اس کا خاصا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ سکھائیں گی؟''

''ضرور۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ ہرنی کو اٹھانے کے لیے جھکی۔

''یہ کام غلام کے لیے چھوڑ دیں مالکن۔'' امریل نے اس کے ہاتھ سے ذبح ہوئی ہرنی لینا چاہی۔

قُتیلہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم وہ ہرن اٹھاؤ۔''

وہ لجاجت سے بولا۔ ''غلام دونوں کو ایک ساتھ اٹھا سکتا ہے۔''

''اگر تم ہرن اٹھا کر ملکہ قُتیلہ سے پہلے گھوڑوں تک پہنچ گئے تو آئندہ تمھاری ایسی پیشکش ملکہ قُتیلہ مان لیا کرے گی۔''

جب سے اس کا ٹکراؤ قُتیلہ کے ساتھ ہوا تھا وہ ہر وقت اسی کوشش میں ہوتا تھا کہ کسی طرح قُتیلہ کو متاثر کر لے۔ مگر وہ ہر بار اس پر نئی چھاپ چھوڑ جاتی تھی۔ اس وقت قتیلہ کی للکار نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ ایک جھٹکے سے ہرن کا لاشہ اٹھا کر وہ دوڑ پڑا۔ قُتیلہ پہلے سے تیار تھی۔ دونوں تیز رفتاری سے ٹیکری کی بلندی سر کر رہے تھے۔ بیس پچیس قدم اٹھاتے ہی امریل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ایک اور خوش فہمی دور ہونے والی تھی۔ مکمل زور لگا کر بھی وہ قُتیلہ سے دو قدم پیچھے ہی تھا۔ ٹیکری کی بلندی تک پہنچنے تک وہ ایک قدم مزید آگے بڑھ گئی تھی۔ اور پھر دوسری جانب نشیب میں کھڑے گھوڑوں تک پہنچنے تک وہ فاصلہ برقرار رہا تھا۔ دونوں کا سانس پھول گیا تھا۔ پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح قُتیلہ کے چہرے کی شفاف جلد پر پھسل رہے تھے۔

''تم ہار گئے امریل۔'' ہرنی کو اپنے گھوڑے کی زین پر رکھتے ہوئے وہ اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گئی تھی۔

''جی مالکن۔'' اس کی تقلید میں وہ گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے بولا۔ ''کوشش تو کی تھی جیتنے کی لیکن ملکہ قُتیلہ کو کسی جسمانی کھیل میں ہرانا شاید ممکن نہیں ہے۔''

''بہر حال اچھی کوشش تھی۔'' خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی تھی۔ آگے پیچھے گھوڑے دوڑاتے وہ ملکان اور طبقہ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کے قریب پہنچنے پر ہی دونوں کو ہوش آیا تھا۔ ملکان کھسیاتے ہوئے طبقہ سے دور ہوا۔ تبھی قُتیلہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''ملکان، ملکہ قُتیلہ نے ابھی تک تم دونوں کو رشتہ ازدواج میں نہیں باندھا۔''

''معذرت خواہ ہوں ملکہ!.....ہمیں اندازہ نہیں تھا آپ اتنی جلدی لوٹ آئیں گے۔'' ملکان نے ندامت کے اظہار میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''یہ ملکہ قُتیلہ کے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' قُتیلہ کی دنبالہ آنکھوں میں کوئی ایسی بات پوشیدہ تھی کہ ملکان کانپ گیا تھا۔

''مجھے اپنے قصور کا اعتراف ہے ملکہ۔''

''قبیلے تک تم طبقہ سے بات نہیں کرو گے۔ ورنہ ملکہ قُتیلہ، طبقہ کو جہاں سے اٹھا کر لائی ہے وہیں پہنچا دے گی۔ یا تم دونوں کو ایسی جگہ پہنچا دے گی جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔''

ملکان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''جی ملکہ۔''

''لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلاؤ۔'' موضوع تبدیل کرتے ہوئے وہ گھوڑے سے اتری اور ہرن اٹھا کر بیری کے درخت کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ہرن کو الٹا لٹکا کر اس کی کھال اتار رہی تھی۔ اس کے تیزی و مہارت سے چلتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر امریل کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کام میں بھی وہ قُتیلہ کا مقابلہ نہ کر پائے گا۔ کبھی کبھی اسے لگتا قدرت نے قُتیلہ کو لڑکی بنا کر زیادتی کی تھی۔ ورنہ اس کے نسوانی جسم میں کسی کہن سالہ جنگجو کی روح مقید تھی۔ وہ دوسرے ہرن کو لٹکا کر کھال اتارنے لگا۔ ان کے گوشت صاف کرنے تک ملکان لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ لگا چکا تھا۔

طبقہ نے اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی لیکن اس نے آنکھ سے اسے دور ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ قُتیلہ کو خفا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ طبقہ نے بھی قُتیلہ کی باتیں سن لی تھیں۔ اور ملکان جیسے اکھڑ کا مودّبانہ لہجہ اسے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ وہ پُرکشش دوشیزہ صرف نام کی ملکہ نہیں تھی۔

امریل نے سب سے پہلے ہرن کی کلیجی بھون کر قُتیلہ کو پیش کی تھی۔ تمام نے سیر ہو کر بھنا ہوا گوشت کھایا بقیہ گوشت انھوں نے چمڑے کے تھیلے میں محفوظ کر لیا تھا۔

''طلوعِ ماہ کے ساتھ سفر جاری کریں گے۔'' قُتیلہ نے حکم جاری کیا۔

''میں جاگ رہا ہوں، تم آرام کرو۔'' امریل، ملکان کو مخاطب ہوا۔

سر ہلاتے ہوئے ملکان، قُتیلہ کے بائیں ہاتھ، سر کے نیچے گھوڑے کی زین رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ کیوں قطبہ دائیں جانب ریت پر مرط (عورتوں کے استعمال کی چادر) بچھا کر لیٹی ہوئی تھی۔

چاند کے نکلتے ہی وہ آگے روانہ ہو گئے تھے۔ ملکان اپنا گھوڑا قُتیلہ کے متوازی ہی دوڑاتا رہا۔

فرسخ بھر فاصلہ طے کرنے کے بعد ملکان نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''ملکہ اب تک خفا ہے۔''

قُتیلہ کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''جاؤ اس کے ساتھ گپ شپ کرو، پریشان ہو رہی

ہوگی۔''

''شکریہ ملکہ۔'' ملکان نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے گھوڑے کی رفتار کم کی اگلے ہی لمحے وہ قطبہ کے پہلو میں گھوڑا دوڑا رہا تھا۔

''مل گئی اجازت۔'' قطبہ نے خفگی بھرے انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' ملکان نے بغیر ندامت ظاہر کیے سر ہلایا۔ ''اور یاد رکھنا ملکان کی جان، وہ ہماری سردار ہے اور اسی کی وجہ سے مجھے تمھارے حصول میں کامیابی ہوئی ہے۔''

''میں نے اس کا گلہ تو نہیں کیا۔'' طبقہ نے صفائی پیش کی۔

ملکان جلدی سے بولا۔ ''ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ اس کی صورت دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہونے والوں کو پچھتانے کا موقع نہیں ملتا۔''

طبقہ نے دبے لہجے میں پوچھا۔ ''اس چھوکری میں سوائے خوب صورتی اور نخرے کے کوئی خوبی نظر تو نہیں آتی۔''

ملکان دعوا کرتا ہوا بولا۔ ''ہبل کی قسم، اگر دس بہترین شہسوار بھی اس کے خلاف میدان میں اتریں تو شکست کھانے کے علاوہ کچھ نہیں کر پائیں گے۔''

''پہلے تم جھوٹ نہیں بولتے تھے۔'' طبقہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''اب بھی نہیں بولتا۔''

''میں نہیں مانتی۔'' طبقہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''کسی دوسرے کی زبانی سن کر میں بھی یقین نہ کرتا۔''

''تو کیا اسے لڑتے ہوئے دیکھ چکے ہو۔'' طبقہ نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اس کے خلاف تلوار سونتنے کی غلطی کی تھی۔ یقین کرو اگر اسے میری ضرورت نہ ہوتی تو تمھیں اپنے تیسرے شوہر کے بچے پال کر ہی عمر گزارنا پڑتی۔''

''تمھیں، مجھ سے خوب صورت لگتی ہے۔'' طبقہ کے نزدیک شمشیر زنی سے زیادہ قُتیلہ کی خوب صورتی خطرناک تھی۔

ملکان جھٹ بولا۔ ''بنو عذرہ کی شہزادی کی طرح پُرکشش لڑکی نہ تو آج تک کسی ماں نے جنی ہے اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔''

طبقہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔

دن چڑھے تک وہ درمیانی رفتار سے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ حطام کو اب قُتیلہ نے کھلا چھوڑ دیا

تھا۔اور اسی کی وجہ سے اس نے گھوڑوں کی رفتار میں اضافہ نہیں کیا تھا۔ دھوپ میں جیسے ہی شدت آئی انھوں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ گو اس جگہ سے بنوطرید کا فاصلہ ڈیڑھ دو فرسخ سے زیادہ نہیں تھا اس کے باوجود قُتیلہ نے آرام کرنا زیادہ پسند کیا تھا۔

''مالکن۔'' دوپہر ڈھلنے والی تھی جب امریل نے گھبرائے ہوئے انداز میں قُتیلہ کو آواز دی۔

''کیا ہے امریل؟'' قُتیلہ نے آنکھیں کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

امریل پریشانی بھرے لہجے میں بولا۔''مالکن!.....آپ کو اٹھ کر جائزہ لینا چاہیے۔''

قُتیلہ نے اٹھنے میں ایک پل بھی نہیں لگایا تھا۔اٹھتے ہی اس نے امریل کی انگلی کے اشارے کے تعاقب میں نگاہیں دوڑائیں۔

دور افق پر کالی گھٹا چھائی دکھائی دے رہی تھی۔ بلاشک وشبہ وہ ریت کا بھیانک طوفان تھا۔

''چلو، وقت کم ہے۔'' قُتیلہ جیسی نڈر کے لہجے میں بھی اندیشے جھلک رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد وہ چاروں فالتو گھوڑوں کو ہمراہ لیے تیز رفتاری سے بنوطرید کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ طوفان کا رخ شمال سے جنوب کی طرف تھا اور بنوطرید بھی اسی سمت کو واقع تھا۔

☆☆☆

''تو آپ ناکام رہے؟'' سبرینہ کے چہرے پر چھائی اس کی آمد کی خوشی مدہم پڑ گئی تھی۔

''ہاں۔'' بہرام نے افسردگی سے سر ہلایا۔''لیکن لوٹنا میری مجبوری تھی کہ صحرائے اعظم میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا جو دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہو قریباً ناممکن ہے۔اس کے ساتھ مجھے یہ امید بھی ہے کہ یشکر دشمنوں سے جان چھڑانے کے لیے فارس کا رخ کرے گا۔''

''چلو اس کی زندگی کی نوید تو مل گئی ہے نا؟'' سبرینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے روشن پہلو کو اجاگر کیا۔

''اگر اس نے واپس آکر تم سے انتظار نہ کرنے کا شکوہ کیا.....؟'' بہرام کے لہجے میں عجیب سے اندیشے پنہاں تھے۔

سبرینہ کے ہونٹوں پر مدھر تبسم نمودار ہوا۔بہرام کو وارفتگی سے دیکھے ہوئے وہ چاہت بھرے لہجے میں بولی۔''وہ میرا محسن ہے، مجھے اس سے ہمدردی سہی، مگر دل کیا کروں جو صرف ایک ہی نام پر دھڑکتا ہے۔''

بہرام کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔وہ سبرینہ کے رخِ روشن پر مہر محبت ثبت کرتا ہوا بولا۔''مجھے معزز سکندر کے پاس حاضر ہونا ہے وہ بے چینی سے منتظر ہوں گے۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''پہلے انھی کے پاس جانا تھا۔''

''تو تمھیں معلوم نہیں ہے کہ میں پہلے یہاں کیوں آیا ہوں۔'' بہرام کے لہجے میں شکوہ در آیا تھا۔

سبرینہ کے نقرئی قہقہے نے بہرام کی سماعتوں میں رس گھولا۔ ''جلدی لوٹنا، آپ کی خانم پر ایک ایک لمحہ سال بن کر گزرے گا۔''

اور بہرام مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سکندر کے سامنے بیٹھا سفر کی تفصیلات دہرا رہا تھا۔

سکندر نے پوچھا۔ ''تمھیں یہ کیوں کر لگا کہ یشکر فارس کا رخ کرے گا۔''

بہرام اعتماد سے بولا۔ ''جن حالات میں وہ اپنے قبیلے سے بھاگا، اس کے پاس کوئی دوسرا راستا ہی نہیں بچتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن واپسی کی جلدی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ایسی صورت میں جب ایک بڑا قبیلہ اس کی جان کے درپے تھا تمھیں بنو کاظمہ میں رک کر اس کی راہ دیکھنا چاہیے تھی۔'' سکندر کو اس کی واپسی کا فیصلہ درست نہیں لگا تھا۔

''میری آمد کا مقصد ایک تو حضور والا کو حالات سے آگاہ کرنا تھا، دوسرا محدود سپاہ کے ساتھ میں بنو کاظمہ سے دبا تک پھیلے خلیج الفارس کے مکمل ساحل کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر مجھے یہ بھی امید تھی کہ یشکر لوٹ آیا ہوگا۔'' بہرام نے صفائی پیش کی۔

''ہونہہ!.....'' لمحہ بھر سوچنے کے بعد سکندر نے پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

بہرام جلدی سے بولا۔ ''جو حضور والا کا حکم ہو۔''

''شہنشاہ معظم کی مہمات بھی اختتام پذیر ہوتی نظر نہیں آتیں ورنہ میں تمھارے ساتھ ہی چلتا۔ بہ ہر حال چند دن دیکھ لیتے ہیں اگر یشکر نہ آیا تو تمھیں دوبارہ رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔''

بہرام مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''جو حضور کی منشا ہو۔''

اور سکندر نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

☆☆☆

ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ تیز ہو رہے تھے اور ریت کا طوفان قریب آتا جا رہا تھا۔ ایک ٹیلا سر کرتے ہی یشکر کو نشیب میں غصاء کی چند جھاڑیاں نظر آئیں جنھیں دیکھ کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور رفتار بڑھاتے ہوئے گھوڑوں کا رخ ادھر موڑ دیا۔ ہوا کی رفتار میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا۔ ریت ان کے چہروں اور جسم کے کھلے حصوں پر سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ یشکر کے لیے وہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں

حکایت کے سالانہ خریدار بنیں

گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے پرچہ حاصل کریں اور

860 روپے کی سالانہ بچت پائیں۔

12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ
1380 روپے	480 روپے	1860 روپے

سالانہ چندہ	بچت سالانہ
1000 روپے	860 روپے

''حکایت'' چار دیواری کی دنیا کی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں، ناقابل فراموش واقعات، دین و دنیا، طنز و مزاح کی بدولت شائستہ حلقوں کا فیملی میگزین ہے جسے گھر کا ہر فرد پڑھ سکتا ہے۔ تحریک پاکستان، 1947ء کی ہجرت، کشمیر اور جہاد آزادی کی کہانیاں، معلوماتی سائنسی، طب و صحت اور تحقیقی مضامین کے علاوہ غیر جانبدارانہ سیاسی تجزیے، خصوصی فیچر پیش کئے جاتے ہیں۔

سالانہ خریدار بننے کے لئے

- پرچہ بذریعہ وی پی منگوائیں۔
- 1000 روپے کا منی آرڈر کریں۔
- 1000 روپے حکایت پبلشرز کے اکاؤنٹ نمبر BOP-873-3 میں جمع کرائیں۔
- سالانہ چندہ ایزی پیسہ، موبی کیش وغیرہ سے بھی بھجوا سکتے ہیں۔
- اپنا ایڈریس اور فون نمبر واضح الفاظ میں لکھیں۔

ماہنامہ حکایت 26- پٹیالہ گراؤنڈ لاہور 0323-4329344

Pakistanipoint.com

تھا، اگر اکیلا ہوتا تو قطعاً پروا نہ کرتا مگر اب اسے بادیہ کی فکر تھی۔ وہ نرم و نازک لڑکی ایسے مصائب کہاں برداشت کر سکتی تھی۔

جھاڑیوں کے قریب گھوڑے روکتے ہی وہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور اور فوراً ہی بادیہ کی طرف بڑھا اگلے لمحے بازوؤں میں بھر کر اسے نیچے اتارا اور خمار (اوڑھنی) کو مضبوطی سے اس کے چہرے کے گرد لپیٹنے لگا۔ بادیہ اطمینان بھرے انداز میں اسے گھور رہی تھی۔ یشکر کی موجودی میں اسے آسمانی آفت سے بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

بادیہ سے بے فکر ہو کر اس نے دونوں گھوڑوں کی لگامیں پکڑیں اور جھنڈ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود اکیلی جھاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں گھوڑوں کو جھاڑی کے نظر نہ آنے والے تنے سے باندھ کر اس نے اپنے گھوڑے کی زین سے باندھا کمبل کھولا اور بادیہ کو لے کر ہوا کے مخالف رخ جھاڑیوں کی جڑ میں دبک گیا۔ کمبل کو اس نے اپنے اور بادیہ کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا تھا۔ بادیہ کا سر گود میں رکھ کر وہ اس پر جھک کر بیٹھ گیا۔ ہوا دم بہ دم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا میں اڑتی ریت نے سورج کو ڈھانپ کر رات کا سماں کر دیا تھا۔

بادیہ دونوں بانہیں اس کی کمر سے لپیٹ کر سکون بھرے انداز میں لیٹی تھی۔ غھاء کی جھاڑیوں نے اچھی خاصی آڑ مہیا کر رکھی تھی اس کے باوجود ریت تواتر سے یشکر کی پیٹھ سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کی حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ بادیہ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

طوفان جاری رہا تیز ہوا سیروں کے حساب سے ان کے جسم پر ریت پھینک رہی تھی۔ ہوا کی ''شاں..... شاں'' کے ساتھ گھوڑوں کی بے چینی بھری ہنہناہٹ بھی یشکر کو سنائی دے رہی تھی۔ یہ کھیل کافی دیر جاری رہا۔ ریت کے طوفان نے ان کے اعصاب شل کر دیے تھے، ایک ہی ہیئت میں بیٹھے بیٹھے یشکر کا بدن اکڑنے لگا تھا۔ بادیہ کی حالت البتہ کافی بہتر تھی کہ اس کے بالائی بدن کو یشکر نے ہر طرف سے پناہ میں لیا ہوا تھا۔

اور پھر وہ اعصاب شکن، تند و تیز ہوا آہستہ آہستہ تھمنے لگی یہاں تک کہ اس نے زحمت سے رحمت کا روپ دھار لیا۔ ہوا میں موجود ریت کے ذرات بھی زمین پر بیٹھ گئے تھے۔

یشکر نے بدن سے لپٹے کمبل کو اتارا، اس پر سیروں کے حساب سے ریت پڑی تھی۔ کمبل سے سر نکالتے ہی اسے ہر جانب اندھیرے کا راج نظر آیا۔

''بیٹھے رہو ناں مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اسے اٹھنے پر آمادہ دیکھ کر بادیہ مزاحیہ انداز میں بولی تھی۔

یشکر نے اس کے رخ پر لپٹی خمار (اوڑھنی) کھولتے ہوئے چاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب

آرام ہی کرنا ہے میری سردار زادی۔''

وہ کھل کھلاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔''اب تو آپ کی شریکِ حیات ہوں پھر ہر وقت سردار زادی کہنے کا مطلب؟''

''کیوں کہ تم ہو ہی سردار زادی۔''وہ اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے کمبل جھاڑنے لگا۔بادیہ کو پیاس لگ رہی تھی وہ مسکراتے ہوئے گھوڑوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

طوفان کے قریب پہنچنے سے پہلے وہ بنوطرید پہنچ گئے تھے۔ان کی آمد سے پہلے ہی بنوطرید کے باسی چوبیں نکال کر خیموں کو زمین بوس کر چکے تھے۔انھوں نے اونٹوں کو دائرے میں بیٹھا کر تمام کے گھٹنے باندھ دیے تھے تاکہ وہ گھبرا کر بھاگ نہ جائیں اور اونٹوں کے اس گھیرے میں بھیڑ بکریوں کو بند کر دیا۔گھوڑوں کو انھوں نے غضا اور اُثل [1] کی جھاڑیوں سے باندھ دیا تھا۔

قُتیلہ اور اس کے ساتھی جب بنوطرید میں داخل ہوئے تو ہوا کے جھکڑ شروع ہو چکے تھے۔انھوں نے فی الفور اپنے گھوڑے جھاڑیوں سے باندھے اور اُثل کی جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک گئے۔یوں بھی بنوقیشرہ والوں نے اس جگہ رہائش اختیار کرتے وقت ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں ریت کا طوفان کم سے کم اثر انداز ہو سکتا تھا۔اور بنوقیشرہ کا محلِ وقوع ہی قُتیلہ کو اتنا پسند آیا تھا کہ اس نے اپنے قبیلے کو اسی جگہ رکھنا پسند کیا تھا۔

بھیانک آندھی کافی دیر جاری رہی تھی۔رات گئے جب ہوا کی رفتار میں کمی آئی تو وہ آڑ سے باہر نکل آئے۔قُتیلہ کے حکم پر سب سے پہلے وہ مشعلیں جلا کر خیمے لگانے لگے۔اس دوران قُتیلہ نے قریب بن فلیح اور عامر بن اسود کو پاس بلایا اور قبیلے کی خیر خبر پوچھنے لگی۔

عامر بن اسود نے جواب دینے میں پہل کی تھی۔''ملکہ،گزشتہ کل بنوضیع کے چار باسی یہاں سے گزر رہے تھے وہ اپنے آدمیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ہم نے ان کے آدمیوں کے بارے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔''

---

[1] عرب اُثل کی جھاڑیوں کو بستیوں اور کھیتوں کے گرد قطار میں لگا کر آڑ بنا دیتے تھے۔اور یہ جھاڑیاں ریتلی آندھی کو روکتی تھیں اسی طرح غضاء بھی قبیلوں کی حدود میں اگائی جاتی کیوں کہ اس کی لکڑی بہت سخت ہوتی ہے اور غضاء کی لکڑی سے حاصل ہونے والا کوئلہ بہت دیر تک جلتا رہتا ہے۔چنانچہ عربی ادب میں جمر الغضا (غضا کے انگارے) کی ترکیب اکثر ملتی ہے۔سید الغضا یا ذئب الغضا کی ترکیب بھی مستعمل ہے کیونکہ غضاء کے جھنڈ میں رہنے والا بھیڑیا چالاک سمجھا جاتا ہے۔

(''از عربی ادب قبل الاسلام'')

Pakistanipoint.com

قُتیلہ نے پوچھا۔ ''کیا وہ قبیلے کے اندر داخل ہوئے تھے؟''

''جی۔'' دونوں نے ایک ساتھ سر ہلا دیا تھا۔

بلیلہ نامی لڑکی اس کے لیے ضیاح 1 کا کٹورہ بھر لائی تھی۔ قُتیلہ نے ایک گھونٹ بھر کر کٹورہ واپس کرتے ہوئے کہا۔

''ملکہ قُتیلہ کو نخیسہ 2 پسند ہے۔''

''ابھی لائی۔'' بلیلہ نے خوش دلی سے کٹورہ تھاما اور واپس مڑ گئی۔

قُتیلہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اگر وہ قبیلے کے اندر داخل ہوئے تھے تو یقیناً انھوں نے خیموں کو بھی دیکھا ہوگا اور ناممکن ہے کہ وہ اپنے خیموں کو نہ پہچان پائے ہوں۔''

قریب بن فلیح گھبرا کر بولا۔ ''اس بارے تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''سوچنے کے لیے ملکہ قُتیلہ ہے نا؟'' قُتیلہ کے لہجے میں طنز شامل نہیں تھا لیکن اس کے باوجود دونوں نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

''جانتے ہو، اگر ملکہ قُتیلہ کو ایک دن کی بھی دیر ہوئی ہوتی تو واپسی پر بنو طرید کا انجام بنو قیشرہ والا ہو چکا ہوتا۔''

''ہمیں اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ہے ملکہ اور .....'' قریب نے معذرت کا اظہار کرنا چاہا، مگر قُتیلہ نے اسے فقرہ پورا نہیں کرنے دیا تھا۔

''ملکان بن نول اور اصرم بن خسار کو بلاؤ۔''

قریب سر ہلاتا ہوا خیمے گاڑتے ہوئے لوگوں کی طرف بڑھ گیا۔ بلیلہ نخیسہ کا کٹورا بھر لائی تھی۔ قُتیلہ نے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کٹورہ تھام لیا۔ جب تک وہ دودھ پیتی ملکان بن نول اور اصرم بن خسار وہاں پہنچ گئے تھے۔

خالی کٹورا بلیلہ کے حوالے کرتے ہوئے وہ اصرم کو مخاطب ہوئی۔ ''اصرم، یہاں سے بنو ضبع کتنی دور ہے؟''

اصرم بولا۔ ''کبھی جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ جس وقت ہم قیدی تھے ان کی گفتگو سے میں نے جو اندازہ لگایا تھا اس کے مطابق قریباً ڈیڑھ منزل ہوگا۔''

''سواروں کے لیے یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے اگر آج طوفان نہ آیا ہوتا تو بنو ضبع والے تمھارا

---

1 پانی ملا پتلا دودھ۔

2 نخیسہ، بھیڑ کے ایسے دودھ کو کہتے ہیں جس میں بکری کا دودھ ملایا گیا ہو۔

گھیراؤ کر چکے ہوتے۔''

اصرم بن خسار حیرانی سے بولا۔''مگر ان کے آدمیوں کو تو ہم نے مطمئن کر دیا تھا۔''

قُتیلہ تیقن سے بولی۔''اپنے خیموں کو پہچانتے ہی انھیں اصل بات واضح ہو گئی ہو گی۔خیموں کے علاوہ ان کے آدمیوں سے چھینے ہوئے گھوڑے بھی یہاں موجود تھے۔البتہ تمھیں جھانسہ دینے کے لیے انھوں نے اطمینان کا اظہار کرنا ہی تھا۔''

اصرم بن خسار ندامت سے بولا۔''ہمارے دماغ میں ان کے خیموں اور گھوڑوں کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔''

قُتیلہ صاف گوئی سے بولی۔''آتا بھی کیسے کہ ساری زندگی تم لوگوں نے بھیڑ بکریاں چرانے میں گزار دی ہے۔''

ملکان بن نول نے زبان کھولی۔''اب کرنا کیا ہے؟''

''اب تو ملکہ قُتیلہ پہنچ گئی ہے۔''اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔اسی وقت امریل نے قریب آ کر کہا۔

''مالکن،آپ کا خیمہ لگا دیا ہے۔''

اثبات میں سر ہلا کر وہ خاموش رہی۔مشعل کی روشنی میں اس کے دلکش چہرے پر چھایا تفکر واضح نظر آ رہا تھا۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا۔

''ملکان تمام کو لے کر شمالی ٹیلوں پر پہنچ جاؤ۔آج رات خیموں میں کوئی نہیں سوئے گا۔گو اہل بنو ضبع کے آنے کا امکان تو نہیں ہے مگر ملکہ قُتیلہ کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہتی۔''

''جو حکم ملکہ۔''ملکان واپس مڑ گیا۔

وہ رات قبیلے والوں نے ٹیلوں پر بسر کی تھی۔قُتیلہ بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔اگلے دن طلوع شمس کے ساتھ ہی قُتیلہ نے تمام کو طلب کر لیا تھا۔عورتوں کو غداء (صبح کا کھانا) کی تیاری کا کہہ کر وہ مردوں کے ساتھ مل کر بنو ضبع والوں سے نبٹنے کا لائحہ عمل تیار کرنے لگی۔غداء تیار ہونے تک وہ منصوبہ تیار کر چکے تھے۔کھانے سے فارغ ہو کر قُتیلہ،خواتین کے ساتھ تین مردوں کو چھوڑ کر باقی پندرہ مردوں کے ہمراہ بنو ضبع سے آنے والے رستے کی جانب چل پڑی۔گھات کے لیے انھوں نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ ان کے قبیلے سے فرسخ بھر دور تھی۔وہاں وادی قدرتی طور پر تنگ ہو جاتی تھی اور دائیں بائیں موجود ٹیلوں کی وجہ سے درہ نما رستا بن گیا تھا۔جگہ کا انتخاب قُتیلہ نے کیا تھا۔وہاں پہنچتے تک دھوپ میں خاصی تیزی آ گئی تھی۔قُتیلہ کے حکم پر دوپہر کا وقت انھوں نے وادی کے کنارے موجود درختوں کے سائے میں گزارا جو نہی

دھوپ کی شدت میں کمی آئی تمام نے درّہ نما مقام پر مورچے سنبھال لیے تھے۔

ملکان نے ریت کی حدت کو برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''ہوسکتا ہے وہ آج بھی نہ آئیں۔''

قتیلہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔''اگر آج نہ آئے تو کبھی بھی نہیں آئیں گے۔''

ملکان نے اطمینان سے لیٹی قتیلہ کی آنکھوں میں جھانکا۔اس کی آنکھوں میں قتیلہ کے لیے ستائش بھری تھی۔بہ ظاہر نرم و نازک نظر آنے والی لڑکی کتنی سخت جان تھی اس بارے ملکان کو پہلے ہی اتنے تجربات ہو چکے تھے کہ اس کا گرم ریت پر سکون سے لیٹنا اسے ششدر نہیں کر رہا تھا۔ورنہ حقیقت تو یہی تھی کہ اگر وہ زرق برق لباس میں ملبوس عالیشان محل میں تخت پر بیٹھی ہوتی تو دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ بہار کی دھوپ بھی اس دوشیزہ کی رنگت کو میلا کر دے گی۔اور اُس حالت میں کوئی اس کے ہاتھوں میں دودھاری تلوار دیکھ لیتا تو بلا شک و شبہ یہی سمجھتا کہ نہ تو وہ ملائم ہاتھ تلوار تھامنے کے لیے بنے ہیں اور نہ نازک بازو اس تلوار کا وزن ہی سہار سکتے ہیں۔اسے گھوڑے پر سوار دیکھ کر سائیس کبھی بھی گھوڑے کی لگام ہاتھ سے نہ چھوڑتا کہ اسے نرم و نازک دوشیزہ کے نیچے گرنے کا خطرہ ہوتا۔

''کن سوچوں میں کھو گئے ہو۔''اسے مسلسل خود کو گھورتے دیکھ کر قتیلہ کے باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔اس کی مسکراہٹ یقیناً بہت زیادہ خوب صورت تھی،لیکن اس کی فطرت سے واقف ملکان کو اسے ہنستا دیکھ کر یوں لگتا جیسے کوئی شیرنی دانت نکو سے اپنے شکار کو گھور رہی ہو۔

''اس یقین کی وجہ؟''ملکان نے اس کے سوال کے بجائے اول الذکر اندازے کی بابت استفسار کیا۔

''کیوں کہ ملکہ قتیلہ خود قزاق ہے اور اچھی طرح جانتی ہے کہ قزاق کیا سوچتے ہیں،ان کا مزاج کیسا ہوتا ہے اور وہ کیسے کام کرتے ہیں؟''

ملکان نے ایک اور سوال اٹھایا۔''ہوسکتا ہے وہ اندھیرا چھانے کے بعد پہنچیں؟''

''ایسا ہونا،ممکن ہے۔اور اگر وہ غروب آفتاب سے پہلے نہ پہنچے تو ملکہ قتیلہ کا منصوبہ تبدیل ہو جائے گا۔پھر انھیں بنوطرید میں گھیریں گے۔''

ملکان تحسین آمیز لہجے میں بولا۔''آپ کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے۔''

وہ اعتماد سے بولی۔''کیوں کہ ملکہ قتیلہ کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرتی۔''

ملکان بن نول نے وادی میں دور تک نگاہیں دوڑائیں۔آدھے کوس کے بعد وادی میں ایک بڑا موڑ آرہا تھا۔وہاں سے وادی شمال سے مغرب کی جانب مڑ گئی تھی۔اور اس سے آگے کا علاقہ نظر سے

اوجھل تھا۔ چند لمحے اسی طرف متوجہ رہنے کے بعد وہ دوبارہ قُتیلہ کو دیکھنے لگا۔ گرمی کی شدت سے اس کا گندمی چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ گھنے بالوں پر بندھی سیاہ پٹی پسینے سے تر ہو کر گیلی ہو گئی تھی۔ وہ عموماً بالوں کو کھلا ہی رکھتی تھی۔ لیکن کبھی کبھار دو چوٹیاں باندھ لیتی تھی۔ یقیناً اس کے بالوں نے کبھی خمار 1 کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کمر پر وہ نطاق 2 ضرور باندھتی تھی۔ پاؤں میں چمڑے کے بند جوتے ہوتے تھے۔ اس کی درع 3 عموماً کالے، سرخ یا نیلے رنگ کی ہوتی اور زیریں لباس ہمیشہ سراول 4 ہوتا تھا۔ عام عورتوں کی طرح پھولدار کپڑے اس نے کبھی نہیں پہنے تھے۔ وہ سجنے سنورنے کی شوقین نہیں تھی۔ لیکن اس کے کانوں میں عریسہ نے زبردستی طلائی قرط 5 اور گلے میں سبز زمرد کا طوق 6 ڈال دیا تھا۔ کلائیوں میں نقرئی مستان 7 تھے سیاہ آنکھوں میں سرمہ بھی وہ کثرت سے لگایا کرتی تھی۔ بلکہ سرمے کی لکیر کو وہ گوشہ چشم سے کافی آگے تک بڑھا دیتی۔ یوں دنبالہ آنکھیں دیکھنے والوں کو مرعوب کر دیتی تھیں۔ وہ خوب صورت تھی لیکن اس کی کشش کو اس کی بے رحمی نے ایک رعب دے دیا تھا۔ جاننے والے اس سے مرعوب رہتے تھے۔ ڈر ایسی چیز ہے جو حیوانی خواہشات کو قابو کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور اس کے قریب رہنے والے بھی جانتے تھے کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی ناگوار حرکت کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا۔ زبان سے زیادہ وہ شمشیر چلانے کی عادی تھی۔ اور اس کی شمشیر کندھوں اور سر کے درمیان گزرنے میں سستی نہیں دکھاتی تھی۔ رحم کا لفظ اس کی لغت میں درج نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ دماغ کی مان کر چلتی تھی۔ اس کے پتھر دل میں اگر کسی کے لیے ہمدردی یا محبت کا عنصر موجود تھا تو وہ بس عریسہ تھی۔

''پانی لے آؤں؟'' ملکان نے اس کے سراپے سے نظر ہٹا کر عقبی نشیب میں جھاڑیوں سے بندھے گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کبھی کبھی پیاس برداشت کرنا مفید رہتا ہے۔''

اسی وقت تیتر کے بولنے کی آواز ابھری۔ وہ اصرم بن خسار تھا اور مخالف جانب کے ٹیلے پر لیٹا تھا۔ تیتر کی بولی خطرے کا اشارہ تھا۔ قُتیلہ فوراً ہی وادی کے موڑ کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ وہاں سے دو گھڑ سوار نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ دُلکی چال میں گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ملکان کے ہونٹوں سے تحسین آمیز آواز برآمد ہوئی۔ ''بلا شک و شبہ ملکہ قُتیلہ، ملکہ کہلانے کی حق دار

---

1 اوڑھنی۔ 2 کمر بند۔ 3 قمیص۔ 4 پائجامہ یا شلوار۔
5 چھوٹی بالیاں 6 بھاری بھرکم گلے کا ہار جو گردن سے چپک جاتا ہے 7 چاندی کے چوڑے کنگن نما زیور جو دونوں کلائیوں میں ایک ایک پہنا جاتا تھا۔ کنگن اس زمانے میں مرد بھی پہنا کرتے تھے۔

Pakistanipoint.com

ہے۔اور قبیلے کی سرداری صرف ملکہ قُتیلہ کے ساتھ ہی جچتی ہے۔''

قُتیلہ نے اس تعریف پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔دشمنوں کو آتا دیکھ کر وہ انگلی میں جلیدہ [1] پہننے لگی۔

وادی کے دونوں کناروں پر اس نے پانچ پانچ تیر انداز لٹا دیے تھے جبکہ چھ آدمی دشمنوں کو سامنے سے روکنے کے لیے موجود تھے۔سامنے والوں کے ساتھ امریل موجود تھا۔یلغار کی ابتداء قُتیلہ کے تیر چلانے پر ہونا تھی۔جلد ہی وہ اتنے فاصلے پر پہنچ گئے تھے کہ قُتیلہ آسانی سے انھیں گن سکتی تھی۔

''بیس اور پانچ۔'' قتیلہ کے گننے سے پہلے ملکان انھیں شمار چکا تھا۔

قُتیلہ نے آہستہ سے سر ہلایا اور ان کے مزید قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔آخری آدمی کو اپنے سامنے گزرتے دیکھ کر وہ فوراً دوزانو ہوئی اگلے ہی لمحے اس کی کمان تیر اُگل چکی تھی۔اور اتنے نزدیک سے اس کے چلائے ہوئے تیر کا خطا جانا ناممکن تھا۔وہ آدمی گردن کے بل نیچے گرا تھا۔اس کے ساتھ ہی بنوضبع کے سواروں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔وادی کے دونوں پہلوؤں سے بارش کی طرح تیر برسنے لگے تھے۔بنوضبع کے آدمی مردہ چھپکلیوں کی طرح گھوڑوں سے گر رہے تھے۔ایک لمحے کو تو تمام سراسیمہ ہو کر گھوڑوں کی لگامیں کھینچ کر رکے اور پھر انھوں نے گھوڑوں کو تیز بھگا کر اس جگہ سے دور ہونا چاہا، اسی وقت امریل اور اس کے ساتھیوں نے سامنے سے بھی تیروں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔پانچ چھ آدمی اور نیچے گرے، بچ جانے والوں کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔انھوں نے واپس مڑنے کا فیصلہ کیا، اس وقت تک قتیلہ لومڑی کی طرح بھاگتے ہوئے نیچے پہنچ چکی تھی۔ملکان اس کے پیچھے پیچھے تھا۔بنوضبع کے آٹھ نو کے قریب سوار اب تک گھوڑوں کی پیٹھ پر نظر آرہے تھے باقی زخمی یا مردہ حالت میں نیچے گر چکے تھے۔بھاگتے ہوئے بھی قُتیلہ کے ہاتھ تیر چلانے سے نہیں رکے تھے۔دو اور سوار نیچے گرے۔وادی میں اترتے ہی قُتیلہ سوار سے محروم بنوضبع کے ایک گھوڑے پر اچھل کر سوار ہوئی اور تلوار بے نیام کرتے ہوئے سامنے سے آنے والے سواروں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ملکان نیچے کھڑے ہو کر مسلسل تیر برسا رہا تھا اس کی اور ٹیلوں پر موجود افراد کی کوشش سے تین اور سوار نیچے گر گئے تھے۔امریل اپنے چھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے تعاقب میں آرہا تھا۔

قُتیلہ گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے سب سے آگے والے کی طرف بڑھی۔قُتیلہ کو ننگی تلوار کے ساتھ اپنی جانب آتا دیکھ کر مذکورہ سوار نے اپنی تلوار بے نیام کر لی تھی۔دونوں سوار تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔بالکل آخری وقت میں قُتیلہ نے رکابوں سے پاؤں نکالے اور ایک دم گھوڑے کی پیٹھ

---

[1] ہڈی کا چھلا جو تیر انداز انگلی میں پہنتے تھے۔

پر پاؤں کے بل بیٹھ گئی۔ یوں بھاگتے گھوڑے کی پیٹھ پر پاؤں رکھ کر توازن قائم رکھنا قُتیلہ جیسی شہسوار ہی کے لیے ممکن تھا۔ جونہی دونوں گھوڑوں کی گردنیں برابر ہوئیں وہ زور سے اوپر کو اچھلی اگلے ہی لمحے اس کی تلوار مخالف سوار کی گردن کا رابطہ بقیہ بدن سے منقطع کر چکی تھی۔ وہ قلابازی کھا کر دونوں قدموں پر سیدھی کھڑی ہوئی اور رُکے بغیر گھوڑے کی طرف بھاگ پڑی جو سوار کا وزن ہٹتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اس نے پیچھے موڑا۔ اس کے ہاتھوں قتل ہونے والے آخری آدمی کا بغیر سر کا دھڑ پچاس ساٹھ قدم دور جا کر گرا تھا۔ بنوضبع کے دو سوار گھوڑوں کی پیٹھ پر نظر آ رہے تھے۔ دونوں سخت خوفزدہ تھے۔ اور وہاں سے دور جانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ قُتیلہ نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا تھا۔ امریل ایک سوار سے چند قدم عقب میں تھا دوسرے کے پیچھے قُتیلہ ہولی۔ وہ فرلانگ بھر سے زیادہ دور نہیں جا سکے تھے۔ جونہی اس کا گھوڑا بنوضبع کے سوار کے متوازی ہوا اس نے ایک بار پھر وہی حرکت دہرائی۔ دونوں پاؤں رکاب سے نکال کر وہ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی اور اگلے ہی لمحے ہوا میں اچھل کر دوسرے سوار کی چھاتی میں تلوار گھساتے ہوئے اسے ساتھ لیے دوسری جانب جا گری۔ نیچے گرنے سے پہلے وہ قلابازی کھا کر دونوں قدموں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی تلوار دستے تک مخالف کے سینے میں گڑی تھی۔ وہ بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس خوش کن نظارے سے رخ موڑ کر وہ امریل کو دیکھنے لگی۔ وہ بھی اپنے شکار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دونوں کی تلواریں مسلسل ٹکرانے لگیں، خون کا ذائقہ چکھنا امریل کی تلوار کے حصے میں آیا تھا۔ مخالف کا ہاتھ کلائی سے کٹ کر دور جا گرا تھا۔ اگلی باری اس کے سر کی تھی۔ اس کے سر کو علاحدہ ہوتے دیکھ کر قُتیلہ اپنی تلوار کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے شکار کا جسم اب تک ہل رہا تھا۔ تلوار اس کی چھاتی سے کھینچ کر قتیلہ نے اسی کے لباس پر رگڑ کر صاف کی اور گھوڑے پر بیٹھ کر پیچھے کو روانہ ہو گئی۔ سورج تھوڑی دیر کا مہمان تھا۔ اس کی روشنی پیلی پڑ چکی تھی۔

قُتیلہ کے ساتھی بنوضبع کے بچ جانے والے زخمیوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ دو تین زخمی مزاحمت کی کوشش میں اپنے ہلاک ہونے والے ساتھیوں سے جا ملے تھے۔ زندہ بچنے والے زخمیوں کی تعداد پانچ تھی۔

قُتیلہ کے حکم پر ملکان بن نول اپنے دس ساتھیوں کو ہمراہ لے کر مرنے والوں کے گھوڑوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ اسی وقت امریل واپس پہنچ گیا تھا۔ قُتیلہ کے قریب گھوڑے سے اترتے ہوئے اس نے گھٹنا زمین پر ٹیک کر قُتیلہ کا ہاتھ تھاما اور اس کے ہاتھ کو دونوں آنکھوں سے لگاتے ہوئے بوسا دے کر کہا۔

''مالکن، غلام اب تک حیران ہے کہ کوئی شہسوار اس انداز سے بھی اپنے مخالف کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ بلا شک و شبہ یہ مہارت کی انتہا تھی۔''

''ملکہ قُتیلہ کے لیے معمولی بات ہے۔'' بے نیازی سے کہتے ہوئے وہ زخمیوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تو تمھارا تعلق بنوضبع سے ہے اور تم ہمارے قبیلے پر حملہ کرنے آرہے تھے۔''

ایک زخمی ہمت کرتا ہوا بولا۔''اے معزز خاتون بلا شک وشبہ ہمارا تعلق بنوضبع سے ہے، لیکن آپ کو تو ہم جانتے بھی نہیں ہیں۔''

''جاننے والے مجھے ملکہ قُتیلہ کہتے ہیں اور جو نہیں جانتے انھیں بھی ملکہ قُتیلہ کو ملکہ قُتیلہ ہی کہنا چاہیے۔''

زخمی نے فوراً کہا۔''جی ملکہ قُتیلہ، لیکن پہلے ہم ملکہ قُتیلہ کے نام سے واقف نہیں تھے اور قبیلے سے تو اب بھی انجان ہیں۔''

وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔''یہ معلومات نہ تو تمھارے چند سانس بڑھا سکتی ہے اور نہ تمھیں کوئی اور فائدہ پہنچا سکتی ہے۔اس لیے یہ سوال رہنے دو، یہ بتاؤ بنوضبع میں یہی پچیس مرد تھے جو تم منھ اٹھا کر بھاگتے چلے آئے۔''

اس مرتبہ زخمی نے کوئی جواب دیے بغیر ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

قُتیلہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑی۔''وہاں پیچھے ملکہ قُتیلہ کو ایک آدمی کی گردن آدھی کٹی ہوئی نظر آئی تھی۔کس اناڑی کا کام تھا۔''

قیروان بن اخلدا سے قربان ہوتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔''ملکہ اس پر میں نے وار کیا تھا۔'' یہ وہی تھا جس نے قُتیلہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''شرم آنی چاہیے تمھیں۔'' قُتیلہ نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔''تلوار چلانا نہیں آتا۔''

''ابھی سیکھ رہا ہوں ملکہ، سواع نے چاہا تو جلد ہی آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔''

''قریب آؤ۔'' اسے پاس بلا کر وہ اس زخمی کی طرف مڑی جس سے باتیں کر رہی تھی۔قیروان جھجکتے ہوئے قریب ہوا۔

''دیکھو تلوار چلاتے وقت مقابل کی گردن کے پاس کبھی بھی ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرو، تلوار کو جس تیزی سے پیچھے سے لایا جائے اسی شدت سے ہاتھ آگے بڑھتا جائے اور جب تلوار ہدف سے ٹکرانے والی ہو اس وقت کلائی کو ہلکا سا اوپر کی طرف موڑ کر مخصوص انداز میں جھٹکا دیا جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تلوار بے نیام کی اور اس کی دھار زخمی کی گردن سے لگا کر اپنی کلائی کو ذرا سا موڑ کر جھٹکا دینے کا نمونہ دکھایا۔

Pakistanipoint.com

''سمجھ میں آ گیا۔'' اس نے قیروان سے تصدیق چاہی۔

''جی ملکہ۔'' قیروان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زخمی پہلے تو گھبرا گیا تھا لیکن جونھی اسے لگا کہ وہ صرف اپنے ساتھی کو سکھا رہی ہے اس نے سکھ بھرا سانس لیا تھا۔

''اب پورا نمونہ دیکھو۔'' زخمی اطمینان بھرا سانس لے بھی نہیں پایا تھا کہ قُتیلہ کی تلوار بجلی کے کوندے کی طرح اس کی گردن کے پاس پہنچی۔ گردن ہوا میں اڑتی ہوئی کئی قدم دور جا گری تھی۔ بے سر کا لاشہ اذیت بھرے جھٹکے لینے لگا۔

''اب کر لو گے؟'' اس کے انداز سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ زندہ انسان پر تلوار چلا رہی ہے۔ بلا شک وشبہ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا تھا۔

قیروان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ باقی زخمیوں کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی تھی۔

''تم بتاؤ، بنو ضبع میں کتنے مرد بقایا ہوں گے۔'' قُتیلہ دوسرے زخمی کی طرف متوجہ ہوئی۔

اس کی آنکھوں میں غصے کی شدت سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ کینہ توز نظروں سے قُتیلہ کو گھورتا رہا۔ لمحہ بھر جواب کی منتظر رہنے کے بعد وہ قیروان کو مخاطب ہوئی۔ ''چلو نمونہ دکھاؤ تم نے کیا سیکھا ہے۔''

''جی ملکہ۔'' قیروان تھوک نگلتا ہوا دوسرے زخمی کے قریب ہوا، اس کی گردن پر تلوار رکھ کر اس نے اپنا نشانہ سیدھا کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے تلوار گھما کر اس کی گردن پر زوردار وار کیا، مگر اس کی تلوار گردن سے پار نہیں نکل سکی تھی۔ زخمی اوندھے منہ گرتے ہوئے اذیت سے ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔

''بہت خراب قیروان، تمھاری وجہ سے بے چارے کو کتنی تکلیف جھیلنا پڑ رہی ہے۔'' افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ تیسرے زخمی کی طرف مڑی۔

''تمھاری باری۔''

خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نہ تمھیں ملکہ سمجھتا ہوں اور نہ قبیلے سے غداری کر سکتا ہوں۔''

وہ بے رحمی سے مسکرائی۔ ''یہ جوان ملکہ قُتیلے کو حوصلے والا لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ قیروان کو بولی۔ ''ملکہ قُتیلہ کو معلوم ہو گیا ہے تم سے کیا غلطی ہو رہی ہے۔ اصل میں غلطی ملکہ قُتیلہ کی ہے کہ براہِ راست تمھیں گردن کاٹنے پر لگا دیا، اگر کم موٹے اعضاء سے شروعات کی جاتی تو تم اب تک کافی کچھ سیکھ چکے ہوتے۔ یوں بھی گردن کٹ جانے کے بعد باقی جسم کو مشق کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے ان بے چاروں کے پاس فقط ایک ایک گردن ہے۔ بہ ہر حال ابھی ہم بازو سے ابتداء کریں گے۔''

یہ کہتے ہی اس نے زخمی کی کلائی پکڑ کر اس کے بازو کو سیدھا کیا۔ قیروان کو پتا چل گیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ کر زور دار انداز میں گھمائی۔ تلوار نے کہنی کو جسم سے علاحدہ کر دیا تھا۔ زخمی کے حلق سے زور دار چیخ برآمد ہوئی۔ وہ دہرا ہو کر دوسرے ہاتھ سے اپنے کٹے ہوئے بازو کو دبا کر خون کی دھاروں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے بلند بانگ کراہیں برآمد ہو رہی تھیں۔

''ہونہہ!..... پہلے سے بہتر ہے۔'' قتیلہ نے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ ''اب ٹانگ کی باری ہے۔'' اس نے اذیت سے کراہتے زخمی کی ٹانگ پکڑی وہ تڑپتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی اس نے دوسری ٹانگ زور دار انداز میں قتیلہ کے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔

قتیلہ اسے ٹانگ کو پیٹ کی طرف سمیٹتے دیکھ کر چوکنا ہو گئی تھی اور اس کے تدارک کے لیے اس نے کمر سے باندھی چھوٹی نیام میں اڑسے خنجر کے دستے پر ایک ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جونہی اس کی ٹانگ تیزی سے قتیلہ کے پیٹ کی طرف بڑھی، اس نے سرعت سے خنجر نکال کر اس کے پاؤں کے سامنے پکڑ لیا۔ زوردار انداز میں چلائی ہوئی ٹانگ کے سامنے تیز نوک والے خنجر نے رکاوٹ ڈالی اور خنجر چمڑے کے جوتے میں سوراخ کرتا ہوا پاؤں کے تلوے سے بھی پار ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے زوردار چیخ نکلی، جتنی تیزی سے اس نے ٹانگ چلائی تھی اس سے زیادہ تیزی سے ٹانگ واپس سمیٹ لی۔

اس دوران قتیلہ نے ایک ہاتھ سے اس کی دوسری ٹانگ تھامے رکھی تھی۔ قیروان نے گھٹنے کا اندازہ کر کے تلوار بلند کی اگلے ہی لمحے زور سے چلائی ہوئی تلوار نے اذیت سے تڑپتے زخمی کی پنڈلی کو جسم کا حصہ نہیں رہنے دیا تھا۔ بھیانک چیخ مارتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''آہستہ آہستہ بہتری آ رہی ہے۔'' قتیلہ کے چہرے پر رحم کی رمق بھی موجود نہیں تھی۔ وہ چوتھے قیدی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمھارا ساتھی تو بے ہوش ہو گیا، کیا تم بتا سکتے ہو کہ بنو ضبع میں کتنے لڑاکا موجود ہوں گے؟''

اپنے ساتھی کا حال دیکھنے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''بوڑھے، جوان ملا کر چالیس سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ عورتیں اس کے علاوہ ہیں۔''

''تمھیں شرم آنی چاہیے بے غیرت.....'' پانچواں قیدی غضب ناک ہو کر اپنے ساتھی کو ملامت کرنے لگا، لیکن قتیلہ نے اسے فقرہ پورا نہیں کرنے دیا تھا۔ ایک دم اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے اس نے پانچویں زخمی کے منہ میں گھسیڑ دی تھی۔ تلوار کی نوک اس کے کھوپڑی کے عقب سے نکل گئی تھی۔ تلوار واپس کھینچ کر وہ بچ جانے والے زخمی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تم کچھ بتا رہے تھے۔''

اس کا جسم بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ ہکلایا..... ''جج..... جی ملکہ عالیہ میں کہہ رہا تھا کل ملا کر چالیس کے قریب مرد ہوں گے۔ بچے اور عورتیں اس کے علاوہ ہیں۔''

قُتیلہ نے پوچھا۔ ''لڑنے والے مرد کتنے ہوں گے؟''

''تلوار اٹھانے والوں کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔'' آخری رہ جانے والے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ بے رحم قُتیلہ کے رعب و خوف نے اس کے اعصاب توڑ دیے تھے۔

قُتیلہ کے سوال جاری رہے۔ ''رزاح بن اسد کے بعد قبیلے کا سردار کون بنا ہے؟''

''ہمیں اب تک رزاح کی موت کی تصدیق نہیں ہوئی، اس لیے سردار تو وہی ہے۔ البتہ اس کا قائم مقام مضرس بن یربوع تھا۔'' اس نے بازو اور ٹانگ کٹنے والے شخص کی طرف اشارہ کیا جس کی ٹانگ اور بازو سے بہنے والا بے تحاشا خون اسے آہستہ آہستہ موت کی وادی کی جانب دھکیل رہا تھا۔ اب اگر اس کا خون بہنے سے روک بھی دیا جاتا تو اس کا بچنا محال تھا۔

''بنوضبع یہاں سے کتنی دور ہے اور رستے کی پہچان کیا ہے؟''

وہ تھوک نگلتے ہوئے تفصیل سے بتانے لگا۔ ''یہاں سے سفر کرتے ہوئے وادی کا چوتھا موڑ مڑنے کے بجائے سیدھا آگے بڑھتے جائیں۔ چوتھے موڑ سے فرلانگ بھر دور ایک بڑا ٹیلہ آئے گا۔ جو ارد گرد کے ٹیلوں سے کافی بلند ہے۔ ٹیلے کی بلندی پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو شمالی تارے اور شعریٰ یمانیہ[1] کے مقام غروب کے درمیانی فاصلے کے نصف کی جانب وہاں سے قریباً دو فرسخ دور بنوضبع واقع ہے۔''

''بلا شبہ تم رحم کیے جانے کے حق دار ہو۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس کی تلوار بجلی کے کوندے کی طرح آخری آدمی کی گردن کی طرف بڑھی۔ اس مرتبہ اس نے نئے انداز میں وار کیا تھا یوں کہ تلوار زخمی کی گردن کو کاٹتی ہوئی گزر گئی تھی اور سراب تک شانوں پر نظر آ رہا تھا۔

''اور ملکہ قُتیلہ کو اتنا ہی رحم کرنا آتا ہے۔''

مضروب کی آنکھوں میں اذیت اور حیرانی جیسے ثبت ہو گئی تھی۔ خون کی دھار گردن کے چاروں جانب سے نکل کر بہنے لگی تھی۔ اس کا جسم غیر متوازن ہوا اور آگے کو جھکتے ہوئے پہلے اس کی گردن زمین پر گری اور پھر وہ خود بھی گر کر ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا تھا۔

قیروان نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ آپ نے کیسے کیا ملکہ؟''

مگر وہ اسے جواب دیے بغیر ملکان کی طرف متوجہ ہو گئی جو لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب آ رہا

---

1. (اسے انگریزی میں سائرس کہتے ہیں۔ اور سائرس جنوب مشرق سے طلوع ہو کر جنوب مغرب میں غروب ہوتا ہے۔)

تھا۔سورج غروب ہو چکا تھا، ہر طرف ملگجا اندھیرا پھیلا تھا۔قریب آکر وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ملکہ،گھوڑے،تلواریں اور مرنے والوں کے لباس اکٹھے ہو گئے ہیں اور ان پانچ کے علاوہ تمام
لاشوں کو ایک گڑھے میں ڈال دیا ہے۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔''گڑھے میں پھینکنے کا تکلف ہی کیا ہے،آج رات ابن آوی 1 ،ا
جعدہ 2 اور ام عامر 3 نے ان لاشوں پر دعوت اڑانا ہے۔بقایا جات کا صفایا کل طلوع آفتاب کے
بعد نسر (گدھ) دیوتا کر دے گا۔''

ملکان جلدی سے بولا۔''لاشوں پر ریت نہیں پھینکی ملکہ۔''

اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر پسندیدگی کا عندیہ دیا اور تمام کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔''آ
سے پہلے تمھارا تعلق کس قبیلے سے تھا،تم کام کیا کرتے تھے اور تمھارا زندگی گزارنے کا طریقہ کار کیا تھا
تمام باتیں بھول جاؤ۔بس یہ یاد رکھو کہ اب تمھارا تعلق بنوطرید سے ہے اور اپنی بقا کے لیے تمھیں ہر وقت
جنگ کے لیے تیار رہنا ہے۔تمھاری تعداد اتنی مختصر ہے کہ کوئی بھی قزاق قبیلہ تمھیں تر نوالہ سمجھتے ہوئے نگ
میں وقت ضائع نہیں کرے گا اور اس کی زندہ مثال بنوضبع کے حالیہ حملے کی کوشش ہے۔اگر انھیں گھیر
ہلاک نہ کرتے تو تمھاری زندگی میں آنے والی یہ آخری رات ہوتی۔یقیناً بنوقیشرہ کے باسی اپنا انجا
بھولے نہیں ہوں گے۔پورے قبیلے میں صرف انھی بندوں کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا تھا جنھیں وہ غلام
کر بیچ سکتے تھے۔ہم بھی یونھی کریں گے بنوقیشرہ کی تباہی کا بدلہ بنوضبع کی مکمل تباہی ہی سے پورا ہوگا۔
آج کی رات سفر میں گزاریں گے اور کل بنوضبع کی تباہی کا دن ہوگا۔انھیں کیسے قابو کرنا ہے یہ ملکہ قُتیلہ
نے سوچ لیا ہے۔فی الحال یہ گھوڑے اور سامان لے کر ہم قبیلے میں جائیں گے۔اور رات کا کھانا کھا کر
سفر کا آغاز کریں گے۔کسی کو ملکہ قُتیلہ کی بات سے اختلاف ہے تو وہ اپنا منصوبہ بیان کر سکتا ہے۔''

''ہم ملکہ قُتیلہ سے متفق ہیں۔''ملکان بن نول نے بولنے میں پہل کی تھی۔

''ہم ملکہ قُتیلہ کے ساتھ ہیں۔''اس بار تمام بیک زبان بولے تھے۔

(باقی ان شاء اللہ اگلے ماہ

1 گیدڑ۔
2 بھیڑیا۔
3 لگڑ بگڑ۔
4 گدھ

Pakistanipoint.com

ایک تاثر ایک کہانی

خلیج

''میں تو ماں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی، اس بدبودار عورت کے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے''۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک 0345-6875404 راولپنڈی

اولاد اور بوڑھے والدین کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج مغرب کا المیہ ہے لیکن اس کے زہریلے اثرات مشرق میں بھی در آئے ہیں۔

Pakistanipoint.com

امریکہ کے چنچل موسم میں خنکی کا عنصر تھا اور شام کی رونق میں افراتفری مگر یہ سب کچھ حسب معمول تھا۔ عجلت کا پہلو امریکی معاشرے کا اہم جزو گردانا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل لمبی ڈیوٹی کے بعد تھک گیا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر تھکاوٹ کے ساتھ پریشانی جو اس پر گزری تھی اسے گراں محسوس ہوئی تھی۔ اس کے ذہن پر تناؤ تھا۔ بجائے کہ وہ گھر جاتا وہیں ہسپتال کے سبزہ زار میں بیٹھ گیا۔ پھر پتھریلے بینچ کے کونے میں سمٹ گیا اور سگریٹ کے تخت دھوئیں سے فضا مکدر کرنے لگا۔ اب وہ کچھ وہیں ستانا چاہتا تھا۔

امریکہ آئے اسے دس برس بیت چکے تھے، وہ اس معاشرے کا عادی ہو چکا تھا۔ عموماً مطمئن رہتا مگر گہرائی میں کہیں وہ مشرقی اقدار کا بھی دلدادہ تھا۔ گو دونوں معاشروں کے اپنے رسم و رواج تھے، پھر بھی معاشرتی تلخیوں نے اسے چاٹ لیا تھا۔ کم از کم وہ یہی سمجھتا تھا۔ یہ آوارہ خیال اس کے ذہن میں آیا تو درد تلخ دھوئیں کے ساتھ اس کے وجود میں بکھر گیا۔ اس کے لبوں سے آہ نکل گئی۔ اس روز جو ہوا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اچانک بے سکونی سی اس کے چہرے پر چھپ گئی۔ اس نے بازو سر کے نیچے رکھا اور بینچ پر دراز ہو گیا۔

''کاش! آج میں کوئی مسکن دوا لے لیتا''۔ اس نے سوچا پھر اپنی بے سکونی سے لڑنے لگا۔ اس نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

اچانک عہد ماضی نے اسے تھام لیا، وہ پریشان ہو گیا۔ دن تناؤ میں نہ گزرا ہوتا تو وہ خیالوں کا سفر منجمد کر سکتا تھا مگر اس دم وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس میں سکت ہی نہ تھی، وہ گردابوں میں الجھ سا گیا۔ اسی الجھاؤ میں وہ اپنے ذہن میں مچی ہلچل سے بے نیاز سا ہوتا گیا اور وہ اس دور میں جا پہنچا جو اس نے کبھی اپنے والدین کے ہمراہ آبائی وطن میں گزارا تھا۔ پھر وہ دور اس کے ذہنی انتشار پر غالب آ گیا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے بچپن کی طرف لوٹ گیا۔ پھر انہی راہوں میں کہیں کھو گیا۔

اس نے بھرے گھر میں آنکھ کھولی تھی، ایسے گھرانے میں جہاں گھر کے سربراہ دادا میاں تھے، جن کی دائمی غصیلی اور سرخ آنکھوں سے ہر فرد کانپتا تھا۔

یہ زندگی میں اس کے لئے پہلی تلخی تھی، مگر اس عہد میں کئی خوبصورتیاں بھی تھیں جو نمایاں نظر آتیں۔ خاندان کے افراد باہم یوں منسلک تھے جیسے کسی مجلد کتاب کے صفحات۔ ہر کسی کے قرطاس حیات پر کندہ تحریریں دوسرا پڑھ سکتا تھا۔ تمام افراد اپنی جگہ اہمیت رکھتے تھے۔ سہیل کی ابتدائی زندگی اسی ماحول میں گزری۔ پھر حالات میں کسی قدر تبدیلی اس وقت آئی، جب دادا میاں کا انتقال ہوا۔ اس سانحے کے ساتھ ہی دادی ماں گھرانے کی روحِ رواں بن گئی اور گھرانے کی زندگی کا ہر پہلو احاطہ کر لیا۔ ابا دادی ماں کی ہستی دیکھ کر جیتا تھا۔ وہ ایک طرح سے اس کی پرستش کرتا رہا۔ اس کی ماننا، یہاں تک کہ جو کچھ کماتا اسی کی ہتھیلی پر رکھ دیتا، وہی گھر کی مالک مختار بن گئی۔

دادی ماں کی پہلے مانی جاتی تھی، بیوی بچوں کی بعد میں۔ ابا کے ان رویوں کے طفیل کچھ مشکلیں رہیں مگر ساتھ ہی بچوں کے دلوں میں بزرگوں کی حیثیت بھی اجاگر ہوئی۔ شعور پروان چڑھتے ہیں تو تقاضے بھی جنم لیتے ہیں۔ گھرانے کے یہ اطوار گرہستی باعثِ افتخار نہیں تھے۔ اعزہ و احباب کا اندازہ بھی یہی تھا، اس پر آوازیں بھی ابھریں۔ پھر ایک گھٹی ہوئی صدا آہستہ آہستہ بلند ہوئی اور احتجاج بن گئی۔

''آپ نے مجھے اپنے گھرانے کی خادمہ بنا دیا ہے''۔ سہیل کی امی بالآخر بول پڑی۔ سہیل جانتا تھا کہ

اس کی امی پریشانی کے عالم میں اکثر رویا کرتی تھی۔ ابا نے یہ احتجاجی صدا سنی تو اسے دبانے کی کوشش کی مگر امی کا صبر ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنی حیثیت ہر قیمت پر منوانا چاہتی تھی۔

''مجھے اپنا گھر چاہئے جہاں میں مرضی کے مطابق رہ سکوں، بچوں کی نگہداشت بہتر طور پر کر سکوں''۔ ماں کا تقاضا بڑھتا رہا۔

امی کی سوچ درست تھی۔ بڑا سا گھرانہ ابا کی کمائی پر پل رہا تھا۔ اس کے باوجود امی فجر کے بعد گھریلو کام کاج شروع کرتی اور رات گئے تک مصروف رہتی۔ نہ تو وہ اچھا پہنتی اور نہ ہی اچھا کھاتی پیتی۔ ''کوتاہی'' پر ہر کسی کا گلہ شکوہ بھی برداشت کرتی۔ اس پر طرہ یہ کہ گھر کے افراد میں اسے برابری بھی نہ مل سکی۔

''خاوند کا پیار میرے لئے حسرت بن چکا ہے''۔ ایک روز اس نے دادی ماں سے کہا۔ اس کے اظہار پر گھرانے میں فساد کھڑا ہو گیا، ایسا فساد تھا کہ جو بڑھتا ہی رہا۔

''میں بہن بھائیوں میں بڑا ہوں، مجھے سب کو ہمرکاب رکھنا ہے''۔ ابا نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہر بھائی جو شادی کرتا ہے، الگ ہو جاتا ہے، کنبے کے تمام فرائض آپ ہی کی ذمہ داری کیوں ہیں؟'' امی کے اس سوال نے ابا کو بھڑکا دیا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔ اسی شام امی کو طلاق ہو گئی اور وہ اپنے آبائی گھر لوٹ گئی۔ اس وقت یوں لگا کہ ابا نے جلد بازی کی تھی مگر بعد ازاں اس کا رویہ یوں دکھا کہ جیسے اس نے کوئی فرض پورا کر دیا تھا۔

''الامان!'' سہیل کے وجود نے جھرجھری لی۔ اشک اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ اس کا جی بہت مندا تھا۔

پتھریلے بینچ پر بار بار پہلو بدلتا رہا، سنبھلا تو درد کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔

امی چلی گئی مگر کسی نے یہ تک نہ سوچا کہ اس کا بچہ بھی تھا جو اسی گھر میں زندہ وجود تھا اور کیا ممتا کا ثانی کوئی اور جذبہ ہو سکتا تھا؟ ابا نے بھی خیال نہ کیا کہ خوبصورت اور نیک سیرت عورت جو خادمہ کا روپ دھارے ہوئے تھی، اس کے بچے کی ماں بھی تھی۔ خیر جو بھی ہوا امی گئی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی۔

برسوں پرانے درد کی لہر کہیں گہرائی سے اٹھی اور سہیل کے رگ و پے میں پھیل گئی۔ وہ درد کی آگ میں جھلسنے لگا۔ بے چین ہو کر وہ بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑا محروم سا بچپن گزارا تھا۔ گھر میں اسی طرح پلا جیسے بن میں خودرو جھاڑیاں نمو پا جاتی ہیں۔ گھر والے اپنے اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔ ابا صرف دادی ماں کا خدمت گزار تھا، اسی کی مالا جپتا رہا۔

پتھریلے بینچ پر استراحت نے سہیل کو مزید تھکا دیا تھا۔ وہ سبزہ زار کی گھاس پر چہل قدمی کرنے لگا۔

''ابا اپنی ماں کا گرویدا تھا مگر اس نے یہ کیوں نہ سوچا کہ مجھے بھی کسی ماں کی ضرورت تھی؟'' آنسو سہیل کے گالوں پر پھیلنے لگے۔ ''میری ماں کو بھی تو تکریم مل سکتی تھی''۔ سوچیں اس کے ذہن میں اٹک سی گئیں۔

دادی ماں دل کی مریضہ تھیں، ابا اسے شہر کے ہر بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا مگر کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کے اپنے سینے میں بھی ویسا ہی درد اٹھا کرتا تھا۔ سہیل کے بدن نے جھرجھری لی، فضا کی خنکی اس کے بدن میں اتر گئی۔ اس نے اپنی جیکٹ کی زپ بند کر لی سرد ہوا میں تیزی بڑھ رہی تھی۔

سہیل کو اپنے ابا سے بے شمار شکوے تھے مگر اس کا احسان بھی وہ مانتا تھا۔ گھریلو ماحول سے دل اچاٹ ہوا تو اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی، تب ابا ہی نے اسے سنبھالا تھا۔ اسی شخص نے پیسہ خرچ کر کے

اسے امریکہ میں تعلیم دلوائی تھی۔

''کیا ابا واقعی مجھ سے پیار کرتا تھا؟'' سہیل نے سوچا تو جواب کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح اس کے وجود میں کھو گیا، وہ اس کا ملبہ بھی نہ کھوج سکا۔

اس کا ابا بھی راہِ حیات پر اچانک کھو گیا تھا۔ دادی ماں کا عارضہ تو قیمتی دواؤں نے سنبھالے رکھا مگر ابا نے کسی علاج کی حاجت ہی کو عار سمجھا۔ آخر اپنی ماں کو بھی وہ داغِ مفارقت دے گیا۔ سہیل کو اس رحلت کی خبر امریکہ میں ملی تھی۔ اس نے کمرہ بند کر لیا اور جی بھر کر رویا تھا۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ اب وہ اپنے گھر کی طرف جانا چاہتا تھا۔

''رات کی سیاہی میرے دکھ کا درماں نہیں ہو سکتی''۔ اس نے خودکلامی کی۔ اپنے آنسو پونچھے اور بوجھل قدموں کے ساتھ قدرے ویران سڑک پر چل پڑا۔ وہ سواری بھی حاصل کر سکتا تھا مگر پیدل چلنا اسے برا نہ لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں رہ گزر پر تنہائی اسے راہِ حیات پر تنہا سفری کا احساس دلانے لگی۔ جھرجھری پھر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ شاید وہ تمام معاشرے ہی میں تنہا تھا۔ اس کی سوچیں تمام معاشرے سے مختلف تھیں۔

مغرب میں رہتے ہوئے بھی وہ مشرقی اقدار کا دلدادہ تھا۔ والدین کے ساتھ وہ جب آبائی وطن میں مقیم تھا تو اس نے وہاں ایسے خوبصورت گھرانے بھی دیکھے تھے جو باہم شیر و شکر تھے۔ ان گھرانوں کا نظام معاشرت اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ انہیں وہ حسرت کی نگاہ سے تکا کرتا تھا۔ وہ ماضی کی دنیا میں دوبارہ کھوتا گیا، یہی وجہ تھی جو راہ پر بے رونقی اسے بری نہ لگی۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا، کچھ اسی طرح جیسے وہ راہِ زندگی پر تنہا راہ نورد تھا۔ زندگی کو کسی نے دیوانے کا خواب کہا تھا۔ اس کے ذہن میں آیا۔

قدرت نے انسان کو دماغ عطا کیا تو پھر اسے فیصلوں کا اختیار دے دیا۔ غلط روی سے بار بار ڈرایا اور اپنی اصلاح کرنے کو کہا۔ مگر حضرتِ انسان عموماً اپنی کج روی پر نازاں رہا۔ معاشروں میں بگاڑ پیدا ہوتے رہے مگر انسان تھا کہ اپنی من مانیاں کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی وجود سے دردِ دل کی مایا منہا ہوتی گئی۔ جتنی یہ مایا کم ہوئی اتنی ہی مادہ پرستی بڑھ گئی۔

سہیل سوچوں کے ہمرکاب راہوں پر گامزن رہا پھر ایک واقعہ عہدِ ماضی سے ابھرا اور اس کے ذہن سے چپک گیا۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ بہت سال پہلے وہ جب وطن میں تھا تو وہاں بجلی کا نظام انتہائی ناقص تھا۔ لوڈشیڈنگ اپنی انتہا پر رہتی تھی۔ دن ہو یا رات، شدید گرمیوں میں بھی بجلی گھنٹوں کے حساب سے بند رہتی۔ اپنی عمر کے آخر میں دادی ماں کی طبیعت اکثر بگڑ جاتی تھی۔ بجلی کی بندش اس پر عذاب بن کر گزرتی۔ ایک صبح جاگی تو وہ قدرے پُرسکون تھی، کہنے لگی کہ رات شاید بجلی تسلسل سے میسر رہی۔ وہ یہ بات سن کر ہنس پڑا۔

سہیل جانتا تھا کہ اس کے والد نے رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارا تھا۔ یہ تمام وقت وہ دادی ماں کے سرہانے کھڑا رہا تھا اور اسے پُرسکون رکھنے کے لئے ہاتھ میں پنکھی تھامے اسے ہوا دیتا رہا تھا۔ ابا نے دادی ماں کے سامنے اپنے رتجگے کا اظہار غیر مناسب خیال کیا، چپکا بیٹھا رہا۔ اس روز سہیل کو اپنی ماں شدت سے یاد آئی تھی۔

''کاش! ابا رشتوں میں توازن رکھنے کا ہنر جان لیتا''۔ اس کے ذہن میں آیا۔ ''اپنے بہن بھائیوں ہی میں انسانی رشتوں کی تکریم روشناس کرا دیتا''۔ اس نے سوچا۔ ''ایسا ہوتا تو یقیناً امی سے خادماؤں جیسا سلوک نہ ہوتا''۔ آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے۔ اس کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

PakSociety.com

وہ چوک میں تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ خنکی زیادہ تھی، پھر بھی ہوا میں پھولوں کی خوشبو اسے اچھی لگی۔ رات کی رانی کی مہک نے خصوصاً اس کے احساس کو لبریز کر دیا۔

آگے رہائشی علاقے تھے۔ سہیل چوک پر جونہی مڑا تو اس کی نظر مسز فلپ پر پڑ گئی۔ وہ کوٹھی کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ عمومی سی مغربی خاتون تھی۔ حسب عادت اس کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس کا چہرہ گیٹ پر نصب روشنیوں کے باعث دمک رہا تھا۔ غالباً وہ موسم میں خنکی کا بھرپور لطف اٹھا رہی تھی۔

مسز فلپ خوش مزاج تھی مگر انتہائی تلخ کافی پیا کرتی تھی۔ کبھی کافی کے ساتھ سگریٹ بھی سلگا لیتی، اس کے باوجود شیریں مزاج رہتی۔ سہیل کو اس کی مسکراہٹ اچھی لگی۔ یکا یک ہوا کا جھونکا مچلا اور پھولدار جھاڑیوں کی مہک فضا کو عطر بیز کر گئی۔

''ہائی ڈاک!'' مسز فلپ کی چہک سنائی دی۔

سہیل نے اس کی طرف دیکھا، نسوانی چہرے پر سدا بہار مسکان قائم تھی۔

''ہائی آنٹی!'' سہیل نے بے ساختہ باہمی پہچان کا اظہار کر دیا۔ مسز فلپ اس کے پاس ہسپتال میں آیا کرتی تھی۔ اس نے سہیل کا بازو تھاما اور اسے گھر کے اندر لے گئی۔

''میں تمہارے لئے کافی بناؤں گی، پیو گے؟'' اس نے سہیل سے پوچھا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ سہیل کو یہ میزبانی اچھی لگی، وہ ڈرائنگ روم کی قد آدم کھڑکی کے قریب چلا آیا اور عمارت کی اندرونی آرائش کا جائزہ لیتا رہا۔ مسز فلپ نے گھر بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ سہیل نے دیکھا، باہر راہداری میں فلپ فیملی کا جواں سال بیٹا بھی گھوم رہا تھا۔ سہیل کو ڈیوڈ کا وہاں موجود ہونا اچھا لگا۔ فلپ فیملی کبھی شاندار ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ تب مسٹر فلپ زندہ تھا۔ میاں بیوی کے بیچ تعلقات خراب ہوئے تو اس نے شراب نوشی بڑھا دی تھی۔ یہی خرابی اس کے انتقال کا سبب بنی۔ اس کی بیوی، بیوہ ہو کر بھی شاندار رہی، گو اس کی کافی میں تلخی بڑھ گئی۔ عجیب سی مسکراہٹ سہیل کے لبوں پر کھیل گئی۔

مسز فلپ نے اس کے لئے کافی میں دودھ کی آمیزش زیادہ کر دی تھی۔ سہیل کو کافی عمومی ذائقے سے اچھی لگی۔

''نوعمر ڈیوڈ کو آپ کے ساتھ گھر میں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔'' سہیل نے گرم کافی کی چسکی بھرتے ہوئے برسبیل تذکرہ کہا۔ اگلے ہی لمحے مسز فلپ کا مزاج بگڑ گیا۔ کافی کا کپ اس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس کے لہجے کی تلخی اس کی آنکھوں میں بھی سمٹ آئی۔ سہیل گھبرا گیا۔

''یہ مفت خورہ میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے''۔ مسز فلپ نے کافی کا کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے مرحوم باپ کی طرح تن آسان ثابت ہوا ہے۔ سوچتی ہوں کہ یہ کب یہاں سے جائے گا؟'' وہ مسلسل بولنے لگی۔ ''چند دنوں کے لئے آیا تھا مگر اسی گھر میں مقیم ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ کل تک یہاں سے نہ نکلا تو میں اسے عدالت میں لے جاؤں گی''۔ مسز فلپ کی آنکھوں سے شرارے برس رہے تھے۔

سہیل نے دیکھا تو سکتے میں آ گیا۔ مام کو اپنی پرائیویسی اپنے لختِ جگر سے زیادہ عزیز تھی۔ کافی کا گھونٹ سہیل کے گلے میں اٹک گیا۔ اسے زور سے اچھو آیا اور کافی کے چھینٹے جا بجا بکھر گئے۔ مسز فلپ

پریشان ہوگئی۔

''کافی اچھی نہیں بنی کیا؟'' سوال اس کے لبوں پر آ گیا، فوراً ہی اس نے سہیل کی مدد کی، اسے پہلے پانی پھر نیپکن دیا۔

''تم فکر نہ کرو، ڈاک، جوانی میں تلخ کافی میرے حلق میں بھی پھنستی تھی''۔ اس نے کہا۔ سہیل شرمسار دکھائی دیتا تھا۔ کافی کے چھینٹے سفید قالین پر گرنے تھے، اب وہ مسلسل کھانس رہا تھا۔ سنبھلا تو اس نے میزبان سے اجازت طلب کی اور گھر سے نکل گیا۔ وہ خاصا رنجیدہ نظر آتا تھا، راہ ویران دکھی تو اس نے سگریٹ سلگا لیا اور کئی کش اپنے سینے میں اتار لئے۔ ذرا سنبھلا تو اسے وہ وقت یاد آنے لگا، جب اس کی امی اپنے گھر سے نکلی تھی، پیار اور ممتا کی دیوی۔ اس وقت اس نے دل سے چاہا تھا کہ کاش کوئی آگے بڑھے اور اس کی امی کو روک لے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ابا سخت غصے میں تھا، شاید حواس ہی میں بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی رفیقہ کے گال پر تھپڑ بھی جڑ دیا تھا۔ اس دم ابا کے رویوں نے اسے سخت رنجیدہ کیا تھا۔

تھپڑ کی ضرب گویا اس کے ننھے سے دل پر بھی پڑی تھی، وہ امی کے درد کا مداوا کرنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کر سکا۔ چاہ کر بھی اسے جانے سے نہ روک سکا۔ جاتے وقت اس کی امی بری طرح رو رہی تھی۔ وہ انتہائی دل شکستہ تھی۔ ابا نے دھکا دے کر اسے دروازے کے باہر نکال دیا تھا۔ اس دم اس کی امی نے اس کی طرف بھی دیکھا تھا جبکہ وہ اپنے اشک آنکھوں میں روک لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی امی کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا۔

جانے والوں کو بھلا کب روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

سہیل کے وجود نے جھرجھری لی اور وہ کپکپا اٹھا۔ آہ اس کے لبوں پر ٹوٹ گئی۔

ایک دفعہ پھر وہ رونے کی قریب پہنچ گیا۔ وہ اپنے جذبوں کے خلاف لڑنے لگا۔ اسی بیچ جوزف نے اسے روک لیا۔ شام گہری ہو چکی تھی مگر جوزف کے گھر کا دروازہ کھلا تھا، بتیاں بھی روشن تھیں اور راہداری میں چھوٹا ٹرک کھڑا تھا۔ معاملہ حیرانی کا تھا، بلکہ شاید شدید اچنبھے کا۔

''میں بہت اچھا ڈرائیور ہوں، مگر ٹرک زندگی میں پہلی بار چلایا ہے، تجربہ خوشگوار نہیں تھا۔'' جوزف نے بغیر کسی تمہید کے، اپنی بپتا سنا دی۔ وہ اپنی خفت مٹانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' سہل نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔ وہ ماجرا سمجھنے سے کچھ قاصر بھی دکھائی دیا۔

جوزف نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر بولا۔ ''جو بھی ہوا، اسے نرالا قرار نہیں دیا جا سکتا''۔

''مگر تم مجھے بہت پریشان لگ رہے ہو، کیا میں معاملہ جان سکتا ہوں؟'' سہیل نے پوچھا اور کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ تمہاری کچھ مدد کر سکوں''۔

''نہیں، ایسی نوبت نہیں آئے گی، بلاشبہ میں نے چند روز پریشانی میں گزارے ہیں مگر اب معاملہ سلجھ گیا ہے''۔ جوزف نے الفاظ پیتے ہوئے کہا۔ ذرا سا رکا، پھر خود ہی بول پڑا۔ اس کے چہرے پر حقارت کا تاثر ابھی ابھر آیا۔

''مام کے ساتھ رہ رہا تھا۔ قیام اوپری منزل پر تھا، بیرونی طرف سے سیڑھیوں کا راستہ استعمال کرتا تھا۔ قریبی فوڈ پوائنٹ سے کھانا بھی کھا لیا کرتا تھا۔ معلوم نہیں مام کو کیا سوجھی، یکدم اس نے فلیٹ کا کرایہ بڑھا دیا، اس قدر زیادہ کہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ مجبوراً ایک دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہوں''۔ جوزف نے کہا۔

سہیل کے دل پر ٹھیس لگی۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ جوزف پھر بول پڑا۔

''میں آج کے بعد مام سے نہیں ملوں گا، چاہے اس پر آفت ہی کیوں نہ نازل ہو جائے۔ ہاں، جب وہ مرے گی تو میں رہائش گاہ کا قبضہ لینے آؤں گا''۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ٹرک پر سامان لادا جا چکا تھا۔ جوزف نے سہیل کو خدا حافظ کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور چند ہی لمحوں میں وہ منظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی مام اوپری منزل پر موجود تھی، وہ خالی کمروں کے دروازے بند کر رہی تھی۔

سہیل کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، اس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ پھر اپنے راستے پر گامزن ہو گیا۔ اب کے ویرانی اسے کھٹکنے لگی تھی۔ اسے لگا کہ اس کا سینہ کچھ بھاری تھا اور وجود میں جذبوں کا ہیجان بھی تھا۔ اس نے اپنا ذہن خیالوں سے خالی کرنے کی کوشش کی مگر ایسا نہ کر سکا۔ ایک خیال نکلا تو کوئی دوسرا اس کے ذہن میں ابھر آیا۔

اسے اپنی امی پھر یاد آ گئی۔ جب وہ چلی گئی تو اسے اپنے دل کا پنجرہ خالی لگا کرتا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اپنی روح بھی محروم لگا کرتی۔ اسے لگتا کہ اس کا وجود جو کبھی پیار کی گھٹاؤں سے سیراب ہوا کرتا تھا۔ اب خشک سالی کا شکار تھا۔ یاس لئے جاگتا اور کسی طرح صبح سے شام کر دیتا۔ امی دوبارہ کبھی نصیب میں آ جائے گی، یہ اسے ممکن نہ لگتا۔ اسے لگتا کہ وہ ایک کھوٹا سکہ تھا جس کی پروا کسی کو نہیں تھی۔

جدائی کے بعد ماں اسے ایک بار ملی تھی مگر چند لمحوں کے لئے۔ وہ ابا کے ساتھ بازار گیا تھا کہ انہونی ہو گئی۔ امی اس کے سامنے آ گئی۔ وہ اس دم اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

امی سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو قیامت ہر دو طرف برپا ہو گئی۔ امی کا ہاتھ بے ساختہ سینے کی طرف گیا اور وہ دائیں طرف ایک دکان کے تھڑے پر جھک گئی۔ وہیں جھکی رہی، باشعور ابا لخت جگر کو لے کر دوسری طرف چل پڑا جبکہ دونوں کا لخت جگر کچھ بھی نہ کر سکا، محض اپنے دل کی دھڑکنیں سنبھالتا رہا۔ اس روز اس نے اپنے آنسو بھی پی لئے۔ ابا ان دنوں اپنی تیسری شادی پر سوچ رہا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اس کا حق رکھتا تھا؟ کیونکہ پہلے ہی وہ دو بیویوں کو طلاق دے چکا تھا۔ سہیل کی دنیا اندھیر کر چکا تھا لیکن آفرین ہے جو اس نے کبھی اپنا محاسبہ کیا۔

تمام ستم برداشت کرنے کے باوجود بھی سہیل اپنے ابا کے ساتھ کھڑا رہا۔ اس کی تعظیم کیا کرتا، یہی نہیں بلکہ اس سے ہمدردی بھی کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دل کے داغ اسے کبھی نہ دکھا سکا، نہ ہی ابا کبھی اس کے دل میں جھانک سکا۔ اگلے ہی پل بوڑھا آرتھر اس کی یادوں میں نمایاں ہوا اور عہد رفتہ کے دریچوں سے جھانکنے لگا۔ سہیل کا جی اور بھی مندا ہو گیا۔ اسے رابرٹ پر غصہ آ گیا۔ رابرٹ اس کا دوست تھا۔

سہیل کے پڑوس میں مقیم تھا، جبکہ آرتھر سامنے والے کمرں میں رہائش پذیر ہوا تھا۔ ایک روز سہیل کے پاس چلا آیا۔

''بیٹا مجھے ٹیلی فون ملا دو، میری نظر اب کام نہیں کرتی۔ مجھے ضروری کال کرنی ہے''۔ اس نے سہیل سے درخواست کی۔ سہیل نے نمبر ملا دیا، خود واش روم میں چلا گیا۔ لوٹا تو بوڑھا آرتھر اپنی کال مکمل کر چکا تھا اور اپنا وجود ضعیف ٹانگوں پر سنبھال رہا تھا۔

''آپ چائے پئیں گے؟'' سہیل کو اس پر ترس آیا۔ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔ آرتھر کے چہرے پر دمک جھلکنے لگی۔

PakistaniPoint.com

''ہاں بیٹا! میں نے صبح ناشتہ نہیں کیا''۔ اس نے کہا اور دوبارہ نشست پر بیٹھ گیا۔ سہیل کچن میں مصروف ہو گیا۔ اسی بیچ آرتھر جانے لگا تو سہیل نے اسے دیکھ لیا پھر آگے بڑھ کر اسے روک لیا اور ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ بوڑھا آرتھر اسے خوشگوار حیرت سے تکنے لگا۔

''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے نکلا پھر تشکر کا جذبہ اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔ بلاشبہ اس وقت ناشتہ آرتھر کی ضرورت تھا۔

''سر! کوئی مسئلہ ہو یا کسی قسم کی بھی مدد درکار ہو، تو میں حاضر ہوں۔ اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے کسی کام آ سکوں''۔ سہیل نے پیشکش کی۔ بوڑھے آرتھر کی آنکھوں میں اشک اتر آئے۔

''بیٹا! تو پھر میری کہانی سن لو''۔ اس نے کہا۔

''اس طرح تھوڑی دیر میری تنہائی کم ہو جائے گی''۔

اس کی التجا تھی۔ سہیل نے بخوشی ہامی بھر لی۔ بوڑھے آرتھر نے اسے اپنی بپتا سنائی، کہا۔

''بیٹا! میں نے ماضی میں بھرپور زندگی بسر کی ہے مگر وقت کا سفر بڑا ظالم ہے۔ اپنے وہ پہلو بھی دکھا دیتا ہے جو ہمارے گمان تک میں نہیں ہوتے۔ برسہا برس بیت چکے۔ میں نے جیکی سے شادی کی تھی، جو بہت خوبصورت تھی مگر اصل صفت اس کے دل کی خوبصورت تھی۔ ہم دونوں گویا ایک دوسرے کے لئے بنے تھے۔ مختلف دفاتر میں کام کرتے تھے مگر شام ہمیشہ جاندار گزارتے۔ میں تاجر تھا اور وہ بینکر تھی۔ دونوں کی آمدنی معقول تھی۔ ہمارے ہاں دو بچے بھی پیدا ہوئے، رابرٹ جسے میں پیار سے راب کہا کرتا تھا اور لز، جس کا حقیقی نام الزبتھ تھا۔ میں نے بچوں کو ہر وہ آسائش مہیا کی جو میرے بس میں تھی۔ جیکی بھی زندگی بھر میری مدد گار رہی۔ یوں گویا بچے ہی ہماری زندگی کا محور رہے۔

بیٹا! یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھا وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے۔ شاید میری نگہداشت ہی کا قصور تھا، جو راہرٹ بری عادتوں کا شکار ہو گیا۔ وہ کثرت سے شراب نوشی کرنے لگا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے گھر چھوڑ دیا۔ اپنی تمامتر کمزوریوں کے باوجود وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر میرا سانس پھول گیا۔ لز البتہ میری فرماں بردار رہی۔ وہ مجھ پر جان چھڑکتی تھی، ہمیشہ والدین کا خیال رکھتی۔

میری بدنصیبی کا آغاز اس وقت ہوا، جب میں نے نوکری چھوڑ کر اپنا بزنس شروع کر دیا۔ اس بزنس میں مجھے پے در پے نقصان ہوا اور میں عرش سے فرش پر گر پڑا۔ آج بھی سوچوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جیکی نے مجھے زندگی میں ہمیشہ حوصلہ دیا مگر میں ہی کمزور تھا جو حوصلہ ہار بیٹھا۔

میرا اصل نقصان اس وقت ہوا جب جیکی انتقال کر گئی۔ بڑا کٹھن وقت تھا، اس وقت مجھے لگا کہ میں اس خسارے سے کبھی نہیں سنبھل پاؤں گا۔ مگر ڈھیٹ تھا جو پھر بھی زندہ بچ رہا۔ بیٹی میری ہمدرد تھی مگر اپنے گھر کی ہو چکی تھی، آسٹریلیا چلی گئی۔ اب کبھی کبھار آ جاتی ہے مگر کسی مہمان کی طرح۔ وہ میری ہے مگر میرے تابع نہیں۔ کبھی آئے تو میری دنیا میں بہار آ جاتی ہے ورنہ میں اس قدر تنہا ہو چکا ہوں کہ گھر جو کبھی میرے لئے جنت تھا، اب بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ شام کا سماں تو مجھے خصوصاً افسردہ و رنجیدہ کر دیتا ہے۔

میں نے رابرٹ کی ہر ممکن منت کی کہ وہ اپنے گھر چلا آئے مگر وہ نہیں مانا۔ اسے مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں، وہ صرف اپنی زندگی جینا چاہتا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان دنوں وہ اس عمارت میں مقیم تھا۔ جی زیادہ گھبرایا تو میں خود اس کے پاس چلا آیا۔ اس کے فلیٹ کے بالمقابل رہائش گاہ کرائے پر لے لی

جو محض ایک کمرے تک محدود ہے گو میرے پاس مناسب ساز و سامان بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی میں خوش ہوں کہ لختِ جگر کے قریب ہوں۔ کمرے کی دونوں طرف کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ سامنے کی کھڑکی عموماً میں کھلی رکھتا ہوں تاکہ رابرٹ مجھے دکھائی دیتا ہے، وہ جب بھی اپنے فلیٹ میں آتا رہے، میں اسے ایک نظر دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے تسلی ہو جاتی ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں اور اسی عمارت میں میرا لختِ جگر بھی رہائش رکھتا ہے''۔ بوڑھے آرتھر نے اپنی سرگزشت سنائی۔ سہیل نے دیکھا، اس کی اشک بھری آنکھوں میں امید کے دیئے روشن تھے۔

''میں رابرٹ سے بات کروں گا کہ وہ آپ کو مناسب وقت دیا کرے''۔ سہیل نے آرتھر سے وعدہ کیا۔ وہ خود بھی پریشان اور مضطرب نظر آتا تھا۔ آرتھر کی کہانی پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ آرتھر کا گداز بھرا عکس دن بھر اس کے ذہن میں اٹکا رہا۔ شام جب وہ ہسپتال سے لوٹا تو رابرٹ اسے عمارت کے مین گیٹ پر ہی مل گیا۔ اس کے چہرے پر طیش اور حقارت کے جذبات تھے۔

''کیا ہوا؟'' سہیل نے اس سے دریافت کیا۔ پھر کیا تھا، جواباً وہ پھٹ پڑا۔

''معلوم نہیں کہ یہ بوڑھا میرا تعاقب کیوں کر رہا ہے؟ اسے زندگی میں میرا سکون اچھا نہیں لگتا۔ میں اچھا خاصا یہاں رہ رہا تھا۔ یہ یہاں بھی پہنچ گیا۔ کم بخت مرتا بھی نہیں۔ مجبوراً مجھے نئی جگہ منتقل ہونا پڑ رہا ہے لیکن خیر میں نے بھی سوچ لیا ہے، اس بار اتنی دور نکل جاؤں گا کہ اسے میری بھنک تک نہیں پڑے گی۔ کچھ زائد اخراجات کی قربانی دینی پڑے گی، مگر اب یہ ضروری ہے۔ میرا نصیب ہی برباد ہے''۔ رابرٹ نے اس انداز میں حالِ دل کہا کہ سہیل اس سے مزید کلام نہ کر سکا۔

اگلے روز رابرٹ نے اپنا فلیٹ خالی کر دیا۔ وہ کہاں گیا؟ کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ چند روز بعد آرتھر بھی وہاں سے اپنے گھر لوٹ گیا۔ جاتے وقت وہ بہت دکھی اور مایوس تھا۔ سہیل نے اسے تسلی دی۔

''میں مصروف رہتا ہوں۔ وقت نہیں ملتا، کوشش کروں گا کہ گاہے بگاہے آپ سے ملاقات ہوتی رہے''۔ اس نے آرتھر کا دل رکھنے یک کوشش کی۔ آرتھر نے سنا تو رو پڑا۔ سنبھلا تو کہنے لگا۔

''تم ضرور آنا، آنے سے پہلے مجھے فون کر لینا۔ میں بہت اچھا کک ہوں، تمہارے لئے کھانے کا اہتمام کروں گا''۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔ اسی عالم میں اس نے سہیل کو الوداع کہا اور چلا گیا۔

یکا یک ایک گاڑی سہیل کے قریب سے گزر گئی۔ وہ اس کی زد میں آنے سے بمشکل بچا قصور اسی کا تھا۔ خیالوں کی رو میں وہ سڑک کے تقریباً وسط میں چل رہا تھا۔ گاڑی والا اس پر چیخ رہا تھا۔ سہیل شرمندہ تھا، فوراً ہی وہ فٹ پاتھ کی حدود میں سمٹ گیا۔

''انسان سفاکی پر اتر آئے تو بھی وہ حدیں پھلانگ جاتا ہے''۔ وہ بڑبڑایا۔

''کاش! دردِ دل کا ضیاع کسی طرح بچایا جا سکتا''۔ ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا اور معلق ہو گیا۔ ''کاش! ہم ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے اور معاشرے میں اچھے رویوں کو فروغ دے سکتے''۔ وہ سوچتا رہا۔

''اس طرح دشمنیاں اپنی موت مرتی جاتیں''۔ اس نے آہ بھری۔

اسے اپنی لمبی واک پر اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ وہ جلد اپنے فلیٹ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس کی ذہنی بے سکونی اس کے وجود

سے قدموں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ وہ اپنی پریشان خیالی کے باعث تھک رہا تھا کہ اچانک لہلہاتی ہوئی پھولدار لیبز نے اسے سحر میں جکڑ لیا۔ یہ منظر اسے لبھا لینے کو کافی تھا۔ اسی باغیچے میں للی کے مکان کا گیٹ کھلتا تھا۔

للی، جو پھولوں کی طرح حسین تھی، ہمیشہ کسی گلِ تازہ کا احساس لئے ملا کرتی۔ اس نے سہیل کو بھی ڈیٹنگ کی آفر دی تھی، مگر سہیل اس کے چنچل پن سے نبھاہ نہ کر سکا۔ اسے بالغ نظر لڑکیاں زیادہ پسند تھیں۔

''کیا چنچل لڑکیاں بالغ نظر نہیں ہو سکتیں؟'' ایک نئے خیال نے اسے دھر لیا۔

''ہو سکتی ہیں''۔ سہیل کو اپنے ہی ذہن سے جواب مل گیا۔ ''کیا بالغ نظر لڑکیاں بلند اخلاق بھی ہوتی ہیں؟'' سہیل نے سوچا تو الجھ گیا۔ اسے اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ اسے اپنے ہی ذہن کی ملامت کرنا پڑی۔

للی ایک بڑے سٹور پر سیلز گرل تھی۔ ویک اینڈ پر ایک کلب میں رقص کیا کرتی تھی۔ عموماً امیر لوگوں کے ساتھ ڈنر بھی ہو جاتی تھی۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ ایک دفعہ اس کی لاٹری نکل آئی تھی۔ اسے اتنی رقم مل گئی کہ اس نے ایک خوبصورت مکان خرید لیا اور اسے بہترین فرنیچر سے آراستہ کر دیا۔ بعدازاں اسے للی کے پودوں سے سجا دیا۔ ایک گاڑی بھی خرید لی۔ کچھ رقم اپنے بینک میں بھی محفوظ کر لی۔ وہ اپنی بہن ایملی اور والد کے ہمراہ زندگی بسر کرنے لگی مگر رفتہ رفتہ بوڑھا والد، جارج اپنی بیٹیوں پر بوجھ بن گیا۔ جارج شریف النفس آدمی تھا۔ پڑھا لکھا تھا مگر دولت نہ بنا سکا۔ عمر بھر چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتا رہا۔ یہ بھی اس کی غلطی تھی جو پھولوں والی کوٹھی کو اپنی ملکیت سمجھ بیٹھا تھا۔

ایک ملگجی سی شام سہیل کے ذہن میں جاگ اٹھی، وہ چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے ناقابل یقین منظر دیکھا۔ موسم بہت سرد تھا اور جارج گھر کے در پر گرا پڑا تھا۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ سہیل اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ للی گھر سے نمودار ہو گئی۔

''پھر آ گئے تم؟'' اس نے اکتاہٹ کے عالم میں اپنے والد، جارج سے کہا، پھر سہیل کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ڈاک میں ذرا مشکل میں ہوں۔ ڈیڈ کو دیکھو، میں اسے اولڈ ہاؤس چھوڑ کر آتی ہوں، مگر یہ ہر بار لوٹ آتا ہے۔ میں اسے اس قدر ضدی نہیں سمجھتی تھی مگر یہ ذرا بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بہت سمجھایا۔ وعدہ کرتا ہے کہ دوبارہ واپس نہیں آؤں گا۔ مگر پھر چکمہ دے کر وہاں سے بھاگ نکلتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں جی نہیں لگتا۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی برداشت کرنی پڑی ہے۔ آج بھی مجھے ایڈمنسٹریشن سے معذرت کرنی پڑے گی''۔

للی بغیر رکے متواتر بولتی رہی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات تھے، جبکہ جارج کسی بچے کی طرح سہما ہوا تھا۔ وہ متواتر اپنی بیٹی کی طرف دیکھ رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں امید کی کرنیں بجھ رہی تھیں۔

''کہو کیا کہنا ہے؟'' للی نے اپنے والد سے پوچھا، اس کا لہجہ درشت رہا۔

بوڑھے جارج نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہکلا کر رہ گیا۔ سنبھلا تو آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

''میں نے بہت سوچا ہے بیٹی، ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے، سننا چاہو تو بتا دوں؟''

''جلدی کرو۔'' للی نے اسے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔ سہیل نے دیکھا، سردی کے مارے جارج کے دانت بج رہے تھے، ہونٹ بھی لرزاں تھے اور کسی قدر نیلے بھی۔ اسے لگا کہ کچھ ہی دیر میں بوڑھے وجود سے

زندگی کھنچ جائے گی۔

''بیٹی کیا ایسا ممکن ہے تم وہ کمرہ مجھے لوٹا دو۔ جس میں میں رہ رہا تھا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم دونوں بچیوں پر بوجھ نہیں بنوں گا، نہ ہی کبھی گھرانے کے معمولات میں رخنہ ڈالوں گا۔ گورنمنٹ مجھے مناسب پینشن دے دیتی ہے۔ تم مجھے عقبی دروازے کی چابی دے دو، یوں بھی تو وہ دروازہ بند ہی رہتا ہے پھر اس طرف ایک کیفے بھی ہے جو میری کھانے پینے کی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔ مجھ سے اگر نادانستگی میں کوئی غلطی.....''

''یہ نہیں ہوسکتا''۔ للی نے سوچتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ڈھٹائی بھی اس کے چہرے پر اتر آئی۔ ''تمہیں واپس ہی جانا ہوگا''۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

جارج کا چہرہ اتر گیا، رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے گھبرا کر سہیل کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ اب وہ سکی کی حدود سے گزر چکا تھا۔ اسی بیچ للی کی بہن گاڑی لے آئی۔ دونوں بہنیں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں جبکہ جارج پچھلی نشست پر سمٹ گیا۔ اس کے چہرے پر تاثرات معدوم تھے۔ صرف بے چارگی تھی جو کسی دم ابھر آتی۔ اس نے چپ سادھ لی تھی۔

منظر ذہن میں لوٹا تو سہیل لرز گیا۔ جھرجھری اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ وہ کرب کے تناؤ تلے دب چکا تھا۔ اس نے شکر کیا جو گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

کالونی کی آخری لین میں مڑا تو اس کی نظریں گھڑی میں الجھ گئیں۔ بلاشبہ اس نے ایک مشکل اور طویل دن گزارا تھا، پھر اس طوالت کی تمام تر تھکن اس کے چہرے پر عیاں ہوگئی۔ اگلے ہی پل اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

''تنہا پسندی نے مجھے قنوطی بنا دیا ہے''۔ وہ سوچنے لگا۔ اپنی تمام خوبیاں اسے عیوب کا لبادہ پہنے دکھائی دینے لگیں۔

وہ ایک جونیئر ڈاکٹر تھا، ہمدرد اور محنتی، وہ اس کا بڑا جرم تھا۔ مریضوں کی شفایابی کے لئے محنت کرتا، یہ اس کی فاش غلطی تھی۔ ہر دم مہارت کا متمنی رہتا۔ یہ اس کی حماقت تھی۔ اعلیٰ ظرف کا حامل تھا، یہ اس کی شخصی کمزوری تھی۔ وہ اپنے اوپر ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہوں میں یاس تھی، طنز تھا، جس کی کاٹ اس کا دل چیر رہی تھی۔ ''بہتر تھا کہ وہ کوئی کلاؤن ہوتا''۔ اس کے ذہن میں آیا۔ گھر پہنچا تو وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا، تادیر اپنا جائزہ لیتا رہا۔ اپنے اوپر ہنستا رہا۔

ہسپتال میں پیش آنے والا واقعہ اس کے ذہن میں کھبا ہوا تھا۔ اضطراب بڑھا تو وہ کھڑکی کے قریب چلا آیا اور باہر دیکھنے لگا۔ فضا میں دھند چھا رہی تھی۔ اس روز جو بھی ہوا تھا، اس کے لئے کوفت کا باعث بنا تھا۔ یقیناً وہ اس کا سزاوار نہیں تھا۔ مسز کیمپل ہسپتال لائی گئی تو تقریباً اپاہج تھی۔

سہیل نے اس کے علاج پر بہت محنت کی تھی۔ اسے دوبارہ پاؤں پر کھڑا کر دیا تھا۔ مریضہ اس کے گن گاتی تھی۔

''شفا صرف خدا کی ذات ہے''۔ سہیل نے اسے بارہا کہا۔ وہ بہت خوش تھا جو کسی کی جان بچانے میں وسیلہ بنا تھا۔ ہسپتال کے سٹاف نے بھی اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا اور اسے سراہا تھا۔

''کیمپل فیملی یقین نہیں کر پائے گی کہ بوڑھی مریضہ زندہ بچ گئی''۔ سہیل سوچا کرتا تھا۔ یہ سوچ بطور معالج اس کا اعتماد بھی بڑھا رہی تھی مگر بعد میں جو ہوا وہ اس کے لئے کسی ڈراؤنے خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔

کیمپل فیملی کے دونوں بچے اس پر بہت برہم

تھے۔

''یہ ہسپتال میں پڑی رہتی تو تمہارا کیا بگڑ جاتا؟'' اس کی بیٹی فلی نے کہا۔ وہ سہیل کو مسلسل گھور رہی تھی، اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔

''مریضہ ہسپتال میں پڑی نہیں رہتی، یا تو مر جاتی ہے یا پھر تندرست ہو جاتی ہے''۔ سہیل نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔ ''میں نے مریضہ کی تندرستی کے لئے بہت پاپڑ بیلے ہیں''۔ اس نے کہا۔

''یہی تو تمہارا قصور ہے۔ زندہ لاش جو تم ہمارے حوالے کر رہے ہو اس کی دیکھ بھال اب کون کرے گا؟'' فلی طیش کی حالت میں بولتی رہی۔ سہیل کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

''میں تمہیں عدالت میں گھسیٹوں گا، تم نے میری ماں کو سٹیرائیڈ دیئے ہیں، جو خطرناک ادویہ میں شمار ہوتے ہیں''۔ مسز کیمپل کا بیٹا رچرڈ بول پڑا۔

''دوائیں خطرناک نہیں ہوتیں، ان کا بلا جواز استعمال خطرناک ہوتا ہے۔ سٹیرائیڈ مریضوں کی جان بچاتے ہیں اور اس ضمن میں آخری حربہ بھی شمار ہوتے ہیں''۔ سہیل نے دوبارہ وضاحتی انداز اختیار کیا۔

''تم ایک سفاک بہروپیے ہو، تمہارا گھٹیا طریقہ علاج مجھے اچھا نہیں لگا۔ فوری طور پر تو میں ہسپتال انتظامیہ کے سامنے معاملہ اٹھاؤں گا۔ بعد میں اپنے وکیل سے بھی مشاورت کروں گا''۔ رچرڈ نے غصے میں کہا۔ ''اور تمہارا لائسنس منسوخ کروا کے چھوڑوں گا''۔ آخر میں اس نے دھمکی بھی دے ڈالی۔

اس بیچ فلی نے سہیل کے چہرے پر تھوک دیا۔ ہسپتال انتظامیہ سہیل کے ساتھ تھی۔ کیمپل فیملی کے نوعمر بچوں کے ساتھ متفق نہ ہو سکی۔

''اس کم بخت نے تو ہمیں تباہ کر دیا''۔ فلی اپنے بھائی رچرڈ سے کہہ رہی تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو فلی! یہ خدائی خدمتگار ہمارے گھٹنوں میں بیٹھ چکا''۔ رچرڈ نے بہن کی سوچ پر مہر ثبت کر دی۔

''میں تو ماں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی، اس بدبودار عورت کے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے''۔

''میں بھی یہ بوجھ نہیں اٹھاؤں گا''۔ رچرڈ نے اعلان کر دیا۔

''ہسپتال میں اس کی نگہداشت زیادہ بہتر تھی، اگر وہ یہ فرائض انجام دینے سے قاصر ہیں تو پھر ان کا فائدہ کیا؟''

''اب یہ اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے''۔

''فرنیچر کی تبدیلی کے بعد مام کی جگہ فلیٹ میں نہیں بن سکتی''۔

''معلوم نہیں، کل پھر بستر مرگ پر پڑ جائے''۔

فلی اور رچرڈ دونوں بہت پریشان تھے۔

مسز کیمپل اپنے نصیب کا اندازہ کر چکی تھی، کہنے لگی۔

''ڈاکٹر! جب تم مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کرو گے تو میں کسی اولڈ پیپل ہوم میں چلی جاؤں گی۔ بعد میں جو تھوڑا سا ساز و سامان ہے، وہ بھی بچوں کی رہائش گاہ سے اٹھا لاؤں گی۔ ہاں تم سے ملنے کبھی کبھی یہاں آیا کروں گی''۔ بوڑھی مریضہ نے سہیل سے کہا۔

سہیل کو بے اختیار اپنی ماں یاد آ گئی۔ اس وقت نسوانی چہرے پر صبر کا وہی عکس تھا جو سہیل نے کبھی اپنی ماں کے نقوش میں دیکھا تھا، جب وہ اسے آخری بار ملی تھی۔

❁❁❁

Pakistanipoint.com

جگ بیتی

کچا رشتہ

آدھی رات کا وقت، ٹرین ویرانے میں رُکی ہوئی تھی۔ وہ اچانک انجن میں گھس آئی۔ اس کا لباس خون آلود تھا۔ خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

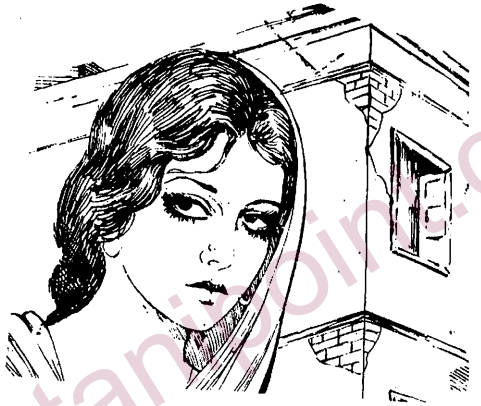

ایسے کچے رشتے کی کہانی جو خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط تھا۔

☆ ممتاز احمد
سرگودھا

ہڈیوں کا گودا جما دینے والی سخت سردی اور یخ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں ٹرین کے انجن کا ڈرائیور ہوں۔ اس روز میرا معاون ڈرائیور چھٹی پر تھا کیونکہ عیدالاضحیٰ کا موقع تھا تو میں اکیلا ہی انجن میں تھا۔ رات ایک بجے کا ٹائم تھا میں گاڑی لے کر جا رہا تھا۔ آگے ایک بڑا شہر آ رہا تھا جس کے ریلوے سٹیشن پر رکنا تھا۔ ریلوے سٹیشن چار کلو میٹر کے فاصلے پر تھا، میں گاڑی کی رفتار کم کر دی تھی اور آہستہ سپیڈ میں ٹرین کو لے کر جا رہا تھا۔ جب آؤٹر کے قریب پہنچا تو دیکھا سگنل ڈاؤن نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ ریلوے سٹیشن پر لائن کلیئر نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے ٹرین کو بریک لگا دی اور وقفے وقفے سے گاڑی کا ہارن بجانا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ وہاں گاڑی رُکی رہی۔

جب سگنل ڈاؤن ہوا اور میں ٹرین چلانے لگا تو ایک دم انجن کا دروازہ کھلا، ایک جوان اور خوبصورت عورت انجن میں داخل ہوئی۔ وہ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی

کانپ رہی تھی، اس نے کوئی سویٹر نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اس کے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا اور خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ کون ہو؟ اور اس طرح گاڑی کے انجن میں کیوں آئی ہو؟ تو وہ کہنے لگی۔ بتاتی ہوں، مجھے تھوڑا سانس تو لینے دیں۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی، اس کے منہ سے صحیح آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ وہ انجن کے فرش پر بیٹھ گئی، میں نے اپنی گرم چادر اتار کر اسے اُوڑھا دی تو اس نے تشکرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ٹرین چلا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد ریلوے سٹیشن آ گیا اور میں نے ٹرین روک دی۔ اس سٹیشن پر ٹرین دس منٹ رکھنا تھی۔ مجھے کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی اور چائے کی طلب بھی۔ میں نے چائے والا تھرمس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر بنے ایک ٹی سٹال سے تین چار کپ چائے کے بنوائے اور ساتھ کیک رس بھی لئے اور انجن میں آ گیا۔ وہ عورت سمٹ کر انجن کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے وجود کو میری دی ہوئی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا مگر پھر بھی اسے سردی لگ رہی تھی۔ میں نے دو کپوں میں چائے ڈالی اور ایک کپ اسے پکڑا دیا ساتھ ہی کیک رس والا لفافہ بھی اس کے پاس رکھ دیا۔ وہ چائے پینے لگی اور کیک رس کھانے لگی۔ ٹرین کے انجن میں کوئی بھی غیر متعلقہ شخص نہیں بیٹھ سکتا۔ میں نے غیر قانونی کام کیا تھا اور ایک جوان عورت انجن میں بیٹھی تھی۔ میں نے بھی چائے پی اور تھوڑی دیر کے بعد ٹرین کی روانگی کا سگنل مل گیا۔ میں نے گاڑی چلا دی۔ اب اگلا ریلوے سٹیشن پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا جہاں ٹرین نے رُکنا تھا۔

گرم گرم چائے پینے کے بعد وہ عورت کچھ نارمل ہو گئی۔ انجن کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اب کچھ حرارت ہو رہی تھی۔ میں نے اُس عورت سے پوچھا۔ ہاں اب بتاؤ، تم کون ہو، آدھی رات کو اس طرح انجن میں کیسے آ گئی اور ہاں تمہارے کپڑوں پر خون لگا ہوا ہے، یہ کیا ماجرا ہے؟

وہ عورت چند لمحے میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ''میں ایک قتل کر کے آئی ہوں''۔

☆☆☆

میرا نام الطاف ہے۔ میرے والد محکمہ ریلوے میں گارڈ کی ڈیوٹی کرتے تھے۔ انہیں ریلوے کالونی میں دو بیڈ روم والا کوارٹر الاٹ ہوا تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اس لئے میرے ماں باپ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میرے لاڈ اور ناز نخرے اٹھائے جاتے۔ مجھے بچپن سے ہی پلیٹ فارم اور ریلوے سٹیشن بہت اچھا لگتا تھا۔ چونکہ ہمارا کوارٹر ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب تھا تو جیسے ہی کوئی ٹریب آتی میں دوڑ کر پلیٹ فارم پہنچ جاتا جہاں مسافروں کی آمدورفت دیکھتا۔ قلی حضرات بھاگ بھاگ کر مسافروں کا سامان ٹرین میں رکھتے اور اتارتے۔ میں بھاگ کر ٹرین کے انجن کے پاس جاتا اور ڈرائیور سے ہاتھ ملاتا۔ ڈرائیور حضرات مجھے بہت پیار کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں اللہ بخش ریلوے گارڈ کا بیٹا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین روانہ ہو جاتی اور پلیٹ فارم خالی ہو جاتا تو میں واپس اپنے گھر آ جاتا۔

مجھے بچپن سے ہی ڈرائیور اچھے لگتے تھے اور میری بھی یہ خواہش تھی کہ بڑا ہو کر میں بھی ٹرین ڈرائیور بنوں گا۔ میرے ماں باپ مجھے سمجھاتے بیٹا آپ پڑھ لکھ کر بڑے افسر بنو گے مگر میری نظر میں ریلوے ڈرائیور ہی

بڑا افسر تھا۔ میں اپنے تعلیمی مدارج طے کرتا ہوا میٹرک میں پہنچ گیا۔ میں نے سائنس مضامین کے ساتھ میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ میرے والد صاحب چاہتے تھے کہ میں ایف ایس سی کروں مگر مجھے ڈرائیور بننے کا شوق جنون کی حد تک تھا چنانچہ میں نے ٹیکسلا کالج میں مکینیکل کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ وہ چار سال کا کورس تھا، میں دل لگا کر بڑی محنت سے پڑھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار سال گزر گئے اور فائنل ایگزام آ گئے۔ میں نے امتحان دیا، جب آخری پیپر دے دیا تو اگلے ہی دن میں نے ہوسٹل سے اپنا سامان اٹھایا اور گھر آ گیا۔ میرا اب بھی وہی معمول تھا، میرا زیادہ وقت پلیٹ فارم پر گزرتا۔ مختلف ڈرائیورز سے میری دوستی تھی، ان سے میں پوچھتا رہتا تھا کہ گاڑی کا انجن کیسے چلاتے ہیں۔ وہ مجھے انجن چلانے کا طریقہ بتاتے رہتے۔ میرا رزلٹ آنے میں ابھی ایک مہینہ پڑا تھا ایک دن دوران ڈیوٹی میرے والد کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ جب ان کی میت گھر آئی تو ہم پر قیامت بیت گئی۔ ہمارے سر سے سائبان اٹھ گیا۔ میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ میری ماں بیوہ ہو گئی اور میں یتیم ہو گیا۔

ہم پر غموں اور صدموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر کہتے ہیں ناں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ قرار آ جاتا ہے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی گریجوایٹی، انشورنس اور پنشن کی رقم میری امی کو مل گئی۔ محکمے کے قواعد وضوابط کی رُو سے جب کوئی اہلکار دوران ڈیوٹی انتقال کر جائے تو اس کے بیٹے کو محکمہ ریلوے میں بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اعلیٰ حکام کو اپنے والد کی جگہ نوکری کے لئے درخواست دے دی۔ میں نے ڈرائیور کی جاب کے لئے اپلائی کیا کیونکہ ایک تو مجھے بچپن سے ڈرائیور بننے کا شوق تھا، دوسرا ٹیکسلا کالج سے میرا مکینیکل کا رزلٹ بھی آ گیا تھا جس میں میں نے A گریڈ لیا تھا۔ میرا انٹرویو ہوا اور مجھے ریلوے ڈرائیور بھرتی کر لیا گیا۔ شروع شروع میں مجھے معاون ڈرائیور کی ڈیوٹی دی گئی پھر ایک سال بعد میں ڈرائیور بن گیا۔ میری آرزو اور خواہش پوری ہو گئی۔ میں ڈیوٹی پر مختلف شہروں میں جانے آنے لگا۔

والد کی وفات کے بعد اور میرے ڈرائیور بننے کے بعد امی اکیلی ہو گئی تھیں۔ میری کبھی رات کی ڈیوٹی ہوتی اور کبھی دن کی تو امی اکیلی گھر میں ہوتیں۔ اب وہ مجھ پر زور دے رہی تھیں کہ شادی کر لو تا کہ گھر میں کچھ رونق آ جائے اور وہ اپنے پوتے پوتیوں سے کھیلیں۔ آخر انہوں نے میرا رشتہ اپنی بھانجی کے ساتھ طے کر دیا اور تین ماہ بعد میری شادی کر دی۔ عافیہ میری دلہن بن کر آ گئی۔ گھر میں رونق ہو گئی، امی بھی خوش ہو گئیں۔ عافیہ نے آتے ہی گھر سنبھال لیا۔ عافیہ نے گھر کو جنت بنا دیا تھا۔

اسی طرح پانچ سال اور گزر گئے۔ اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازا اور ہمارے دو بچے ہو گئے۔ میری امی سارا دن ان سے کھیلتیں میرے بچوں کو بہت پیار کرتیں۔ بچے بھی اپنی دادی سے بہت مانوس تھے وہ ہر وقت دادی کی گود میں رہتے اور عافیہ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ کہتے ہیں وقت ایک جیسا نہیں رہتا جو انسان اس دنیا میں آیا، ایک دن اس نے واپس بھی جانا ہے۔ تو میری امی بھی اللہ کے پاس چلی گئیں۔ ہم اکیلے ہو گئے۔ میرے بچے اپنی دادی اماں کو بہت یاد کرتے اور روتے رہتے۔ اوپر سے عافیہ پھر امید سے تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔

جب اس کی ڈلیوری میں ایک مہینہ رہ گیا تو ہم نے سوچا کہ وہ اپنے میکے چلی جائے جہاں اس کی دیکھ

PakistaniPoint.com

بھال تو ہوتی رہے گی۔ میرا سسرال دوسرے شہر میں تھا چنانچہ ایک دن میں عافیہ کو اس کے میکے چھوڑ آیا۔ اب میں گھر میں اکیلا ہو گیا تھا، میں نے اپنی ڈیوٹی جاری رکھی۔ کچھ دنوں کے بعد عید آ رہی تھی تو میں نے چھٹی نہیں کی اور ڈبوٹی جاری رکھی اسی بہانے اوور ٹائم کی مد میں پیسے مل جائیں گے۔

جب اس عورت نے بتایا کہ وہ قتل کر کے آئی ہے تو میں ایک دم چونک گیا۔ میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور حیرانی سے میرے منہ سے نکلا۔ قتل..... کس کا قتل؟ اور میں اُس عورت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں، میں نے قتل کیا ہے اپنے ظالم اور بے غیرت شوہر کا''۔ وہ عورت بولی۔ ''میں اللہ کی اس زمین سے ایک فتنے اور برائی کا خاتمہ کر آئی ہوں''۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ وہ تھوڑی دیر روتی رہی اور میں نے اسے رونے دیا کہ اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو جائے۔

جب وہ چپ ہوئی اور اس نے اپنے گالوں سے آنسو صاف کئے تو مجھے اس کے چہرے پر معصومیت نظر آئی، وہ انتہائی دکھی لگ رہی تھی۔ مجھے اس پر بے انتہا ترس آیا حالانکہ وہ ایک انسانی جان کو ختم کر کے آئی تھی۔ میں نے اسے تسلی اور دلاسہ دیا اور کہا تم میری بہن ہو، مجھ پر بھروسہ رکھو۔ جو مدد ہو سکی وہ کروں گا، آرام اور سکون سے مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا اور تم نے اپنے خاوند کو کیوں قتل کیا؟ وہ چند لمحے سوچتی رہی اور ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ الفاظ کا چناؤ کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گویا ہوئی اور کہنے لگی کہ میں شروع سے آپ کو اپنی داستان الم سناتی ہوں۔

''میرا نام نسرین ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ہم بہت غریب تھے، ابا ایک وڈیرے کے ہاری تھے۔ وہ سارا دن وڈیرے کی زمینوں پر کام کرتے، بدلے میں ہمیں سال بھر کی گندم مل جاتی۔ باقی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے میری ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ہمیں رہنے کے لئے وڈیرے نے اپنی زمینوں پر بنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سے ایک گھر دیا ہوا تھا جس میں ہم تین افراد رہتے تھے۔ ہمارا گزارا بڑی مشکل سے ہوتا تھا مگر وقت گزر رہا تھا۔

میں بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی میں آ گئی۔ میں نے اچھا رنگ روپ اور قد کاٹھ نکالا تھا۔ میں ہر وقت گھر میں ہی رہتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں صرف مڈل سکول تھا جہاں میں نے آٹھوں جماعت پاس کی اور پھر گھر میں بیٹھ گئی۔ میری ماں صبح مجھے ناشتہ کروا کر کام پر چلی جاتی اور دوپہر دو بجے وہ واپس گھر آتی۔ ابا شام کو گھر آتے اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ ایک دن میری ماں کام سے واپس آئی تو آتے ہی چارپائی پر گر گئی۔ اسے بہت تیز بخار تھا۔ پورا مہینہ گاؤں کے کمپاؤڈر سے دوا لیتے رہے مگر کوئی فرق نہ پڑا پھر ابا امی کو لے کر شہر چلا گیا اور وہاں داخل کروا دیا۔ علاج کے لئے ابا نے وڈیرے سے پندرہ ہزار روپے قرض لیا تھا۔ امی کا علاج جاری تھا، مرض بہت بگڑ چکا تھا، امی کا بخار نہیں اتر رہا تھا، وہ بہت کمزور اور لاغر ہو گئی تھی اور آخر ایک دن وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ امی کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔

ابا نے جو قرض لیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ ابا پھر وڈیرے کی زمینوں پر کام کے لئے جانے لگے۔ میں سارا دن گھر میں پڑی رہتی۔ میں اب جوان ہو گئی تھی۔ ابا کو میری بہت فکر تھی، وہ میرے لئے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر رہے تھے جو نہیں مل رہا تھا۔ ظاہر ہے ہم

غریبوں کو اچھا رشتہ کہاں سے ملتا۔ جہیز دینے کے لئے میرے ابا کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ادھر وڈیرے نے ابا کو تنگ کیا ہوا تھا کہ وہ قرضے کی رقم واپس کرے۔ ابا بہت پریشان تھے کہ کہاں سے اتنی رقم آئے گی اور کیسے قرضہ ادا ہوگا۔ وڈیرے نے ایک دو دفعہ ابا کی بے عزتی بھی کی مگر ابا بہت مجبور تھے۔

آخر ایک دن وڈیرے نے ابا سے کہا کہ وہ میرا رشتہ اس کے ملازم ارشد عرف اچھو سے کر دیں تو وہ قرضے کی رقم معاف کر سکتا ہے ورنہ وہ اپنا قرضہ سود سمیت وصول کرے گا۔ ارشد عرف اچھو کی عمر اس وقت پچاس سال تھی جبکہ میری عمر پچیس سال تھی۔ ابا نے بہت سوچا مگر وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ ادھر وڈیرے کی دھمکیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ آخر مجبور ہو کر ابا نے ارشد عرف اچھو کا رشتہ قبول کر لیا اور مجھ سے پوچھا تک نہیں اور نہ ہی بتایا۔ اچھو تین چار آدمیوں کے ہمراہ ہمارے گھر آیا، مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا اور ابا نے مجھے اچھو کے ساتھ رخصت کر دیا۔ ابا نے پندرہ ہزار روپے قرضہ کے عوض مجھے بیچ دیا۔

اچھو پہلے سے شادی شدہ تھا، دوسری شادی اس نے عیاشی کے لئے کی تھی۔ بہت ظالم اور بدقماش انسان تھا۔ آج تک اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا، اس کی پہلی بیوی بھی اس سے بہت تنگ تھی۔ شراب اور جوئے کی لت پڑی ہوئی تھی۔ کبھی وہ جوا جیت جاتا اور کبھی ہار جاتا۔ اس نے مجھے ایک الگ گھر میں رکھا تھا، وہ شراب پی لیتا اور مجھے اور میرے باپ کو گندی گندی گالیاں دیتا اور مارتا پیٹتا، وہ مجھ پر تشدد بھی کرتا۔ میں رات اس کے پاؤں اور ٹانگیں دباتی رہتی اور وہ مجھے گالیاں بکتا رہتا۔ گھر میں کبھی کھانے کو کچھ ہوتا اور کبھی نہ ہوتا۔ مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ سال بعد میرے ابا کا انتقال ہوا تو مجھے صرف دو دن وہاں رہنے کی اجازت ملی۔ اس گھر میں میرے ابا کے سوا اور تھا ہی کون۔ دوسرے دن شام کو اچھو مجھے واپس لے گیا۔

پھر وہی مار پیٹ، گالی گلوچ کا سلسلہ چلتا رہا۔ میں تنہائی میں بیٹھ کر بہت روتی اور اللہ سے دعا کرتی کہ وہ میری اس جہنم زدہ زندگی سے مجھے آزاد کر دے اور میرے لئے آسانیاں فرمائے مگر لگتا تھا میری ہر دعا رائیگاں جا رہی ہے۔ میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتی اور ہر نماز کے بعد دعا مانگتی۔

اسی طرح دو سال بیت گئے مگر میری مشکل آسان نہ ہوئی۔ اچھو کل جوئے میں مجھے ہار آیا اور آج عید کے دن جب وہ بندہ مجھے لینے آیا تو اچھو نے مجھ سے کہا کہ مجھے اس بندے کے ساتھ جانا ہوگا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میرے منہ سے انکار سن کر اچھو آگ بگولہ ہو گیا اور گالیاں دینے لگا۔ میں نے کہا میں اس بندے کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ وہ چھری لے کر میری طرف بڑھا اور مجھے چھری مارنے لگا۔ میں ایک دم اپنی جان بچانے کے لئے ایک طرف ہو گئی۔ اس کا وار خالی گیا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ میں نے تیزی سے چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اس کے سینے پر وار کیا۔ وہ ذبح ہوئے بکرے کی طرح ڈکرانے لگا۔ میں نے تین چار وار اس پر کئے جس سے وہ اور تڑپنے لگا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، وہ بندہ جو مجھے لینے آیا تھا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس بندے کی طرف لپکی مگر وہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گیا۔ اچھو درد اور اذیت سے کانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا پڑ گیا، مر گیا۔ میں نے چھری اپنے کپڑوں میں چھپا لی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ میں سارا دن چھپتی چھپاتی رہی اور بھاگتی

رہی۔ آگے ایک نہر آ گئی جس میں میں نے وہ چھری پھینک دی۔ میں پیدل چلتی جا رہی تھی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آگے ریلوے لائن آ گئی اور میں لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑی جلد ہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ چلتے چلتے میری ہمت جواب دے گئی تو میں ایک جگہ پر بیٹھ گئی۔ میں وہاں کافی دیر بیٹھی رہی، مجھے دور سے ٹرین آتی نظر آئی تو میں قریب جھاڑیوں میں چھپ گئی۔ ٹرین میرے پاس آ کر رک گئی اور ہارن بجانے لگی۔ جب ٹرین چلنے لگی تو میں بے اختیار اس پر سوار ہو گئی۔ یہ ہے میری داستان غم۔

میں نے اس کی بات بڑے غور سے سنی اور افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔ تم تو بہت مظلوم ہو، تمہارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ اتنی دیر میں اگلا ریلوے سٹیشن آ گیا جہاں ٹرین دس منٹ رکی رہی اور پھر میں نے چلا دی۔ اس سے اگلے ریلوے سٹیشن میں میرا گھر تھا اور میری ڈیوٹی بھی وہیں تک تھی۔ ٹرین نے آگے جانا تھا مگر میری جگہ اور ڈرائیور نے انجن چلانا تھا۔ میں اپنے شہر پہنچ گیا۔ میں نے نسرین کو ساتھ لیا اور گھر آ گیا۔ میرا گھر خالی تھا۔ میں نے نسرین سے کہا۔ سو جاؤ، وہ بہت تھکی ہوئی تھی اور پچھلے بیس گھنٹوں سے جاگ رہی تھی تو وہ لحاف اوڑھ کر سو گئی۔ دوسرے کمرے میں مَیں بھی سو گیا۔

دن کے گیارہ بجے میں اٹھا نسرین ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے غسل کیا اور ناشتہ لینے بازار چلا گیا۔ میں آدھے گھنٹے کے بعد ناشتہ لے کر گھر آیا تو نسرین بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو، اتنے میں مَیں چائے بنا لیتا ہوں۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ میں نے چائے بنائی اور ناشتہ میز پر رکھ دیا۔ ہم نے ناشتہ کیا، چائے پی پھر میں نے اپنی بیوی کا ایک سوٹ نکال کر اسے دیا اور کہا کہ نہا کر یہ پہن لو۔ اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے۔ فریج میں گوشت رکھا تھا نسرین نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی اور پھر رات کا کھانا پکایا۔

میں سوچ میں گم تھا کہ اب نسرین کا کیا ہو گا۔ اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا تھا، بُرا بھلا جیسا بھی تھا مگر تھا تو اس کا خاوند۔ اس نے ایک انسان کا قتل کیا تھا، وہ قانون کی مجرم تھی، سزا تو اسے ہر حال میں ملنی تھی۔ میں نے بھی اسے اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی تھی جو کہ غلط تھا، قانون مجھے بھی پکڑ سکتا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر نسرین نے پوچھا۔ بھائی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ تو میں نے اسے بتایا کہ اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ کیا بنے گا۔ رات کا کھانا ہم نے کھایا تو وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ یکلخت مجھے اپنے دوست کا خیال آیا جو ریلوے پولیس میں انسپکٹر ہے اور ہمارے ریلوے سٹیشن کی پولیس چوکی کا انچارج ہے۔ اگلے دن میری ریسٹ تھی چنانچہ میں ناشتہ کر کے ریلوے پولیس چوکی گیا اور اپنے دوست پولیس انسپکٹر ناصر سے ملا اور اس سے نسرین کے کیس کی بات کی، وہ میرے ساتھ گھر آ گیا۔

نسرین اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی مگر ہم نے اسے تسلی دی اور ناصر نے کہا۔ وہ دوبارہ اپنی داستان سنائے۔

"آپ سے بہت زیادتی ہوئی ہے"۔ ساری بات سننے کے بعد ناصر نے کہا۔ "مگر آپ قانون کی نظروں میں مجرم ہیں"۔

"یار! دیکھو میں نے نسرین کو بہن کہا ہے اور یہ میری بہن ہے"۔ میں نے ناصر سے کہا۔ "تو پلیز، تم متعلقہ پولیس سٹیشن کے ایس ایچ او سے کہو کہ ہر حال

میں نسرین کی مدد کرنی ہے۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں"۔

"سب سے پہلے تو نسرین کو متعلقہ پولیس سٹیشن میں پیش ہو کر اپنی گرفتاری دینی ہو گی"۔ "ناصر نے کہا۔" اس کے بعد پولیس کی تفتیش ہو گی اور کیس عدالت میں جائے گا اور اس کیس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ بہرحال میں متعلقہ ایس ایچ او سے کہہ دوں گا کہ وہ جس حد تک ہو سکے گا نسرین کی مدد کرے گا۔ وہ میرا کولیگ بھی ہے اور دوست بھی تو بہتر یہی ہے کہ نسرین اپنی گرفتاری دے دے ورنہ تمہیں بھی اعانتِ جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا"۔

ہم نے نسرین سے بات کی اور اسے سمجھایا کہ اب اس کے لئے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

"دیکھ نسرین! تمہارا اب اس دنیا میں کوئی نہیں ہے"۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم ماری ماری کہاں بھاگتی رہو گی۔ بہتر یہی ہے گرفتاری دے دو۔ میں اپنے دوست ایس ایچ او کو کہہ دوں گا کہ وہ ہر حال میں تمہاری مدد کرے اور تمہاری عزت بھی محفوظ رہے"۔

ہمارے سمجھانے سے نسرین مان گئی اور ناصر نے متعلقہ پولیس سٹیشن کال کر دی۔ شام کو سول ڈریس میں پولیس جپسی کے ساتھ لیڈیز پولیس بھی تھی، وہ ریلوے پولیس چوکی آ گئے اور چپکے سے نسرین کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اگلے دن سے میری ڈیوٹی پھر شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں اپنے سسرال بھی گیا اور نسرین والے سارے واقعے کی روداد اپنی بیوی کو سنائی، وہ بھی بہت افسوس کر رہی تھی اور اس نے بھی دعا کی کہ اللہ اس کی مدد فرمائے۔ پولیس نے اپنی تفتیش شروع کر دی۔ وہ ارشد عرف اچھو کی پہلی بیوی سے ملے، اس نے پولیس کو بتایا کہ اچھو ایک بدقماش آدمی تھا، وہ وڈیرے کے کہنے پر ہر برا کام کرتا تھا اور وڈیرے سے پیسے لیتا تھا۔ اس نے نسرین سے شادی بھی وڈیرے کے کہنے پر کی اور ہر طرح کا ظلم نسرین پر کیا۔ بلکہ پورے علاقے کے لوگوں نے ارشد عرف اچھو کے مجرمانہ کردار کی گواہی دی۔

پولیس نے وڈیرے کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا اور اسے باقاعدہ گرفتار کر لیا۔ وڈیرا بہت اثر و رسوخ والا آدمی تھا، اس نے بہت ہاتھ پیر مارے اور اعلیٰ حکام سے ایس ایچ او پر کافی دباؤ ڈالا مگر ایس ایچ او ایک قابل اور دیانت دار پولیس آفیسر تھا، اس نے اپنے اعلیٰ حکام کو ساری صورتِ حال بتائی اور کہا کہ علاقے میں تمام برائی کی جڑ وڈیرا ہے، اسی کی ایما پر بہت سے جرائم ہو رہے ہیں۔ وہ شراب اور منشیات کا کاروبار کرتا ہے اور جوا خانہ بھی چلاتا ہے اور غریبوں پر ظلم کرتا ہے۔ وہ وڈیرے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اعلیٰ حکام نے ایس ایچ او کو اجازت دے دی کہ وہ جلد از جلد اس کیس کی تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دے۔ پولیس نے اس بندے کو بھی گرفتار کر لیا جس نے جوئے میں نسرین کو جیتا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا تھا۔ وہ ارشد عرف اچھو کے قتل کا چشم دید گواہ تھا۔ پولیس نے نسرین کا تفصیلی بیان لیا اور اس پہ لکھا کہ واقعی نسرین کے ساتھ بہت ظلم اور زیادتی ہوئی تھی۔ ارشد عرف اچھو چھری لے کر نسرین کو مارنے کے لئے آگے بڑھا تو نسرین نے اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے ارشد عرف اچھو کو قتل کیا۔ نسرین ایک باحیا اور پاکدامن عورت ہے، وہ ایسا نہیں چاہتی تھی مگر حالات سے مجبور ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا۔

پولیس نے بیس روز تک اپنی تفتیش کی اور کیس مکمل کر کے چالان سیشن جج کی عدالت میں پیش کر

Pakistanipoint.com

دیا۔ ریلوے پولیس چوکی کے انچارج ناصر کا ایک دوست وکیل تھا، ناصر نے اپنے وکیل دوست سے کہا کہ اس کیس کی پیروی کرنی ہے اور بلا معاوضہ ایک مظلوم عورت کی مدد کرنی ہے۔تو اس وکیل نے نسرین کا کیس لے لیا اور پیروی شروع کر دی۔ ایس ایچ او نے وڈیرے کے خلاف بڑا مضبوط کیس بنایا تھا اور سارے ثبوت اس کے خلاف عدالت میں پیش کیے۔ وڈیرے نے بھی بڑا تگڑا وکیل کیا تھا۔ وکیلوں کی خوب بحث ہوئی اور گواہ بھی عدالت میں پیش ہوئے۔ گواہوں پر جرح بھی ہوئی۔

پولیس ہر تاریخ پر نسرین کو جیل سے عدالت پیش کرتی۔نسرین نے عدالت میں اپنا اعترافی بیان دیا اور قبول کیا کہ وہ ارشد عرف اچھو کو قتل نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اپنی عزت اور زندگی بچانے کے لئے اس نے ایسا کیا لیکن اس کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ باقی سارا کیس بھی وڈیرے کے خلاف جا رہا تھا۔ پولیس نے بڑے ٹھوس اور پکے ثبوت عدالت میں پیش کیے۔تقریباً آٹھ ماہ یہ کیس عدالت میں چلتا رہا جب تمام گواہیاں، ثبوت اور وکیلوں کی جرح مکمل ہوگئی تو عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا جس کے مطابق نسرین کو سات سال قید، وڈیرے کو پانچ سال قید اور اس بندے کو جس نے جوئے میں نسرین کو جیتا تھا تین سال قید کی سزا ہوئی۔ تمام مجرمان کو جیل بھیج دیا گیا۔

اسی دوران اللہ نے ہمیں بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ عافیہ اپنے گھر آ چکی تھی، میں وقتاً فوقتاً نسرین کو ملنے جیل چلا جاتا اور اسے تسلی حوصلہ دیتا اور اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دے آتا۔ عافیہ کا ایک بڑا بھائی تھا جو بینک میں افسر تھا، اس کی شادی ہو چکی تھی۔ سات سال ہو گئے تھے شادی کو مگر ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ بہت علاج معالجہ کروایا، دم درود کروایا اور آخر اللہ نے اس کی سن لی اور اس کی بیوی امید سے ہو گئی۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا، اس کی بیوی کا بہت خیال رکھا جاتا۔

جب میری بیوی کی بھابی کا زچگی کا وقت آیا تو کیس میں پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ اسے فوراً بڑے ہسپتال لے کر گئے جہاں اس نے بڑے آپریشن کے ذریعے ایک بیٹے کو جنم دیا مگر خود زندگی کی بازی ہار گئی۔ ڈاکٹرز نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر اللہ کی مرضی کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔

نسرین نے جیل میں پڑھنا شروع کر دی اور میٹرک کا امتحان پاس کر لیا پھر ایف اے کی تیاری شروع کر دی اور امتحان دے دیا۔ اس نے بڑے شاندار نمبروں سے ایف اے کر لیا۔

نسرین کے اچھے طرز عمل اور شرافت کی وجہ سے اس کی سزا میں کمی ہوگئی۔ ویسے بھی جیل میں دن رات کے حساب سے سال کی سزا چھ ماہ ہوتی ہے اور پھر ایک دن نسرین کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ میں اسے لینے کے لئے گیا اور اپنے گھر لے آیا۔نسرین میری بیوی عافیہ سے ملی، ہم سب نے اسے خوش آمدید کہا۔ پھر بزرگوں سے صلاح مشورے اور نسرین کی اجازت سے ایک شام اس کا نکاح میری بیوی کے بھائی سے ہو گیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ نسرین نے جاتے ہی اپنے خاوند کے معصوم بچے کو سنبھال لیا۔نسرین سارا دن گھر کا کام کرتی ہے۔ ہر رشتے کا احترام کرتی ہے۔ سب اس سے بہت خوش ہیں۔ اب نسرین کے دو بچے ہیں اور میری بہت ممنون و مشکور ہے۔ میں نے نسرین کو سچے دل سے بہن بولا تھا اب وہ میری بہن اور بھابی ہے۔ میں نے اپنا قول نبھایا ہے۔

❀❀❀

چار دیواری کی دنیا

ماں کے احسانات تو اولاد پر ایسے گراں بار ہوتے ہیں کہ وہ مرتے دم تک ان کا بدلہ نہیں دے سکتی

ماں پھر ماں ہے

☆ فرزانہ گلہت

آنکھوں میں حسرت و یاس، مظلومیت و بے بسی کا امتزاج، چہرے پر دکھ و کرب کے تاثرات، سادہ سا لباس، معمولی سے جوتے، سر پر ہمہ وقت موٹا سا دوپٹہ، ہاتھ میں ہر دم تسبیح، پچھتر سال عمر، گھٹنوں میں درد اور سوجن کے سبب چلنا پھرنا دشوار، دکھتی کمر، دکھتے کندھے، کام کرنا محال، ہونٹوں پر نہ حرفِ شکوہ نہ شکایت بلکہ مہرِ سکوت۔ کسی نے بات کر لی تو جواب دے دیا۔ کسی کے معاملے میں کوئی لب کشائی نہیں کوئی دخل نہیں۔ جو کچھ کھانے کو مل گیا کھا لیا۔ جو کچھ پہننے کو مل گیا پہن لیا۔ کوئی اعتراض نہیں کوئی حجت نہیں۔ یہ تھیں چچی جمیلہ۔

ان کی یہ حالت کیونکر بنی؟ انہیں اس حالت کو پہنچانے والے کون لوگ تھے؟ یہ ایک نہایت افسوس ناک بلکہ عبرت ناک کہانی ہے۔

چچی جمیلہ ہمارے ایک دور دراز کے رشتہ دار چچا عبدالقیوم کی بیوی تھیں۔ چچا عبدالقیوم کے والد مرزا عبدالرحیم تقسیم سے پہلے بارہ مولہ کشمیر میں رہا کرتے تھے۔ جہاں ان کا لکڑی کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ جہاں کرشن نگر میں انہیں بڑا وسیع و عریض مکان مع پانچ دکانیں الاٹ ہو گیا اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ اس میں بس گئے۔ ان کے دو چھوٹے بیٹے تقسیم سے پہلے ہی میرپور میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ دو شادی شدہ بیٹیاں بھی وہیں رہ رہی تھیں۔ لاہور آ کر مرزا صاحب اپنے لکڑی کے کاروبار کی طرف متوجہ ہو گئے جو آہستہ آہستہ چل پڑا اور انہیں معقول آمدن دینے لگا۔

مرزا صاحب کے سب سے بڑے بیٹے مرزا عبدالقیوم ایک معروف اور کامیاب وکیل تھے۔ جن کی وکالت خوب چل رہی تھی۔ ان کی خوب کمائی تھی۔ اس زمانے میں جب کسی کسی کے پاس ہی موٹر کار ہوا کرتی تھی انہوں نے دو دو موٹر کاریں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاس ہی رہتے تھے۔ چچی جمیلہ انہی کی بیوی تھیں۔ وہ مرزا صاحب کی چھوٹی بہن کی دختر تھیں جو ایبٹ آباد میں رہتی تھیں۔ وہ حسین و طرحدار بھی تھیں، چالاک و ہوشیار بھی۔ انہوں نے کچھ تعلیم بھی پا رکھی تھی اور امورِ خانہ داری میں خوب طاق بھی تھیں۔ چونکہ چچا قیوم مرزا صاحب کی سب سے بڑی اولاد تھے اور سب

سے اچھا نباہتے تھے۔ اس لئے ان کا گھر میں خوب رعب داب تھا۔ اس سبب چچی جمیلہ کو بھی سب پر رعب جمانے اور حکومت کرنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اپنی حیثیت کے احساس نے ان میں بے حد غرور و تکبر اور رعونت بھر دی تھی۔ سب کو دبا کر رکھنے کی عادت نے ان میں چھوٹے بڑے کا لحاظ ختم کر رکھا تھا۔ وہ نہ اپنے سے عمر میں بڑی نندوں کا لحاظ کرتیں۔ نہ ساس بی جی کا۔ بی جی نیک فطرت، متحمل مزاج اللہ والی عورت تھیں۔ وہ نہ مرزا صاحب سے کچھ کہتی تھیں نہ چچا قیوم سے کبھی بیوی کی شکایت کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ بھی گھر کے مردوں سے چچی جمیلہ کی کوئی بات نہ کیا کریں۔ یوں ان کی اس حکمت عملی کی وجہ سے گھر کی فضا مکدر ہونے سے بچی ہوئی تھی۔

چچی جمیلہ امور خانہ داری میں خوب طاق تھیں لیکن گھر کے کاموں کو ہاتھ لگانا قسم تھا۔ کچن میں تو وہ بھول کر بھی نہ جھانکتی تھیں۔ وہ ہر دم خوب بنی سنوری رہتیں۔ ملنا ملانا، بازاروں کے چکر لگانا، شاپنگ کرنا ان کے بہترین مشاغل تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے جن کی دیکھ بھال شروع ہی سے بی جی کرتی آئی تھیں یا پھوٹی قسمت شاہینہ جو غیر شادی شدہ تھی۔ انہیں اگر کوئی کام کرنا پڑ جاتا تو بے حد ناک بھوں چڑھاتیں۔ بڑبڑاتیں، مارے باندھے کرتیں۔ شاہینہ خوب صورت تھی اور خوب سیرت بھی۔ وہ چچی جمیلہ کی بے حد عزت کرتی، ان کی خدمتیں کرتی لیکن وہ اس بے چاری سے خواہ مخواہ خار کھائے رہتیں۔ اسے معمولی معمولی باتوں پر ڈانٹتیں، جھڑکتیں، گالیاں دیتیں، پٹائی بھی کر دیتیں۔ وہ بیچاری خاموشی سے گھٹ کر رہ جاتی۔

چچا قیوم کی جو بہنیں میرپور میں رہتی تھیں۔ ماں باپ اور بہن بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر جب کبھی لاہور آتیں تو چچی جمیلہ ان کی آمد پر بے حد ناک بھوں چڑھاتیں۔ وہ نہ ان کے پاس بیٹھتیں نہ باتیں کرتیں۔ باتیں کرتیں بھی تو طعن آمیز، جلی کٹی، طنزیہ و تمسخرانہ۔ یہی رویہ ان کا اپنی دیورانیوں کے ساتھ تھا۔ اس لئے وہ زیادہ دیر وہاں نہ رہ پاتیں اور فوراً ہی واپس چلی جاتیں۔ اپنے بہن بھائیوں، سہیلیوں، رشتہ داروں کے ساتھ ان کا رویہ البتہ خوب خوش مزاجی، مٹھاس اور گرمجوشی سے بھرپور ہوتا۔ ان کی وہ خوب مہمان داری کرتیں۔ ان سے خوب ہنسی مذاق کرتیں۔ جب کبھی اپنے میکے ایبٹ آباد جاتیں تو اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے لئے خوب صندوق بھر بھر کر تحفے لے جاتیں۔ وہ لوگ جب ان سے ملنے لاہور آتے تو یہ ان کی بھرپور خاطر مدارات کرتیں۔ آئے دن ان کی دعوتیں ہوتیں۔ سیر و تفریح ہوتی۔ وہ لوگ بھی بے چاری بی جی کو خاطر میں نہ لاتے۔ شاہینہ بے چاری تو ان مواقع پر باقاعدہ نوکرانی بنائی جاتی۔ چچی جمیلہ اپنے میکے والوں کے سامنے بھی بی جی اور شاہینہ کی تضحیک و تحقیر سے باز نہ آتیں اور وہ بے چاریاں صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ پھر مرزا صاحب انتقال کر گئے۔ چچی جمیلہ کے ماں باپ بھی آگے پیچھے انتقال کر گئے۔ ان کے بھائی برطانیہ جا کر آباد ہو گئے۔ بہن مفلوج ہو کر بستر پر پڑ گئی۔ چچی جمیلہ کی شروع ہی سے اپنی بہن کی بیٹی سے اپنے بڑے بیٹے عزیر کی شادی کی خواہش تھی۔ چچا قیوم کو بھی یہ رشتہ پسند تھا۔ چنانچہ جونہی عزیر کو فوج میں کمیشن ملا وہ اپنی اس بھانجی نازیہ کو دھوم دھام سے بیاہ لائیں۔

جب تک نازیہ بھانجی تھی انہیں عزیز رہی۔ پھر جب وہ بہو بن گئی تو گویا ان کے لئے غیر ہو گئی۔ انہوں نے اس پر بھی رعب ڈالنا، سختی سے پیش آنا اور اسے دبا کر رکھنا شروع کر دیا۔ اپنی اس بے حد محبت کرنے اور جان چھڑکنے والی خالہ کی اس کایا پلٹ پر بے چاری نازیہ

حیران و پریشان رہ گئی۔ وہ ان سے بے حد ڈرنے لگی اور ان سے دور ہی دور رہنے لگی۔ اس کی شکایت پر جب عزیر نے انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرا دیا۔ روز روز کی دانتا کل کل سے تنگ آ کر اس نے اپنی ٹرانسفر کوئٹہ جیسی دور افتادہ جگہ پر کروالی۔ وہ جب کبھی چھٹی پر لاہور آتے تو نازیہ پھر چچی جمیلہ کے ''حسن سلوک'' کا نشانہ بننے لگتی۔ اس پر عزیر کو چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی کوئٹہ واپس چلے جانا پڑتا۔

شاہینہ کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بڑی بیٹی ماہین بی اے کر چکی تھی۔ وہ حسین بھی تھی خوب سیرت بھی۔ چچا قیوم کی دلی تمنا تھی کہ اس کی شادی ان کے دوسرے بیٹے عمیر سے ہو جائے۔ جو ایک ہوشیار اور کامیاب وکیل بن چکا تھا۔ چچی جمیلہ کو اپنی اس نند سے سدا بیر رہا تھا۔ وہ ہرگز اس رشتے پر راضی نہیں تھیں۔ مگر چچا قیوم کے سامنے ان کی ایک نہ چل سکی اور ماہین عمیر کی دلہن بن کر ان کے گھر آ گئی اور دن رات چچی جمیلہ کے ''حسن سلوک'' کا نشانہ بننے لگی۔ وہ اس سے ہر ممکن ناروا سلوک کرتیں۔ ان کے ہر کام میں کیڑے نکالتیں۔ اس کی تحقیر و تذلیل کرتیں۔ زہریلی زبان سے اس کا دل جلاتیں۔ وہ بے چاری اپنی ماں کی طرح ہی تھی جو صبر کے گھونٹ پی کر خاموش ہی رہتی۔ بی جی یہ سب کچھ دیکھتیں۔ اس سے ہمدردی کرتیں اور وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ وہ بھی اپنی جگہ مجبور اور بے بس تھیں رہے چچا قیوم تو انہیں گھر کے حالات کی کوئی خبر ہی نہیں تھی، وہ اپنی وکالت میں مگن تھے۔

پھر عمیر سے چھوٹے زبیر کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ ایک انشورنس کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی شادی چچی جمیلہ نے محلے کی ایک لڑکی سے کی تھی۔ حمیرا نامی یہ لڑکی یتیم و یسیر تھی۔ اس کی پرورش تعلیم و تربیت اس کے چچا اور چچی نے کی تھی۔ یہ حسین بھی تھی اور اچھے اطوار و طراق کی مالک بھی۔ زبیر بھی اس کے ساتھ بے حد خوش تھا۔ چچی جمیلہ نے کچھ عرصہ تک تو حمیرا کو کچھ نہ کہا۔ پھر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اپنی پرانی روش پر لوٹ آئیں۔ یعنی اسے بھی اپنے ''حسن سلوک'' سے نوازنے اور اس کا جینا حرام کرنے لگیں۔ اپنی جیٹھانیوں کی طرح وہ بھی صبر کے گھونٹ پیتے ہوئے ان کے جور و ستم کی چکی میں پسنے لگی اور وہ کرتی بھی کیا۔ اس کے چچا چچی اس کے فریضہ سے سبکدوش ہونے کے بعد برطانیہ جا کر آباد ہو چکے تھے۔ یوں وہ تنہا رہ گئی تھی۔ وہ چپکے چپکے رو کر دل کا غبار نکال لیتی تھی اور کسی سے شکایت نہ کرتی تھی۔ بی جی بھی یہ دیکھتی تھیں زبیر بھی۔ لیکن وہ دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور تھے۔ کچھ نہ کر سکتے تھے۔

بی جی اب بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ وہ اب زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی تھیں اور تسبیح عبادات میں مصروف، تینوں پوتوں کی بیویاں ان کا ہر ممکن خیال رکھتیں۔ ان کی خدمتیں کرتیں لیکن اب شاید ان کا وقت پورا ہو چکا تھا، ایک رات وہ سوئیں تو پھر نہ جاگیں۔

بی جی جیسی فرشتہ سیرت مجسمہ شفقت و محبت کی موت کا خاندان میں سب کو ہی بے حد صدمہ اور ملال ہوا۔ ان کی بیٹیوں نے تو ان کا بے حد غم کیا۔ بیٹے اور دوسری بہوئیں اپنی جگہ الگ مغموم اور دکھی ہوئے لیکن چچی جمیلہ کو کوئی فرق نہ پڑا۔ ساس کی موت پر دکھاوے کے آنسو بہانے تو درکنار وہ ذرا بھی دکھی اور مغموم نہ دکھائی دیں۔

چچا قیوم اور چچی جمیلہ کے آخری بیٹے عمران کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ ایک میڈیسن کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی شادی چچی جمیلہ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کی بیٹی سے کی تھی۔ جو حسین ہونے کے ساتھ ہی خوب تیز و طرار بھی تھی۔ اس کا چچی جمیلہ سے بالکل نبھاؤ نہ ہو

Pakistanipoint.com

سکا۔ نتیجتاً گھر کی فضا آئے دن کے لڑائی جھگڑوں سے مکدر رہنے لگی۔ بے چارہ ضرار ماں اور بیوی کے درمیان پسنے لگا۔ وہ بیوی کو سمجھاتا بجھاتا، ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔ ماں سے صبر وتحمل سے کام لینے کی التجائیں کرتا مگر بے سود۔ برے گھریلو ماحول نے اس پر نفسیاتی طور پر بد اثر ڈالنا شروع کیا۔ اس کے مزاج میں غصہ اور چڑچڑاہٹ پیدا ہونے لگی۔ گھر کا ماحول بگڑتا ہی چلا گیا۔ انہی حالات میں چچا قیوم اچانک ہی ہارٹ فیل ہونے سے انتقال کر گئے۔

چچا قیوم کی موت کے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی جس کا کسی کو سان وگمان تک نہ تھا۔ ان کے چالیسویں کے بعد ضرار اپنی بیوی کے ساتھ برطانیہ سدھار گیا اور وہاں کی شہریت لے کر وہیں ملازمت کرنے لگا۔ اس نے بھائیوں کے ساتھ تو روابط رکھے لیکن ماں کو تو گویا بھول ہی گیا۔

اب چچی جمیلہ کے بُرے دن آ گئے۔ گویا مکافاتِ عمل کی چکی چلنی شروع ہوگئی۔ چچا قیوم کے انتقال کے بعد مرزا صاحب کا وہ وسیع وعریض مکان اور دُکانیں فروخت ہوگئیں۔ سب بیٹے بیٹیوں کو اپنے شرعی حصے مل گئے۔ چچا قیوم کا حصہ ان کے بیٹوں اور چچی جمیلہ میں تقسیم ہوگیا۔ ان کے تینوں بیٹوں نے شہر کے باہر نئی رہائشی کالونی میں اپنے اپنے مکان خرید لئے۔ چچی جمیلہ اپنے بڑے بیٹے عزیز کے پاس رہنے لگیں جو فوج سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ ان کا خیال تھا اب بھی ان کا اپنی بہوؤں پر پہلے کی طرح رعب داب اور حکومت ہوگی۔ وہ پہلے کی طرح ان کے سامنے بھیگی بلی بنی رہیں گی لیکن ان کی حیرت اور بے یقینی کی انتہا نہ رہی۔ جب ان کی سگی بھانجی نے ان کے سامنے اپنی پرانی کینچلی اتار پھینکی اور ان کے رعب میں آنے کی بجائے ان کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی اور انہیں ہر بات پر تڑتڑ جواب دینے اور ان سے زبان درازی کرنے لگی۔ وہ جب عزیز سے اس کی شکایت کرتیں تو وہ الٹا اپنی بیوی کی طرف داری کرتا اور انہیں قصوروار قرار دیتا۔ اس کے بچے بھی دادی کا کوئی ادب ولحاظ نہ کرتے نہ ان کے قریب پھٹکتے۔

وہ کچھ عرصہ تو یہ سب کچھ سہتی رہیں پھر تنگ آ کر عمیر کے گھر چلی گئیں۔ اس کی معصوم ومسکین سی بیوی ماہین بھی اب یکسر بدل چکی تھی۔ اس نے ان کی اپنے گھر آمد پر کھلم کھلا ناک بھوں چڑھائی۔ وہ انہیں ماضی کے رویے کے حوالے سے طعنے دیتی۔ ان سے گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آتی۔ زبان درازی کرتی۔ اس کے بچے بھی ان کے پاس نہ آتے۔ انہیں کچھ نہ سمجھتے۔ عمیر بھی ان کے پاس کم ہی بیٹھتا۔ ان کے شکوؤں شکایتوں پر کان نہ دھرتا۔ بیوی کی ہی طرف داریاں کرتا۔ انہیں جھڑک تک دیتا۔ اس پر وہ جلتی کڑھتی آنسو بہاتی زبیر کے گھر چلی گئیں۔ اس کی سیدھی سادی بھیگی بلی سی بیوی بھی اب یکسر بدل چکی تھی۔ اس نے بھی ان کے اپنے گھر آنے پر بے حد ناک بھوں چڑھائی۔ نہایت گستاخی اور بدلحاظی سے پیش آئی۔ ماضی کے سلوک کے حوالے سے انہیں خوب طعنے دیئے خوب تذلیل وتحقیر کی۔ زبیر نے بھی ان کا کوئی لحاظ وخیال نہ کیا۔ نہ ہی ان کے بچوں نے انہیں منہ لگایا۔

حیران و پریشان سخت دکھی اور مغموم وہ پھر عزیز کے گھر چلی گئیں۔ وہاں دو تین دن گویا جہنم میں گزارنے کے بعد پھر عمیر کے گھر آ گئیں۔ وہاں چند دن سے زیادہ نہ ٹک سکیں تو پھر زبیر کے گھر چلی گئیں۔ وہاں سے پھر عزیز کے..... غرضیکہ وہ اب بیٹوں کے گھروں کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گئیں۔ ان کی زندگی ایک مسافر کی زندگی بن کر رہ گئی۔ کسی بیٹے کے گھر ان کی مستقلاً کوئی جگہ نہ رہی۔ ان کا رعب داب، تکبر، تفاخر اور حکومتی طنطنہ

سب ختم ہو گئے۔ ان میں اتنی ہمت نہ رہی کہ اپنی کسی بہو کو دو بدو جواب دے سکتیں۔ بیٹوں سے اپنے حقوق کی بات کر سکتیں۔ وہ مظلومیت اور بے بسی کی تصویر بن گئیں۔ انہوں نے اب کسی سے کچھ کہنا سننا بھی چھوڑ دیا۔ وہ جس بیٹے کے گھر جاتیں اپنے کمرے تک محدود رہتیں۔ عبادات اور تسبیح ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ سوائے ضروری باتوں کے کوئی بات نہ کرتیں۔ کوئی ان کی طرف توجہ نہ دیتا نہ حال احوال پوچھتا۔ بیٹے بھی ماں سے دور ہی دور رہتے۔ اپنی نندوں کو وہ پہلے ہی دشمن بنا چکی تھیں۔ انہیں اب بھلا ان سے کیا لینا دینا تھا؟ دیورانیاں بھی ان سے کنارہ کر چکی تھیں۔ ان کے میکے میں بھی اب کوئی باقی نہ رہا تھا۔ بھائیوں بہنوں کی اولادیں باہر کے ملکوں میں جا کر آباد ہو چکی تھیں۔ یوں وہ گویا بالکل تنہا رہ گئی تھیں اور بخوبی سمجھ رہی تھیں کہ یہ سب انہی کا قصور تھا۔

انہوں نے اپنے ''زمانۂ حکومت'' میں دوسروں کے ساتھ جو سلوک کیا اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کیا۔ سب پر دھونس جمانے اپنے رعب میں رکھنے کے شوق نے انہیں یہ تلخ حقیقت بھلائے رکھی کہ ان کا یہ رعب و حکومت وطنطنہ ان کے شوہر کی زندگی تک ہی محدود تھا۔ ان کے لحاظ سے ہی ان کے بیٹے بہوئیں اور سسرالی ان سے دب کر رہتے اور ان کے سامنے سر جھکائے رکھتے تھے۔ اگر وہ نہ رہیں گے تو ان کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟ سب ضرور ان سے ان کی ماضی کی زیادتیوں کا بدلہ لیں گے۔ دوسروں کی بات الگ تھی۔ دکھ تو ان کے بیٹوں کے ان کے ساتھ رویے کو لے کر ہوتا تھا جن کی وہ ماں تھیں۔ جن کی جنت ان کے قدموں تلے تھی۔ ماں کے احسانات تو اولاد پر ایسے گراں ہوتے ہیں کہ وہ مرتے دم تک ان کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ ماں کی خوشی اس کی دعائیں اولاد کو جنت میں لے جانے والی چیز ہیں اور اس کی ناراضی اور بددعائیں دوزخ کی آگ اس کا مقدر بنانے والی۔ اللہ تعالیٰ ماں کی نافرمانی اور سرکشی سے سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

یہاں علقمہ صحابی کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ جن کی زبان پر مرتے وقت کلمۂ شہادت اس لئے جاری نہ ہو رہا تھا کہ وہ ماں کے سخت نافرمان اور بیوی کے تابع فرمان تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر ان کے لئے آگ کا الاؤ جلایا گیا اور ماں سے پوچھا گیا کہ انہیں اس آگ میں جلا دیا جائے یا وہ یہ پسند کریں گی کہ ان کا بیٹا دوزخ کی آگ میں جلے۔ اس پر ماں نے علقمہ کو معاف کر دیا اور ان کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری ہو گیا اور موت آسان ہوئی۔

قرآن پاک میں جا بجا اللہ کا حکم ہے کہ ماں باپ کی خدمت اور اطاعت گزاری کرو۔ انہیں ''اُف'' بھی نہ کہو۔ اور حدیث پاک ہے کہ ماں باپ چاہے کتنا ہی ظلم کریں ان کی اطاعت گزاری اور ادب و احترام میں کمی نہ آنے دو۔

چچی جمیلہ جیسی بھی تھیں اپنے بیٹوں کی ماں تھیں۔ ان کے بیٹوں کا ہر حال میں فرض بنتا تھا کہ وہ ان کی عزت کرتے احترام کرتے ان کی خدمت کرتے فرمانبردار بن کر رہتے کہ ان کے قدموں تلے ان کی جنت تھی۔ مگر افسوس انہوں نے اللہ رسولؐ کے احکامات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی ان کی رُوگردانی کی۔ اس طرح اپنے ناخلف اور بے نصیب ہونے کا ثبوت دیا۔ دعا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہدایت یاب ہوں۔ اپنی ماں کے مرتبے کو سمجھیں۔ اسے اس کا مقام دیں۔ یہی ان کی اخروی نجات کی راہ ہے۔

Pakistanipoint.com

خاکہ

کتابی کیڑا

انہوں نے سائنس رکھی اور لائبریری میں رکھی اردو اَدب کی تمام کتب کو چاٹ ڈالا

☆ایک کالج فیلو کے قلم سے

میری اور خادم حسین مجاہد کی ملاقات کالج میں ہوئی جہاں ہم نے گیارہویں میں پری انجینئرنگ گروپ میں اکٹھے داخلہ لیا۔ ہمارا رول نمبر ساتھ ساتھ تھا اس لئے دو سال کے لئے جیسے ہمارا نکاح ہو گیا۔ سوائے بریک اور خالی پیریڈ کے ہمیں اکٹھے ہی بیٹھنا ہوتا تھا۔ ان میں بھی یہ مجھے گھسیٹ گھساٹ کے لائبریری لے جاتے حالاں کہ مجھے کتابوں سے زیادہ چائے سموسوں سے دلچسپی ہوتی تھی اس لئے میری کوشش ہوتی تھی کہ میں ان کو کینٹین لے جاؤں۔ اب اصل مسئلہ یہ تھا کہ لائبریری کینٹین کے راستے میں تھی اس لئے اکثر یہی کامیاب ہوتے۔ البتہ مجھے تسلی دینے کے لئے کہتے پہلے لائبریری سے کچھ کتابیں دیکھ لیں پھر کینٹین چلیں گے لیکن یہ کینٹین والا وعدہ کم ہی پورا ہوتا۔ یہ سارا وقت ریڈنگ روم میں کتابیں رسالے دیکھ دیکھ ضائع کر دیتے جب میں بوریت کی آخری حد تک پہنچ جاتا تو مجھے لطیفے سنانا شروع کر دیتے۔ میں ان کی بات ماننے پر اس لئے مجبور تھا کہ مجھے ان سے نوٹس لینے ہوتے تھے اور امتحان میں بھی ایمرجنسی کی صورت میں مدد کا وعدہ کر رکھا تھا انہوں نے۔

کالج میں بزمِ ادب کی طرف سے ہر جمعے کو ایک گھنٹے کا ٹیوٹوریل پیریڈ ہوتا تھا جس کو یہی کنڈکٹ کرتے تھے اس میں شرکت لازمی تھی ورنہ جرمانہ ہو جاتا۔ اگر جرمانے والا سلسلہ نہ ہوتا تو میں کبھی اس پیریڈ میں شریک نہ ہوتا۔ بھانت بھانت کی شاعری لطیفے اور تقاریر سننے کو ملتیں اور جب وہ گھنٹہ ختم ہوتا تو میں شکر کا کلمہ پڑھتا جبکہ یہ پریشان ہو جاتے کہ اب اگلے جمعے تک کسی کو کچھ نہیں سنا سکیں گے۔ اس گروپ کے الیکشن بھی ہوتے تھے جس کو یہ کبھی جیت نہ سکے کیونکہ ہم کارکردگی پر یقین رکھتے تھے جبکہ ووٹ دینے والے

خوشامد سے پگھل جاتے تھے اور خوشامد کرنے کی صلاحیت سے یہ محروم تھے پروگرام پھر بھی یہی چلاتے کہ ان کو شوق تھا اور عہدے داروں کے پاس خوشامد کرنے کے علاوہ کوئی صلاحیت تھی ہی نہیں لیکن جب چوتھے سال بھی ان کے حق میں صرف میرا جنبوری والا ووٹ پڑا (اگر مجھے لالچ نہ ہوتا تو شاید وہ بھی نہ پڑتا) تو گروپ سے ناراض ہو گئے اور کنارہ کشی اختیار کر لی ان کی عدم موجودگی میں پروگرام بے رنگ ہو گیا لیکن انچارج صاحب نے ان کی سابقہ کارکردگی کی بنا پر کبھی ان کی غیر حاضری نہیں لگائی تا کہ ان کو جرمانہ نہ ہو۔ وہ اکثر شرکا سے کہتے کہ آپ نے زیادتی کی انہوں نے ان کو منانے کی کوشش بھی کی مگر یہ نہیں مانے۔ ان دنوں یہ کالج میگزین میں چھپا کرتے تھے اور پھر کالج کی مجلس ادب کے صدر بھی منتخب ہو گئے تو ان کی سرگرمیاں سوسائٹی کے پروگراموں میں دکھائی دینے لگیں۔

کالج میگزین میں ان کے چھپنے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ گیارہویں کے اردو کے پرچے میں کچھ محاورات کو جملوں میں استعمال کرنے کا سوال آیا تو انہوں نے پہلے تو اس کے درست انداز میں جملے بنائے اور پیپر کے آخر میں مزاحیہ انداز میں جملے بنا کر لکھ دیے جو کچھ یوں تھے۔

پگڑی اچھالنا: اسلم لندی جیت کر اپنی پگڑی اچھالنے لگا۔

خراج تحسین پیش کرنا: آپ نے اپنی بیوی کو بے وقوف بنا لیا میں آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

رنگ میں بھنگ ڈالنا: ہم نے رنگ ریز کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

اُلو سیدھا کرنا: ملازم نے صفائی کے دوران کھلونوں کی دکان میں گرا ہوا اُلو سیدھا کیا۔

کافور ہونا: بیوی کو دیکھ کر ماسٹر صاحب کا غصہ

الریاض فین
20۔اے سمال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات
Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

Pakistanipoint.com

کافور ہو گیا۔

ہمارے اردو کے پروفیسر کالج میگزین کے انچارج بھی تھے یہ سب پڑھ کر انہوں نے ان کو کالج میگزین میں طنز و مزاح لکھنے کی دعوے دے دی۔ انہوں نے ان کی راہنمائی و حوصلہ افزائی سے ''مرض عشقیر یا'' کے عنوان سے ایک مزاحیہ مضمون لکھا کیونکہ اس دور میں ایسے موضوع پر لکھنا ہی آسان تھا۔ مضمون کالج میگزین میں As it is چھپ گیا اور یہ دن دیہاڑے کالج بھر میں مشہور ہو گئے جس کے بعد پرنسپل صاحب کی سفارش پر ان کو لائبریری میں خصوصی رعایت حاصل ہو گئی۔ اب یہ اپنی باریوں کے دنوں کے علاوہ بھی کسی بھی دن کتاب نکلوا سکتے تھے۔ ہمارے ہاں جس کو بھی کچھ اختیار مل جائے اسے غلط استعمال کئے بغیر اسے مزہ نہیں آتا یہی ان کے ساتھ بھی ہوا سٹوڈنٹ یہ سائنس کے تھے مگر سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اردو ادب کی تمام موجود کتب چاٹ ڈالیں نتیجہ یہ کہ فزکس اور کیمسٹری میں ان کی سپلی آ گئی جو سپلیمنٹری امتحان میں انہوں نے بڑی مشکل سے پاس کئے۔ اس کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ بی اے میں اردو ادب رکھ لیتے مگر اسے انہوں اپنی بے عزتی سمجھا اور بی ایس سی رکھ لی۔ معمولات ان کے پھر بھی وہی رہے لہٰذا بی ایس سی نے ان کے دانت کھٹے کر دیئے لہٰذا چپکے سے بی اے میں صحافت پنجابی اور فارسی رکھ کر ڈگری حاصل کی تاکہ لوگوں کا کچھ منہ بند ہو سکے۔ اس سے حاسدین کی لمبی زبانیں وقتی طور پر اندر چلی گئیں۔ میں نے پوچھا کہ بی اے میں اردو ادب کیوں نہیں رکھا جس کی لائبریریوں کو کتابی کیڑوں سے زیادہ چاٹ چکے ہو۔ بولے میں نے سوچا کہ کچھ مادری زبان کا حق بھی ادا کیا جائے۔ اردو ادب کے ساتھ متھا ایم اے میں لگائیں گے لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اردو ادب میں نمبر کم آتے ہیں جبکہ پنجابی میں وافر نمبر ملتے ہیں اور انہیں سرِ دست زیادہ نمبر لے کر گھر اور باہر والوں کی نظروں میں سرخرو ہونا تھا جو یہ ہو گئے۔

جب انہوں نے ایف ایس سی مکمل کی تو ایک شخص ان سے ملا جو رقم لے کر دوسروں کی جگہ امتحان دیتا تھا۔ ان دنوں ملازمت پر پابندی تھی اور اس نے بے روزگاری کا یہ توڑ نکالا ہوا تھا۔ اس نے ان کو آفر دی کہ اگر ایک لڑکے کی جگہ امتحان دے کر اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر دو تو معقول معاوضہ ملے گا مگر یہ جتنے لائق تھے اتنے ہی ڈرپوک تھے۔ لیکن انہوں نے بزدلی پر ایمان داری کا خول چڑھا کے انکار کر دیا۔ وہ شخص بی اے تھا مگر رقم لے کر اس نے کسی کی جگہ امتحان دے کر اسے ایم اے پنجابی کی ڈگری لے دی تو سوچا کہ خود بھی ایم اے کر لوں۔ داخلہ بھیج دیا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو بولا۔ رقم ملنی نہیں تھی، اس لئے تیاری ہی نہیں کر سکا۔ اس نے جن لوگوں کو ڈگریاں لے دیں وہ بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے مگر یہ ان سے ملنے جاتے تو ان کے ہاتھ پیر پھول جاتے۔

ان کو انگلش فلمیں دیکھنے کا خبط تھا۔ کالج کے دنوں میں انہوں نے شاید ہی کوئی ایکشن کامیڈی فلم چھوڑی ہو 007، جیکی چن، بروس لی، ننجا سیریز اور مثل خان، سنتھیا لاسٹر اور انجلینا جولی کی تمام فلمیں دیکھ ڈالیں اور گھر والوں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی وجہ یہ کہ یہ فلمیں ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہو جاتی تھیں اور یہ کسی دوست کے ساتھ پڑھنے کا بہانہ بنا کر نکل آتے تھے اور احتیاطاً اس دوست کو ساتھ لے کر فلم دیکھنے چلے جاتے تھے تاکہ قسم دینی پڑے تو بھی دے سکیں کہ اسی کے ساتھ تھا۔

۞۞۞

یادیں کچھ باتیں

کاکا بوہڑی

''قادر بخشا! تیرا بھانڈا پھوٹ گیا یہ جو تم نے کئی دنوں سے عورت کا بہروپ بھرا ہوا تھا یہ ظاہر ہو گیا ہے اور تیرا کھیل ختم ہو گیا ہے۔

☆ محمد نذیر ملک
051-4833091
راولپنڈی

سردی کا شباب تھا۔ دھیمی بارش نے دن رات ایک کیا ہوا تھا۔ ذرا سا وقفہ دے کر دوبارہ سرے سے شروع ہو جاتی۔ پرندے بھی دن بھر مکانوں کے کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ چگنے چرنے کا ذرا موقع نہیں ملا تھا۔ مال مویشی بندھے تھے۔ دن میں ایک دفعہ پانی پلانے کے باہر نکالے جاتے اور دوبارہ اندر بند کر دیئے تے۔ وہ دو روز سے خشک چارے پر گزارا کر رہے ۔لوگ گھروں میں بند ہو گئے۔ کاروبارِ زندگی معطل رہ گیا تھا۔ کوئی کیا کرتا، کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ م مصروفیت کا بہانہ ہوتا ہے۔ ذہن تدبیریں کرتا ہے تھ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ پاؤں چلنا چاہتے ہیں، س اللہ تعالیٰ نے اسی لئے بنایا ہے۔ جمود پر جمود طاری تھا یعنی جبری التوا۔

کہتے ہیں کہ مادے کی خاصیت لے کر وہ اپنے سکون یا حرکت کو خود تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسے تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ تب کام حرکت میں آتا ہے اور چال پکڑتا ہے اس سے گردش وجود میں آتی ہے۔ دل کی دھڑکن ہے تو زندگی متحرک ہے۔ زندگی بھی سفر میں ہے، زندگی ساکت ہو جائے تو پھر وہ زندگی نہیں کہلاتی۔ موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔

اتنی سردی کہ توبہ بھلی۔ گاؤں کی بن (بڑا تالاب) کا پانی برفیلا ہو چلا تھا۔ رات کو اس کی سطح پر ہلکی سی برف کی تہہ جم جاتی جسے مقامی زبان میں ٹکر جمنا کہا جاتا۔ خشک گھاس پر شبنم کے قطرے مل کر برف کی سفیدی تان لیتے۔ ایسے میں صبح صبح قادر بخش کے گھر

سے یہ خبر نکلی کہ رات کو اس کے ہاں پہلوٹھی کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ یہ خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ حالانکہ گاؤں کی گلیاں بارش کی وجہ سے سنسان تھیں۔ لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ بڑی تعجب خیز بات تھی۔

ٹیلیفون وغیرہ تو اس زمانے میں کسی نے دیکھا بھی نہ تھا۔ خبریں سینہ بہ سینہ ہی سفر کرتی تھیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں لوگوں کے مکانوں کی چھتیں آپس میں دور تک ملی ہوتی تھیں۔ لوگ اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر پورا محلہ چھان آتے تھے۔ چھتوں کے ذریعہ سے فاصلے سمٹ گئے تھے۔ ہم خود صبح سویرے باہر جانے کے لئے اپنے گھر کی چھت سے ہو کر پیچھے والے گھر کی چھت کی دیوار سے پچھلی گلی میں اتر جاتے تھے۔ جبکہ سامنے والی گلی سے پچھواڑے والی گلی میں جانے کے لئے کافی گھوم کر آنا پڑتا تھا۔ اچھا زمانہ تھا لوگ ایک دوسرے کے چال چلن کو جانتے تھے۔ کوئی کسی پر بے جا شک نہیں کرتا تھا۔ ماؤں بہنوں کی عزت کو سانجھی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے محلہ میں ایک نوجوان ہوا کرتا جسے رات کو نیند سے اٹھ کر چلنے کی عادت تھی۔ اسے بیماری بھی کہا جاتا تھا کہ رات کو نیند کی حالت میں چلتے چلتے دور نکل جانا اور جب بیداری ہوتی تو واپس چلے آنا۔ تو وہ لڑکا رات کو اٹھا اپنی چھت پر سے ہوتا ہوا محلہ کے دوسرے گھر کی چھت پر چلا گیا۔ اس وقت لوگ گرمیوں میں چھتوں پر سوتے تھے جن میں خواتین بھی ہوتیں۔

وہ جا کر ایک خاتون خانہ کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس خاتون کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سوئی ہوئی گھبرا کر اٹھی، چاند کی چاندنی تھی۔ وہ شور کرنے ہی والی تھی کہ اس نے اس نوجوان کو پہچان لیا اور اسے پکڑ کر آرام سے اس کے گھر پہنچا دیا۔ ورنہ آج کل تو کوئی اس بیماری کو اول تو جانتا ہی نہیں کیونکہ بیماری اس زمانے کی نسبت اب بہت کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرا اگر کوئی پاگل بھی ایسی حرکت کر بیٹھے تو اسے پاگل نہیں گردانتے بلکہ اس کی نیت پر شک کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ کوئی مانتا ہی نہیں کہ کسی نے یہ حرکت پاگل پن یا بیماری سے کی ہے۔

قادر بخش ایک غریب کسان تھا۔ اسی کی تھوڑی سی زمین تھی اور دیگر کچھ بٹائی پر حاصل کر رکھی اس کے والد فوت ہو چکے تھے۔ والدہ، بہن اور بیوی اس کی سادہ سی گزر اوقات ہو رہی تھی۔ اسی سیالے کی سرد رات کو اس کے ہاں پہلوٹھی کا بیٹا پیدا ہوا۔ زچگی کے لئے اس نے رات کو دائی بلا لی تھی جس نے صبح ہوتے ہی بات بہت سے کانوں تک پہنچا دی۔ یوں تو یہ فی الواقع خوشی کی خبر تھی بالخصوص قادر بخش کے لئے کہ وہ باپ بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے پہلوٹھی بیٹا عطا کیا لیکن ساتھ ہی اسے ایک بڑی فکر دامن گیر ہو گئی۔ وہ یہ کہ گاؤں بھر میں یہ رسم چل نکلی تھی کہ جس کسی کے گھر پہلوٹھی کا بیٹا پیدا ہوا سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو حلوے کے مشابہہ ایک غذا کھلانا پڑتی تھی جسے مقامی زبان میں ''کاکا بوہڑی'' کہا جاتا۔ جو کہ ہر کسی کے بس کی بات نہ ہوتی۔ تاہم جو نہ کھلاتا اسے یہ سزا دی جاتی کہ سردی کے موسم کے آنے کا انتظار کیا جاتا اور جس روز کڑاکے کی سردی اور برساتی دن ہوتا اس شخص کو پکڑ کر گاؤں کی بن کی اونچی منڈیر کی طرف سے کپڑوں سمیت ٹھنڈے یخ پانی میں پھینکا جاتا۔

اس وقت چونکہ سردیاں بھی تھیں اور موقع بھی تو گاؤں والوں کا دوست رشتہ داروں کا قادر بخش سے اصرار بڑھ گیا کہ وہ انہی سردیوں کے دوران ''کاکا بوہڑی'' دینے کا انتظام کرے ورنہ پھر اسے کپڑوں

سمیت بن کے پانی میں پھینکا جائے گا۔ اب قادر بخش کے پاس اتنی استطاعت نہ تھی۔ سردیوں میں ویسے بھی بعض کسانوں کے گھر سے گندم کے دانے تک ختم ہو جاتے اور انہیں باجرے کی روٹی پر گزارا کرنا پڑتا۔ بڑے تو پھر بھی لسی وغیرہ کے ساتھ باجرے کی روٹی کھا لیتے لیکن روزانہ باجرے کی بنی روٹی کھانا ہر کسی کے بس کی بات بھی نہ ہوتی۔ یہ گندم کی روٹی میں ہی اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے کہ بندہ روزانہ دو تین مرتبہ اسے رغبت سے کھا لیتا ہے۔

میں نے ایک غریب کسان کے پانچ چھ سال کے بچے کو دیکھا کہ جب اس کے گھر سے گندم ختم ہو گئی اور بات باجرے کی روٹی پر آئی تو آخر وہ نرم و نازک بچہ تھا، اس سے روزانہ تین ٹائم باجرے کی روٹی کھائی نہ جاتی اور وہ صبح روٹی کے وقت ہمارے گھر آ جاتا۔ وہ بہت خوبصورت اور صحت مند بچہ تھا۔ وہ آ کر روٹی مانگتا نہ تھا۔ اس وقت ہمارے گھر میں گندم کی روٹی پکتی تھی، وہ یہاں آ کر گندم کی روٹی پکنے کا انتظار کرتا رہتا اور وہ اس انتظار کے وقت کو ہمارے برآمدے میں لکڑی کے بنے ستون کو بانہوں میں لے کر جھولتا رہتا کیونکہ اس کے گھر میں برآمدہ تھا نہ ہی کوئی ستون۔ تو اس نے یہاں کے ستون کو کھلونا بنا لیا اسے گلے لگاتا اور اپنے بازوؤں سے یوں تھام کر اس کے گرد چکر لگاتا رہتا جیسے وہ اس کا کوئی پیارا دوست اور ہمجولی ہو۔ تا آنکہ روٹی پک جاتی اور میری والدہ روٹی پکانے میں جلدی کرتیں کہ اسے بھوک لگی ہو گی اور اس بچہ کو پیار سے کھلاتیں۔ بعد میں وہ بچہ اس بچپن میں ہی اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔ جہاں گندم کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔ آج کے بچے تو سو سو نخرے کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا کھاتے رہتے ہیں اور گندم کی سوکھی روٹی کو تو خاطر میں ہی نہیں لاتے اور باجرے کی روٹی تو انہوں نے دیکھی ہوئی ہی نہیں ہے کھانا تو بڑی دور کی بات ہے۔

سردیوں کے انہی شباب کے دنوں میں قادر بخش کو کہیں سے اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ یہ لوگ معاف کرنے والے نہیں اور وہ اس تاک میں ہیں کہ اسے پکڑ کر بن پر لے جائیں اور بھری برسات میں اٹھا کر کپڑوں سمیت بن میں پھینک سکیں۔ البتہ وہ کافی ہوشیار تھا۔

اس نے اس ممکنہ جگ ہنسائی کے تدارک کے لئے لوگوں کی نظروں سے چھپ جانے کی تدبیر کر ڈالی۔ اس کے گھر سے پتہ کیا جاتا تو وہ گھر نہ ہوتا۔ اندرون خانہ اس کے گھر کی تلاش بھی لی گئی لیکن اس کا کوئی کھوج نہ ملتا۔ اس دور میں گھروں میں غسلخانے وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ اس کے لئے لوگوں کو گھر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ تمام راستوں کی نگرانی کی جانے لگی۔ تمام تر چوراہوں پر آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔ گھر کی مخبری بھی کی جانے لگی۔ مال ڈنگر اس کے گھر والی (بیوی) اور کبھی والدہ ہی باہر لے جاتیں اور واپس لے آتیں۔

قادر بخش کہاں گیا ہے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ لوگ حیران و پریشان تھے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ کاکا بوہڑی دینے سے اعراض کرنے والے لوگ باگ کڑاکے کی سردی میں بن (بڑا تالاب) میں غوطے کھا لیتے لیکن گھر سے یوں غائب نہ ہوتے یا پھر جیسے تیسے کر کے ''کاکا بوہڑی'' دینے کا اہتمام کر ہی لیتے لیکن یوں نظروں سے غائب نہیں ہوتے تھے۔ مگر قادر بخش نے لوگوں کو زچ کر دیا تھا۔ سردیوں میں زمین داروں یا کسانوں کا کام نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس وقت وہ محض اپنے مال مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے یا یہ انہیں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا بہانہ میسر ہو جاتا۔ تو گویا یہ موسم ان کی چھٹی کا موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں

نہ تو کسی فصل کی بیجائی ہوتی اور نہ یہ کٹائی کا موسم ہوتا ہے۔

لہٰذا مویشیوں کی دیکھ بھال تو ان کی خواتین بھی کر لیتیں۔ ان کے لئے کھیتوں سے چارہ لانا اور انہیں پانی وغیرہ پلانا۔ یہ کوئی اتنا جان جوکھوں کا کام نہیں ہوتا جو ان کی خواتین نہ کر سکتیں۔ لہٰذا قادر بخش کے لئے گو یہ چھٹیوں کا موسم تھا اس کے لئے گھر میں موجود ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ اس کے لئے گھر میں موجود نہ ہونے کی گنجائش موجود تھی۔ ورنہ اس زمانے میں کسان کی زندگی بہت مصروف بھی ہوتی تھی۔ تعطیلیں نہیں آتی تھیں، ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا تھا اور بار بار گھر اور باہر آنا جانا پڑتا تھا۔ اس لئے فصلوں کی کٹائی کے دنوں کو وہ باہر اندر کے دن کہا کرتے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب زمینداری میں گھر کی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا کرتی تھیں۔ صرف ہل نہیں چلاتی تھیں، باقی کے تقریباً سارے کام کیا کرتی تھیں۔ گھر میں جتنے افراد بھی ہوتے تھے سب کو کام کرنا پڑتا۔ کہاوت تھی کہ کسان کو ایک دھیلہ مزدوری نہیں پڑتی۔

دن پر دن چڑھتے جا رہے تھے۔ قادر بخش کسی کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ پوہ ماگھ کی دھیمی جھڑی (بارش) کا موسم لگا ہوا تھا اور گزرتا جا رہا تھا۔ اب تو لوگوں کے دلوں میں قادر بخش کے لئے غم وغصہ کے جذبات بھی ابھرنے لگے تھے۔ لوگ اپنے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے جا رہے تھے اور ہر کوئی اسے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر بن میں پھینکنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور مزے کی بات کہ اندر کی کوئی خبر باہر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے ماحول میں جہاں گھروں کی چھتیں بھی سانجھی ہوتی تھیں۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ قادر بخش لا پتہ ہو گیا۔ اس کے قریبی رشتہ داروں نے اس حوالے سے بالکل چپ سادھ رکھی تھی۔ پوچھنے پر وہ کسی طرح کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتے تھے۔ بس ہاں نہ ہی کرتے رہے۔ پہرے والے بھی عاجز آ چکے تھے۔ یہ معمہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ قادر بخش کہاں گیا؟

آخر کار ان ہی کے ایک معتمر اور بزرگ سے شخص پہرے والوں میں شامل ہو گئے۔ جوان پہرے دار تو اپنی تک بندیوں میں لگے رہتے تھے اور بے پر کی اڑاتے رہتے تھے۔ اس بزرگ کا نام قطب الدین تھا۔ یہ نہایت دانا اور عقلمند شخص تھے۔ قادر بخش کے گھر کے قریب والے چوراہے پر ان کی معیت میں پہرے کی دوسری رات تھی۔ رات گو سرد تھی لیکن قطب الدین کے ساتھ پہرے والوں کے حوصلے بلند تھے۔ اچانک عشا کے وقت کے قریب ایک عورت اس پہرہ دار قافلہ کے قریب سے گزری۔ سردی کی وجہ سے اس نے کالا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔

ویسے عام طور پر کمبل تک تو اس زمانے میں بہت کم لوگوں کی رسائی تھی۔ ہاں بعض فوجی حضرات اپنے بزرگ والدین اور رشتہ داروں کے لئے فوج کی جانب سے ملا کوئی ایک آدھ کالا کمبل گھر لے آتے تھے۔ دیگر اچھے اور خوبصورت کمبل تو تھوڑا بعد میں نکلے تھے جنہیں ایرانی کمبل کہا جاتا۔ گاؤں (وعولہ) کے لوگ علاقہ کے دیگر لوگوں سے کچھ پہلے خلیجی ریاستوں میں پہنچ گئے تھے۔ جنہیں عرف عام میں ایران کہا جاتا۔ لہٰذا وہاں سے لائی ہوئی اشیاء کو ایرانی اشیاء کہتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان کی لائی ہوئی ایرانی اشیاء خریدنے آتے اور اس وجہ سے دوسرے گاؤں کے لوگ اس گاؤں کو پیرس کہتے۔ یہاں کے لوگ خوشحال ہو گئے تھے لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ ایران میں بادشاہت تھی اور وہ پورے خلیج کو اپنے زیر تسلط ہی سمجھتا تھا۔ ویسے تو ایران تمام تر

Paksociety.com

خلیجی ریاستوں کی نسبت بہت بڑا ملک تھا اور لوگوں نے صرف ایران کا نام ہی سن رکھا تھا مگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے وہ ناواقف تھے۔ لہٰذا باہر سے آئی ہوئی ہر چیز پر ایرانی نام چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ جیسے کہ ایرانی کمبل، ایرانی ململ یا مخمل، ایرانی لیلن کی چادر اور ایرانی بوٹ وغیرہ۔ حتیٰ کہ گاؤں کے بعض لوگ جو پہلے ایران پہنچے واپسی پر اپنے نام کے ساتھ ''ایرانی'' کا لاحقہ لے آئے اور وہ عمر بھر اسی نسبت سے جانے جاتے تھے۔ اب تو خلیجی ممالک بہت آگے نکل چکے ہیں اور ان کا شمار ترقی یافتہ ممالک کی صفِ میں ہوتا ہے اور یہ ممالک اپنے تعارف کے لئے کسی دوسرے ملک کے محتاج نہیں ہیں۔

کالے کمبل والی عورت جب چہرہ دار دن کے سامنے سے گزری تو قطب الدین کا ماتھا ٹھنکا، اس نے نہایت غور سے اس کے چلتے قدموں کو دیکھا۔ اس کے بدن کا دیگر حصہ تو کمبل کی لپیٹ میں تھا۔ چہرہ بھی آدھا کمبل میں تھا لیکن اس کے اٹھنے والے قدموں کی چال کو قطب الدین نے غور سے جانچا اور پھر آناً فاناً اس نے آگے بڑھ کر اس کمبل والے جھپٹ کر بانہوں میں لے لیا۔ قطب الدین کے دیگر ساتھی گھبرا گئے کہ قطب الدین نے یہ کیا اوچھی حرکت کر ڈالی۔ گاؤں کی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔ اب تو سارے گروہ کی خیر نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پہلے خود اپنے طور پر قطب الدین کی خبر لیتے قطب الدین نے کمبل کھینچ کر پرے پھینکتے ہوئے باآواز بلند کہا۔

''قادر بخشا! تیرا بھانڈا پھوٹ گیا یہ جو تم نے کئی دنوں سے عورت کا بہروپ بھرا ہوا تھا یہ ظاہر ہو گیا ہے اور تیرا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ اس وقت اسے پکڑ لو اور اٹھا کر ... میں پھینکو''۔

لوگوں نے اسے پکڑ لیا، قطب الدین سے جب دریافت کیا گیا کہ اس نے قادر بخش کو اندھیری رات میں کیسے پہچانا جبکہ وہ سراپا عورت لگتی تھی۔

''وہ عورت لگتی تھی لیکن تھی نہیں۔ میں کوئی دنوں سے اس کی تاک میں تھا۔ میں نے کئی بار اس کا پیچھا بھی کیا اس کے جسم کا دیگر تو کوئی عضو کمبل سے باہر نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے قدم تو باہر تھے۔ میں ان قدموں کو جانچتا رہا۔ میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ ان قدموں کی چال میں جھول ہے کہیں۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ زنانہ قدموں کی چال نہیں ہے کیونکہ عورت بایاں قدم آگے رکھتی ہے اور دایاں پیچھے۔ جبکہ مرد پہلے دایاں قدم بھرتا ہے پھر بایاں۔ اور یہ عام آدمی کی سمجھ کی بات نہیں''۔

قادر بخش نے کامیاب طور پر عورت کا سوانگ بھرا اور وہ پورے گاؤں کو جل دے کر نکل جاتا رہا۔ اس نے اپنے کپڑے بدلے، چہرہ بدلا، چال بھی کسی حد تک بدلی لیکن وہ اپنی فطرت کو نہ بدل سکا کہ ''مرد قوت کے اعتبار سے عورتوں پر حاوی ہے''۔ (القرآن) طاقت ان کے داہنے ہاتھ اور داہنے پاؤں میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ مرد کی فطرت میں ہے۔ مرد کی طاقت کا سرچشمہ اس کا دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں ہے جسے بائیں جانب پر فضیلت دی گئی۔ یعنی یہ کہ دائیں کو بائیں پر قدرت اور برکت حاصل ہے۔ تبھی دایاں قدم پہلے اٹھتا ہے۔

قطب الدین نے بتایا کہ اس نے محض قادر بخش کے قدم اٹھانے کے انداز سے یہ جان لیا کہ یہ مرد کے پاؤں ہیں، عورت کے نہیں اور اس نے مذکورہ بنا پر بے دھڑک قادر بخش کو دبوچ لیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور راتوں رات سیدھا بن (تالاب) کی طرف لے چلے کہ اب اس کے ساتھ کوئی رُو رعایت نہ برتی جائے گی۔

Pakistanipoint.com

دھیمی جھڑی (ہلکی بارش) اپنے دستور کے مطابق جاری تھی اور رات بہت سرد تھی۔ بعض لوگ صبح ہونے کا انتظار کرنے کو کہنے لگے۔ بعض کی رائے تھی کہ اگر قادر بخش کو چھوڑ دیا گیا تو وہ کوئی دوسرا سوانگ رچا لے گا۔ لہٰذا اس پر اعتبار نہ کیا جائے تاکہ دوسرے نصیحت پکڑیں۔ رات کے اندھیرے میں جب سب لوگ بن پر پہنچ چکے تو یہ مشورہ ہونے لگا کہ کون اسے اٹھا کر بن کے پانی میں پھینکے گا۔

اسی اثناء میں ایک شور اٹھا کہ قادر بخش کا کوٹھا (مکان) گر گیا ہے، مکان چونکہ اکثر پتھر اور مٹی کے گارے سے یا حد چونے سے بنے ہوتے تھے۔ مٹی کے گارے سے مکان تو دھیمی جھڑی (ہلکی بارش) کا آسان شکار ہوتے۔ ان کی کچی دیواریں اکثر و بیشتر گر جایا کرتیں۔ چونکہ یہ چھوٹے پتھروں اور مٹی گارے کو ملا کر کھڑی کی جاتیں تو گرتے وقت کافی اونچی گڑگڑاہٹ اور بلند آواز سے گرا کرتیں جو دور تک سنی جاتی اور جونہی ایسی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی لوگ اس سمت کو دوڑ پڑتے تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مکان کس کا ہے یا دیوار کس گھر کی ہے وہ فوری مدد کو پہنچتے تھے۔

جیسے ہی قادر بخش والے مکان کے گرنے کی آواز گونجی بچے کھچے لوگ جو قادر بخش کے ساتھ بن پر نہیں آ سکے تھے اور جو لحاف اوڑھے سو رہے تھے وہ اپنے گھروں میں، اٹھ گئے اور قادر بخش کے گھر پہنچ گئے۔ ادھر بن پر جو لوگ قادر بخش کے ساتھ اسے پانی میں پھینکنے کے لئے کھڑے تھے۔ ان کے پاس بھی مکان گرنے کی خبر پہنچ گئی اور قادر بخش نے خبر سن کر گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسے وہاں سے کسی نے بھی نہیں روکا بلکہ وہ بھی قادر بخش کے گھر کی طرف دوڑنے لگے۔ سب ہی لوگ فکرمند تھے۔ یہ مویشیوں والا کچا کمرہ تھا جسے مال ڈنگر کا کوٹھا کہا جاتا۔ اس کی گلی کی جانب والی ایک دیوار مکمل طور پر زمین بوس ہوگئی تھی اور اس کا ملبہ بھی گلی کی طرف گرا تھا یہ تو شکر ہوا کہ چھت نہ گری۔ کیونکہ تمام تر مویشی کمرے کے اندر ہی تھے۔ چھت گرتی تو کافی نقصان ہوتا۔

چھت کیوں نہ گری؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ چھت کو کمرے کے اندر سے لکڑی کے ستونوں کا سہارا تھا۔ مکان بناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ چھت مکمل طور پر دیواروں کے سہارے پر نہ رہے کیونکہ مٹی کے گارے سے چنی ہوئی دیواروں پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے کمرے کے اندر جابجا ستون کھڑے کر کے چھت کو ان کا سہارا بھی دیا گیا تھا جس سے بچت ہوگئی اور کسی مویشی کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔

قادر بخش کے گھر کے اندر جمع ہونے والے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ اب دیوار کی فوری مرمت کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ایسی جھڑی جاری تھی اور سردی میں بھی مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ کمرے کی دیوار کی تعمیر کا خرچہ گاؤں والوں نے اپنے ذمہ لے لیا اور دوسرے روز صبح کام شروع کر دیا۔ دوپہر تک دیوار چن دی گئی۔ اب لوگوں کے دلوں میں قادر بخش کے لئے محبت اور ہمدردی کے جذبات امڈ آئے کہ اس بے چارے کا یہ نقصان ہوگیا۔ یہ شکر ہوا کہ کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ وہ قادر بخش جو ایک کا کا بوہڑی دینے کی سکت نہیں رکھتا تھا اور مسلسل کئی روز تک بہروپ دھار کر لوگوں کی نظروں سے چھپتا پھرا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں نے اسے معاف کر دیا اور پھر انہوں نے اس سے کبھی کا کا بوہڑی کا تقاضا نہیں کیا۔

طنز و مزاح

عدبی عجلاص 4

جہاں بچوں کو چھ مہلک بیماریوں کے حفاظتی ٹیکے لگوائے جاتے ہیں وہیں سیاست کی بیماری سے بچاؤ کے لئے بھی ٹیکے لگوا لینے چاہئیں تاکہ وہ بڑے ہو کر چار دن کی چاندنی کے لئے اندھیری رات کا انتخاب نہ کریں اور ملکی خزانے پر پڑنے والا بوجھ کم ہو سکے۔

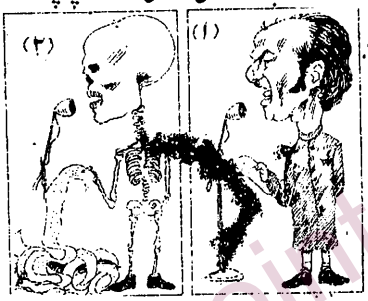

☆ خادم حسین مجاہد 0300-8826510 سرگودھا

ہال لڑکوں سے اور گیلری لڑکیوں سے بھر چکی تھی حتیٰ کہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ اگر کچھ اور شائقین کو داخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ہال کی دیواریں ٹوٹ جائیں گی اور چاروں طرف لوگوں کا سیلاب آ جائے گا۔ لڑکیوں کو اوپر گیلری میں محدود کرنے کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ لڑکوں کا رجحان ان کی بجائے اجلاس کی طرف رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کھل کر ایک دوسرے کو اپنے فیشن دکھا سکیں اور باتیں کر سکیں اور اجلاس کی کارروائی ان کی باتوں سے ڈسٹرب نہ ہو اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھے حاضرین کو اجلاس دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ سنائی بھی دے سکے اور تیسرے یہ کہ اختلاف رائے کی صورت میں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے محفوظ رہ سکیں۔

یہ حفاظتی انتظامات ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں کیے گئے تھے البتہ کارروائی میں حصہ لینے کے لئے مائیک اوپر بھی رکھا گیا تھا جسے بوقت ضرورت کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا۔ کرسی صدارت پر حسبِ سابق آخری درویش قابض ہو چکے تھے جبکہ مہمانِ خصوصی کی نشستوں پر مجاہد شیخ اور ناطقہ کشش براجمان ہو چکے تھے اور کمپیئرنگ کے لئے بابا شوقی اور مس عاتقہ کشش الرٹ ہو چکے تھے۔ لڑکیوں نے شور سے گیلری سر پر اٹھا رکھی تھی۔ جب سپیکر آن ہو گئے تو مجبوراً انہیں خاموش ہونا پڑا کیونکہ گیلری کا سپیکر خاص طور پر زیادہ طاقتور لگایا گیا تھا اور یہ کام بابا شوقی کا تھا۔ کشش سسٹرز نے اسے عورتوں کے بولنے کے فطری حق کے خلاف سازش قرار دیا کیونکہ عورتوں کی آوازیں اس میں بالکل دب گئی تھیں۔

بہرحال پروگرام شروع ہوا بابا شوقی خوشامدید حاضرین! پروگرام کا باقاعدہ آغاز کرنے کے لئے میں سب سے پہلے خود کو دعوت دیتا ہوں۔ میں آج آبادی

اور عاشق کا تعلق شاعری کی مدد سے بیان کروں گا تو استقبال کیجئے تشریف لاتا ہوں میں خود۔

جوں جوں آبادی بڑھ رہی ہے عاشقوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے کیونکہ ان دونوں مقداروں میں راست تناسب کا تعلق ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

جدھر دیکھو ادھر عشق کے بیمار بیٹھے ہیں
ہزاروں مر چکے لاکھوں تیار بیٹھے ہیں

لیکن آبادی بڑھنے سے عاشقوں کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر اس شعر کو یوں بدلنا مناسب ہوگا۔

جدھر دیکھو ادھر عشق کے بیمار بیٹھے ہیں
لاکھوں مر چکے کروڑوں تیار بیٹھے ہیں

اگر آبادی بڑھنے کی رفتار یہی رہی تو افراطِ عشاق کے باعث اس شعر کو مزید اس طرح تبدیل کرنا پڑے گا۔

جدھر دیکھو ادھر عشق کے بیمار بیٹھے ہیں
کروڑوں مر چکے اربوں تیار بیٹھے ہیں

علی ہذا القیاس

عاتقہ کشش:۔ کوئی اس پر تنقید کا رسک لے گا؟

آخری درویش:۔ بابا شوقی نے ریاضی، عمرانیات اور عشقیات کو یوں گڈمڈ کیا ہے کہ ناطقہ سر بہ گریباں ہے۔

ناطقہ کشش:۔ مجھ پر خواہ مخواہ الزام نہ دھریں، یہ جو عشق کے بیمار تھوک کے حساب سے مر رہے ہیں وہ سراسر ان کا ذاتی معاملہ ہے، میرا اس میں قطعاً کوئی قصور نہیں۔

عالم فصاحتی:۔ پیٹوں دل کو کہ روؤں جگر کو میں۔

عارب وضاحتی:۔ مستقبل کی اس بھیانک تصور سے مجھے تو جھرجھری سی آ رہی ہے۔ حد ہوتی ہے مبالغے کی بھی۔

بابا شوقی:۔ اب میں دعوت دوں گا مسٹر طوطی فراہم نقارخانہ کو جو آپ کو ڈاکیے کی کچھ وارداتوں کے بارے میں بتائیں گے۔

مسٹر طوطی فراہم نقارخانہ:۔ ڈاکیے کا شجرہ کہیں نہ کہیں ڈاکو سے ضرور ملتا ہے کیونکہ ڈاک کے ساتھ اس کا طرزِ عمل عموماً ڈاکو سے کم نہیں ہوتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو آپ کی ڈاک بروقت اور بحفاظت ملتی رہے تو ڈاکیے کی جیب وقتاً فوقتاً گرم رکھئے۔ منی آرڈر وصول کریں تو چپ چاپ خرچ برائے چائے پانی اس کے ہاتھ پر رکھ دیں ایمانداری سے ورنہ اگلا منی آرڈر کوئی اور وصول کرے گا۔ نہ جانے ڈاکیے کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ کون سا خط خفیہ (Confidentiai) ہے۔ بہرحال اگر مناسب فیس باقاعدگی سے ادا کی جاتی رہے تو آپ کا راز راز ہی رکھا جاتا ہے ورنہ آپ کا خط ڈیڈی حضور کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انعامات اور کتب ڈاک کے ذریعے مت منگوائیں ورنہ اکثر وہ ڈاکیے کے گھر کی زینت بنیں گی۔ ڈاکیے کو سب سے زیادہ خوشی بے رنگ خط سے ہوتی ہے جرمانہ وصول کرنے کے لئے وہ بے رنگ خط کو کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ بے رنگ خط تو رجسٹری سے بھی زیادہ محفوظ ہوتا ہے اسی لئے مرزا غالب خط عموماً بے رنگ بھیجتے تھے۔

موبائل اور انٹرنیٹ عام ہونے سے خط کا چلن کم ہوگیا ہے پھر بھی کسی نہ کسی معاملے کے لئے ڈاکیے سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ خصوصاً اوپن یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس، رول نمبر، کتابوں اور مشقوں سے لے کر رزلٹ کارڈ اور ڈگریاں تک ڈاکیے کی ہی مرہون منت ہیں۔ ملازمت کے خواہش مندوں کو پہلے کال لیٹر اس وقت ملتا تھا جب انٹرویو ہو چکے ہوتے تھے۔ شکر ہے اب ساری اطلاعات آن لائن ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود پارسل اور کتابیں ڈاک کے ذریعے ہی آتی ہیں۔ خطوط کم ہونے کے باعث رجسٹری اور پارسل کی

Pakistanipoint.com

فیس کافی بڑھا دی گئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ابھی کوریئر والوں سے کم ہی ہے لیکن اگر وہ لفافہ سستا کر دیتے تو شاید انہیں ایسا نہ کرنا پڑتا۔ اللہ آپ کو ڈاک والوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

ناطقہ کشش:۔ مسٹر طوطی کو ڈاکیے سے کچھ زیادہ ہی شکایات ہیں، آپ کے اس بارے میں کیا جذبات ہیں؟

بے بے شوقی:۔ ہم مسٹر طوطی سے متفق ہیں اور محکمۂ ڈاک والوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے جس وقت کال اور ایس ایم ایس چارجز کم ہو رہے تھے اس وقت ڈاک چارجز بڑھا دیئے گئے جس کی وجہ سے خط لکھنے کا چلن ہی کم ہو گیا۔ پہلے ایس ایم ایس اور اب ای میل نے ڈاک کی جگہ لے لی ہے جن کے چارجز برائے نام ہیں۔

بے باک:۔ لیکن سبھی ڈاکیے تو ایسے نہیں ہوتے کالی بھیڑیں تو ہر جگہ ہوتی ہیں اس کی بنیاد پر سب کو برا نہیں کہا جا سکتا۔ پھر الیکٹرانک میڈیا کے عام ہونے کے باوجود ڈاک کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ نیٹ سے ملنے والی کتاب اور ڈاک سے ملنے والی کتاب مواد کے لحاظ سے تو ایک ہی ہوتی ہے لیکن جو مزہ ڈاک سے کتاب وصول کرنے کا ہے وہ ڈاؤن لوڈنگ میں کہاں۔

بابا شوقی:۔ ہاں کتاب ہاتھ میں ہو تو اس کا اپنا تشخص ہوتا ہے جو کہ اکثر ڈاک سے ملتی ہے اس لئے ڈاک کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ بہرحال محکمۂ ڈاک والوں کو ہماری گھر والی کی تجاویز پر غور ضرور کرنا چاہئے۔ اب میں دعوت دوں گا کے ایچ مجاہد کو کہ وہ آئیں اور کشفی ملتانی کی شاعری کے ساتھ انہوں نے جو ہاتھ کیا ہے وہ ہمیں بھی دکھائیں۔

کے ایچ مجاہد۔

شور ہے ہر طرف حجاب حجاب
برقع، دستانے، جراب جراب
ایک وہی سُست بے ہنر نکلا
جس کو کہتے تھے سب جناب جناب
مجھ سے وجہِ نکاح جب پوچھی
سر جھکا کر کہا سراب سراب
آبِ حیات کو قے سے کیا نسبت
پانی پانی ہے اور شراب شراب
رند جکڑے گئے قیامت میں
شیخ پیتا رہا شراب شراب
کر وہ دیتا ہے خوبرو زخمی
جس کی ہر ہر ادا خراب خراب

عاتقہ کشش:۔ کے ایچ مجاہد صاحب نے حسب معمول کشفی ملتانی کی شاعری کے ساتھ بھی کافی بڑا ہینڈ (Hand) کیا ہے کوئی اس پر ہینڈ کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے۔

بے بس لاچاروی:۔ مجاہد صاحب نے اس انتہا پسندانہ رویے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک طرف تو خواتین سب کچھ اتار رہی ہیں اور دوسری طرف پردے میں بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برقعے کے ساتھ دستانے اور جرابیں بھی پہنی جا رہی ہیں حالانکہ ہاتھوں اور پیروں کا پردہ بالاتفاق نہیں ہے۔ اس معاملے میں میانہ روی بہتر ہے تاکہ اگر کوئی نیا نیا مسلمان ہو تو گھبرا نہ جائے۔

مرجوح ناروی:۔ ٹھیک کہا آپ نے دوسرے شعر میں نالائق اور سفارشی لوگوں کے افسر بن جانے کی طرف اشارہ ہے۔

ناطقہ کشش:۔ نکاح کو سراب قرار دے کر مجاہد صاحب نے دنیا کی تمام عورتوں کی توہین کی ہے جس پر ہم احتجاج کرتی ہیں۔

آخری درویش:۔ بات تو سچ ہے اور سچ کڑوا ہی

ہوتا ہے لہٰذا برداشت کریں شراب اور آب حیات کا خوبصورت موازنہ کر کے مجاہد صاحب نے بتایا ہے کہ جو یہاں سستی کرے گا آخر جکڑا جائے گا اور جو احتیاط کرے گا وہ شراب طہور سے فیض یاب ہوگا۔

مسٹر طوطی فرام نقار خانہ:۔ محبوب کی ادائیں گھائل تو کرتی ہیں لیکن ان اداؤں کو خراب کہہ کر مجاہد صاحب نے نہ صرف ایک غیر شاعرانہ حرکت کی ہے بلکہ محبوباؤں کی توہین بھی کی ہے جس پر کارروائی کا حق ہم محفوظ رکھتی ہیں۔

بابا شوقی:۔ مجاہد صاحب اپنی حرکتوں سے ہمیشہ صنفِ نازک کو اپنے خلاف کر لیتے ہیں، اسی لئے تو کوئی ان سے عقدِ ثانی پر تیار نہیں ہوتی اور جو عقد اوّل والی ہے وہ بھی شاکی رہتی ہے بہرحال ان کی طرف سے میں معذرت خواہ ہوں، آپ لوگ غصہ جانے دیں اب گروپ ڈسکشن کا آغاز کرتے ہیں۔ موضوع ہے "شعراء ادبا کا مستقبل"۔

ابن آدم:۔ شعراء ادبا کی حالت تو ملکی خزانے سے بھی پتلی ہے ان کے لئے وظیفہ مقرر ہونا چاہئے۔

آدم بیزار:۔ واقعی یہ اکثر فاقے سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اس لئے ملازمتوں میں بھی ان کے لئے کوٹہ مخصوص ہونا چاہئے۔

مسٹر طوطی فرام نقار خانہ:۔ گویا آپ انہیں ذہنی معذور قرار دے رہے ہیں۔

بدتمیز حسنہ پھٹ:۔ میرے بھائی دولت کی دوڑ کے دور میں شاعری کرنے والے ذہنی معذور نہیں تو اور کیا ہیں۔

فارغ البال ناقدی:۔ انہی ذہنی معذوروں کی وجہ سے فکر کی کھیتیاں سرسبز ہیں۔ ہر ایجاد، انقلاب اور یادگار کا خیال سب سے پہلے شاعر ہی بصورت خواب یا خیال پیش کرتے ہیں باقی دنیا ان میں رنگ بھرتی ہے۔ اپنے ملک کی ہی مثال لے لیں۔

فرش عرشی:۔ بھئی اگر وہ عمل کریں تو خواب کیسے دیکھیں میرا مطلب ہے شاعری کیسے کریں درس عمل کیسے دیں۔

"ارشی بہزاد: ادیبوں اور شاعروں کو متحد ہو کر اپنی الگ ریاست قائم کرنی چاہئے جہاں علم و ادب سے متعلق سرگرمیوں کی مکمل آزادی اور مواقع ہوں اور وہاں وہ پہلے درجے کے شہری ہوں ایسی ریاست بالکل پُرامن ہوگی۔

ناطق انجمی:۔ شعراء ادباء نے کسی نہ کسی حد تک اپنی ریاستیں بنا تو رکھی ہیں مگر یہ ہر وقت آپس میں حالتِ جنگ میں رہتے ہیں اس لئے امن و امان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تو کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہوتے ریاست تو بڑی دور کی بات ہے۔

حیران غوری:۔ اب ایسی بھی بات نہیں ماضی میں ہر قسم کی حکومتوں کے تجربے ہوئے ہیں اس لئے اگر شاعروں ادیبوں کی ریاست فی الحال قائم نہ بھی ہو تو سربراہ کسی شاعر ادیب کو حکومت دے کر اس طبقے کو بھی آزمانا چاہئے۔

وحشت جنگل پوری:۔ یہ تجربہ عوام کو بہت مہنگا پڑے گا اور تو اور جو ہوگا سو ہوگا وزیراعظم اور صدر صاحب ہر وقت قوم سے خطاب کی آڑ میں عوام کو اپنے کلام سے نوازتے رہیں گے اور میڈیا ان کو نشر کرنے پر مجبور ہوگا۔

دراز دست کان پوری:۔ پھر تو آئین بھی منظوم کر دیا جائے گا اور اسمبلی کی کارروائی بھی شعروں میں کی جائے گی۔

آخری درویش۔ پھر ہر طرف علم و حکمت کے سمندر ہی بہیں گے اور کاروبارِ حیات کی کھیتیاں خشک ہو جائیں گی۔

Pakistanipoint.com

دانیہ باقری:۔ پاکستان میں شعرا ادباء کی جس بہتات ہے اس کا کچھ حصہ بیرون ملک برآمد کر زرمبادلہ کمانا چاہیے۔

کرگس سہسوانی:۔ لیکن ایسی چیزوں کی بیرونی ی میں تو مانگ ہی نہیں۔

پہلا درویش:۔ جب تک ضمیر فروشی کی طرح ب فروشی کو باقاعدہ صنعت کا درجہ نہیں دیا جاتا۔شعراء ء کی حالت کا سدھرنا ممکن نہیں۔

ناطقہ کشش:۔ ویسے تو خود شعراء ادباء کا سدھرنا ی ممکن نہیں البتہ ادب فروشی کسی نہ کسی پیمانے پر اور ی نہ کسی شکل میں ہوتو رہی ہے اگر اسے قانونی شکل ے دی جائے تو اس طبقے کے بیشتر مسائل حل ہو ئیں گے۔

عاتقہ کشش:۔ یہ درست ہے کہ شعر و ادب کے ے حالات سازگار نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سان قلم توڑ کر بیٹھ جائے ہمیں حتی المقدور صدائے حق د کرنی چاہیے تاکہ معاشرتی ناسوروں کے مکروہ رے عوام کے سامنے آتے رہیں۔اب آپ کو آخری رویش سے آزاد نظم سنواتے ہیں عنوان ہے ''میری ان''۔

آخری درویش:۔

یری جان! اپنی آنکھوں سے پلکوں کے لنگر اٹھا لے کہ
ں ان سمندروں میں پیار کی آب دوزیں چلانا چاہتا ہوں
یری جان اپنی آنکھوں کی کھڑکیاں کھول دے کہ
ں ان کے سامنے بیٹھ کر پیار کی دھوپ سینکنا چاہتا ہوں
یری جان! اپنی آنکھوں کے جنریٹر چلا دے کہ
یں ان کی بجلی سے دل کی گلیاں جگمگانا چاہتا ہوں
یری جان! اپنی آنکھوں کے سگنل سبز کر دے کہ
یں پلکوں کی سڑک سے اپنے پیار کی ٹریفک گزارنا چاہتا
ہوں

جمہوریت

ایک دھوکا ہے جسے ہمیں الجھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جمہوریت اپنی تعریف کے مطابق دنیا کے کسی بھی ملک میں رائج نہیں، حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ میں بھی نہیں۔

بابا شوقی:۔ نظم کچھ زیادہ ہی آزاد نہیں ہو گئی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فردوس بہشتی:۔ ایسی ویسی اگر میرا جی اسے پڑھ لیتے تو اپنی سب آزاد نظموں سے تائب ہو جاتے۔

بابو پرنس:۔ محبوب کے اتنے فائدے، محبوب نہ ہوا انڈسٹری ہو گئی۔

عادل بادشاہ:۔ میرا ایسا محبوب ہو تو میں بجلی اور پانی کا کنکشن کٹوا دوں۔

شاہین خلائی:۔ اس نظم میں روایت سے ہٹ کر جدید تجربات کئے گئے ہیں اور خوبصورت علامات استعمال کی گئی ہیں جس کو ملامت وہ کر رہے ہیں جو ادب کی الف بے سے بھی سلام دعا نہیں رکھتے۔

عاتقہ کشش:۔ یہ درویش نام کے ہی درویش ہیں ورنہ ان کی نظم تو بڑی رنگین و سنگین ہے اور ان کے جذبات نہایت خطرناک ہیں۔ خیر اب میں دعوت دوں گی ناطقہ کشش کو جو کہ الیکشن کے عنوان پر اپنے مضمونچے کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گی۔

ناطقہ کشش:۔ الیکشن وہ عمل ہے جس میں لاتعداد بے وقوف اپنی باگیں چند احمقوں کے ہاتھ میں پکڑا کر سو جاتے ہیں لیکن جلد ہی یہ احمق کوچوان سیاسی تانگہ چلانے کی بجائے خود گھوڑے بن کر تانگہ پھنسا بیٹھتے ہیں۔ الیکشن ایک متعدی بیماری ہے جو ایک سے

Pakistanipoint.com

دوسرے کو لگتی ہے پھر تیسرے کو حتیٰ کہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ اس میں بعض اوقات سگے بھائی دشمن بن جاتے ہیں اور باپ بیٹا آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن جن کے لئے یہ قربانیاں دی جاتی ہیں وہ مفادات کی دودھ پتی میں مکس ہو جاتے ہیں۔ یہ نشہ جسے ایک بار لگ جائے ساری عمر اس کا بدن وصال یار کی لذت سے ٹوٹتا رہتا ہے۔ الیکشن سے قبل سیاسی لیڈرز کی تقاریر میں یہ نشہ سر چڑھ کر بول رہا ہوتا ہے اور اسی نشے میں وہ ہر مسئلہ سیکنڈوں میں حل کر دیتے ہیں اور چشم زدن میں مہنگائی، بے روزگاری، بدعنوانی، دہشت گردی اور کرپشن کو ختم کر دیتے ہیں ٹوٹے پھوٹے شہر پیرس بن جاتے ہیں جگہ جگہ پل سڑکیں پارک سکول کالج اور یونیورسٹیاں بن جاتی ہیں ہر طرف دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگتی ہیں۔ عوام کو خوابوں کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ جو الیکشن ختم ہوتے ہی اتر جاتا ہے لیڈر بھی ہوش میں آ جاتے ہیں اور اس نشے کے دوران کی گئی ہر بات اور وعدہ بھول جاتے ہیں یوں لیڈر عوام کو گیند بنائے رکھتے ہیں۔ جب تک یہ گیند پھٹے گا نہیں کھیل رکے گا نہیں۔

آئندہ نسلوں کو اس نشے اور بیماری سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ بچپن میں جہاں بچوں کو چھ مہلک بیماریوں کے حفاظتی ٹیکے لگوائے جاتے ہیں وہیں سیاست کی بیماری سے بچاؤ کے لئے بھی ٹیکے لگوا لینے چاہئیں تاکہ وہ بڑے ہو کر چار دن کی چاندنی کے لئے اندھیری رات کا انتخاب نہ کر لیں اور ملکی خزانے پر پڑنے والا بوجھ کم ہو سکے۔

بابا شوقی:۔ الیکشن نامہ آپ نے سنا، آپ بھی اس میں ووٹ ڈال سکتے ہیں لیکن یاد رکھیں کہ دھاندلی کی اجازت نہیں۔

آوارہ پریکی:۔ مس ناطقہ نے برائی کی جڑ یعنی الیکشن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہے مگر میرا خیال ہے اس سے بے وقوفوں کو کوئی عقل نہیں آئے گی۔

ابن پاجی:۔ بے وقوفوں کو 72 سالوں میں عقل نہیں آئی اس ایک مضمون سے آنے سے تو رہی۔

بے حیا نوفر:۔ سیاست پر جس قدر بکواس کی جائے کم ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔

گل باسی:۔ یہ مضمون بیلٹ پیپر کی پشت پر چھاپنا چاہئے تاکہ ہم الیکشن کی خفیہ و ظاہری خرابیوں سے محفوظ رہیں۔

ظریف چاپلوسی:۔ شرح خواندگی کو بھی نظر میں رکھیں ویسے ٹی وی پر تشہیر ہو تو شاید کوئی فائدہ ہو جائے۔

آخری درویش:۔ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ الیکشن ہوں ہی نہیں کیونکہ جمہوریت ہمیں ری ایکشن کر جاتی ہے۔

اسی دوران اچانک گیلری میں بھگدڑ مچ گئی بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر شرارتی نے وہاں چوہے چھوڑ دیئے تھے۔ خواتین کا شور جب نیچے پہنچا تو بم کی اطلاع بن گیا پھر یہ افواہ بنی اور تیزی سے پھیلتی ہوئی خودکش حملہ آور کی شکل اختیار کر گئی اور نیچے بھی بھگدڑ مچ گئی کچھ ہی دیر میں ہال کے دروازے ٹوٹ گئے پھر بھی سب کا ایک دم باہر نکلنا ناممکن تھا کچھ جانبازوں نے ایک دیوار توڑی تو ہال چند منٹ میں خالی ہو گیا۔ گیلری پہلے ہی خالی ہو چکی تھی راتب سوری راشن کے بنڈل بابا شوقی اور الفراڈیا اٹھا کر بھاگ گئے۔ شاید یہ افواہ پھیلانے میں ان کا بھی ہاتھ تھا یوں یہ اجلاس ملکی حالات کی طرح غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہو کر ختم ہوا۔

نقطہ نظر

پاکستان دارالمسائل

(گزشتہ سے پیوستہ)

تحریک آزادی اور تشکیل پاکستان کے دوران ہم نے جس لاپروائی، لوٹ مار اور مار دھاڑ کا مظاہرہ کیا تھا اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں

☆ سکواڈرن لیڈر (ر) سیّد یاض الحسن

لاہور

ستان کے مسائل کے سلسلہ میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ تحریک آزادی کے دوران جہاندیدہ ماہرین نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ مجوزہ ان کا صوبہ بنگال پچیس سال سے قبل ہی علیحدہ ہو ئے گا اور وہی کچھ ہوا۔ ہم نے کشمیر حاصل کرتے تے آدھے سے زیادہ حصہ کھو دیا۔ اس طرح لاکھوں تل ہوئے، بے شمار لوگوں کو دوسری دفعہ ہجرت کرنا ۔ اربوں کی املاک تباہ و برباد ہوئیں۔ باہمی دشمنی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ ہماری اعلیٰ صلاحیتوں کی افواج کو نالائق سیاستدانوں کی وجہ سے شکست و چار ہونا پڑا۔ ایک لاکھ کے قریب افراد دشمن کی ں چلے گئے اور پاکستان کو تعمیر نو کے لئے اَن گنت ں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ اس سانحہ میں انڈیا نے اہم دا کیا لیکن دشمن کا تو کام ہی یہ ہے کہ مخالف کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھائے۔ اگر ہم اپنے مسائل کو بطریق احسن حل کرنے کی کوشش ہی کرتے رہیں اور باہمی اعتماد کا مظاہرہ ہوتا رہے تو ایسے ناگہانی حادثات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کی بنیاد تو اسی دن رکھ دی گئی تھی جب بانی پاکستان نے اعلان کیا تھا کہ انہیں کٹا پھٹا ملک دیا گیا ہے۔ ایک ایسا ملک جس کا دھڑ خلیج بنگال میں ہو۔ ایک ٹانگ کراچی سے طورخم تک دراز ہو گھٹنا بلوچستان میں ہو اور دوسری ٹانگ موجود ہی نہ ہو۔ نیز بڑے حصے تک پہنچنے کے لئے کوئی بری، بحری یا فضائی راستہ نہ ہو اس کا تیئس سال تک متحد رہنا بھی ایک معجزہ ہی ہے۔

مسلم لیگی راہنماؤں نے اردو کو قومی زبان قرار دے کر اور بنگلہ زبان کو نظر انداز کر کے علیحدگی کی بنیاد کو مزید تقویت پہنچائی۔ مغربی پاکستان کے مختلف سطح کے ملازمین بنگالیوں کو حقیر گردانتے تھے اور ان کے ساتھ

Pakistanipoint.com

میل ملاپ سے اجتناب کرتے تھے۔ جب پہلے عام انتخابات میں عوامی لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوگئی تو ہمارے افسرانِ اعلیٰ برملا کہتے تھے کہ سیاہ رنگ اور کوتاہ قد کے بنگالیوں کو ملک پہ مسلط نہیں ہونے دیں گے۔ پھر یہی ہوا کہ ملک ہم نے توڑ لیا اور ذلت آمیز شکست قبول کر لی۔ انڈیا کے اندر اپنے قیدیوں کو برداشت کر لیا لیکن اپنے بنگالیوں کی عوامی حکومت قبول نہیں کی۔ مغربی پاکستان کے راہنماؤں نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان اگرچہ چھوٹا ہو گیا ہے لیکن پہلے سے مضبوط ہو گیا ہے۔ یہی ذہنیت ہمارے لئے مستقل پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ہر دم جمہوریت کا ورد کرنے والے اور عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار دینے والے اس غیر جمہوری رویہ اور عوام دشمنی پر مبنی خیالات سے ذرا نہیں شرماتے۔

1972ء میں جب نئے پاکستان کی بنیاد رکھی جا چکی تھی تو سربراہ حکومت بھٹو سے یہ سوال کیا گیا کہ مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو گیا۔ سندھ میں لسانی فسادات نے تباہی مچائی ہوئی ہے۔ بلوچستان میں ملٹری کارروائی کی وجہ سے لوگ چھپتے پھر رہے ہیں۔ پنجاب میں پولیس نے تاریخی ہڑتال کا مظاہرہ کیا۔ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کی چپقلش زوروں پر ہے تو پاکستان کا کیا بنے گا تو عوام کے ہر دلعزیز راہنما نے فرمایا کہ یہ سب سیاست ہے اور اسی افراتفری میں جمہوریت کا حسن پوشیدہ ہے۔

اگر یہی جمہوریت کا حسن ہے تو ہم اس سے مالا مال ہیں اور روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔ جمہوریت کے دلدادہ جس طرح باہمی گالی گلوچ اور سر پھٹول کا مظاہرہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے مختلف اداروں کو استعمال کرتے ہیں اس صورتِ حال سے نالاں ہونے کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں اور اس سے استفادہ کرنے کی تگ و دو بھی جاری رہتی ہے۔ اس طرح آج جو حکومت میں ہیں وہ کل جیل میں ہوتے ہیں یا ملک بدری اور پھانسی کی سزا پاتے ہیں لیکن کوئی عبرت حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر کوئی اپنے پاؤں پہ کلہاڑی چلانے کے بعد دوسروں پہ الزام تراشی کے مرض میں مبتلا ہے۔ انہی منفی کارناموں کی بنیاد پر بنگال ہم سے جدا ہوا اور اسی طرح کی حرکات سے ہم باہمی نفرت جاری رکھے ہوئے ہیں اور ملک و ملت کی تنزلی کا باعث بن رہے ہیں۔ ایثار، قربانی اور سادگی کا جذبہ مفقود ہے اور قوم سے زبردستی قربانی وصول کی جا رہی ہے۔ عوام کی کم علمی اور جذباتیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اقتدار اور دولت کی خاطر نت نئے منصوبے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اسپ فروشی ہمارا قومی کردار بن گیا ہے۔ پھر یہ گلہ کیا جاتا ہے کہ دشمن ہمارے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے۔ ہم نے خود ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ دشمن کو دخل اندازی کی دعوت دیتے ہیں۔

مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش کی صورت اختیار کرنے کے بعد مغربی پاکستان سے کئی شعبوں میں آگے نکل گیا ہے اور روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہا ہے کیونکہ وہاں اتحاد اور تنظیم کا مظاہرہ ہو رہا ہے لیکن ایمان ان کا بھی کمزور ہے۔ اس لئے اس نے بھارت کے طفیلی کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور مسلم مقاصد کے لئے اس کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس مقصد کے لئے زبانی جمع خرچ اور بڑھک بازی کے علاوہ کسی مؤثر کارروائی کا امکان نہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ہمیں احساس ہو جانا چاہئے تھا کہ ہم تنزل کی طرف گامزن ہیں اور اپنی کوتاہیوں کے ازالہ کے لئے بھرپور تگ و دو کرنی چاہئے تھی لیکن ہم نے انتہائی غفلت کا مظاہرہ کیا اور باہمی چپقلش کی بنا پر ہمار

ملک مزید مسائل کا گڑھ بنتا جا رہا ہے۔

ہماری بظاہر ہر دلعزیز حکومتیں بھی دھونس، دھاندلی اور جھرلو کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہمارے راہنما مختلف مسائل حل کرنے کے لئے باہمی گفت وشنید کے بھی روادار نہیں ہوتے اور اس مقصد کے لئے بھی سعدوی سفیر کی خدمات حاصل کرنا پڑیں پھر بھی اتفاق رائے کا اظہار نہ ہوا اور فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ ان حالات میں ملک و ملت کے لئے نت نئے مسائل تو پیدا کئے جا سکتے ہیں، ان مسائل کا حل مشکل نظر آتا ہے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد اس معاملہ کی بھرپور تحقیق ہونا چاہئے تھی کہ ہم سے کہاں کہاں اور کیا غلطیاں ہوئی ہیں اور ان کے حل کی طرف خاطر خواہ توجہ مبذول کرنا چاہئے تھی لیکن ہمارے لیڈر کھوکھلے نعروں کے بل بوتے پر حکومت کرتے رہے اور عوام اپنی جہالت اور جذباتیت کا خوب مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے لیڈروں کی پذیرائی کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں مختلف صوبوں کے درمیان دوری بڑھتی گئی اور ملک کمزور ہوتا گیا۔ قائداعظم کا پاکستان ختم ہو گیا اور قائد عوام کا نیا پاکستان ظہور پذیر ہوا۔

اس نئے پاکستان میں اپنی صنعتوں کو تباہ کر دیا گیا۔ اس طرح ملک میں بے روزگاری اور مہنگائی کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس کا آسان حل یہ نکالا گیا کہ لوگوں کو دساور بھیج دیا گیا تاکہ دوسروں کی چاکری کر کے رزق حاصل کریں۔ اس طرح ہم سیاسی غلامی سے نکل کر اقتصادی غلامی کے شکار ہو گئے۔ اس مصنوعی خوشحالی نے ہمارے ملک کو کئی دہائیاں پسماندگی کی طرف دھکیل دیا۔ غریب صوبوں کے افراد اگر ترقی یافتہ علاقوں کی طرف رجوع کرتے تو ان کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور اجتماعی قتل و غارت تک نوبت پہنچ جاتی۔

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں

مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

ریمینال

شربت

تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارض مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا نہ آنا، کثرت ریاح، سانس کا پھولنا، تیزابیت معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا ہونے والے امراض کے لئے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوافروش سے طلب فرمائیں

یاسر اعوان (ایڈووکیٹ)
انچارج لیگل سیکشن

ممتاز دواخانہ (رجسٹرڈ) — میانوالی
فون: 0311-7359072
0334-6447660

نئے پاکستان میں مروجہ جمہوری نظام کے تحت مختلف صوبوں میں دوسری سیاسی جماعتوں کی حکومت قائم کی گئی تو اسے بہانہ بازی سے ختم کر دیا گیا۔ اس طرح صوبائی تعصب کو ہوا ملی۔ کئی راہنماؤں کو غدار قرار دے کر نظر بند کر دیا گیا اور ان کی پارٹیوں کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ ہمارے ہر دلعزیز عوامی جاگیردار رہنما نے مخالفین کو کچلنے کے لئے کئی حربے استعمال کئے۔ پارلیمنٹ سے ارکان کو اٹھا کر باہر پھینک دینا ایک عام سی بات سمجھی جاتی تھی حالانکہ ایسی حرکات سے منافرت کے جذبات کو ہوا ملتی تھی۔ اسی طرح مخالفین کے جلسوں کو الٹانا اور جلوسوں کو بذریعہ طاقت منتشر کرنا ہمارے حکمرانوں کا عام وطیرہ ہے لیکن دورانِ اقتدار وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ حکومت سے رخصتی کے بعد ان کا بھی یہی حشر ہوگا۔ اس طرح یہ ایک نہ ختم ہونے والا مخالفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ملک کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

سیاست اور جمہوریت میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مختلف ارکان اپنے اپنے علاقوں کی بہتری کو ترجیح دیتے ہیں اور ملکی مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب کو بلند مقامات پر فائز کرنے کے لئے استحقاق کو تباہ کر دیتے ہیں۔ بنگالیوں کو حقیر اور کمزور گردانے کا نتیجہ ہم نے بھگت لیا۔ بعد کی سیاسی حکومت صرف دو صوبوں میں اکثریت کی حامل تھی۔ اس نے دوسرے صوبوں کو زیر اثر رکھنے کے لئے کئی ناجائز حربے استعمال کئے جو باہمی اتحاد و اتفاق کے سلسلہ میں سم قاتل ثابت ہوا۔ بعد ازاں مارشل لاء کے دور میں بھی ایک صوبے نے خوشدلی سے تعاون نہیں کیا۔ لسانی اختلافات بھی اسی تصور کی پیداوار ہے جس سے تقریباً چالیس سال تک منی پاکستان میں افراتفری مچی رہی۔ اب اس کے اثرات سے سنبھلنے کے لئے ایک صدی درکار ہے۔

تحریک آزادی اور تشکیل پاکستان کے دوران ہم نے جس لاپروائی، لوٹ مار اور مار دھاڑ کا مظاہرہ کیا تھا اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں اور تعصبات کی لہریں روز بروز افزوں ہو رہی ہیں۔ انتقالِ آبادی کے سلسلہ میں جو لاپروائی کی گئی وہ ناقابل معافی ہے۔

اگر پاکستان کی تشکیل جون 1948 میں قرار پاتی جیسا کہ برطانوی حکومت کا پہلا منصوبہ تھا تو کئی مسائل سے آسانی کے ساتھ نپٹا جا سکتا تھا۔ مسلم فوجی جو جنگِ عظیم کی وجہ سے مختلف براعظموں میں پھیلے ہوئے تھے، وہ اکٹھے ہو جاتے تو تقسیم کے عمل میں بھرپور کردار ادا کر کے کئی مصائب سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ اگر وائسرائے ہند کو اس کی خواہش کے مطابق دونوں ممالک کا کچھ عرصہ کے لئے مشترکہ گورنر جنرل تسلیم کر لیا جاتا تو ریڈ کلف ایوارڈ میں گھپلے سے محفوظ رہا جا سکتا تھا لیکن ہمارے جاگیردار پارلیمنٹ کو اقتدار حاصل کرنے اور لوٹ مار مچانے کی بہت جلدی تھی۔ اس طرح کئی ملکی مفادات کو قربان کرنا پڑا۔ مختلف اداروں اور کابینہ میں بھی صوبوں کو مناسب نمائندگی نہ دی گئی جو مستقل سر دردی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ بنگالیوں کو حقیر اور نااہل سمجھنے والوں کو بنگلہ دیش کی تیز رفتار ترقی سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور کسی بھی صوبے کے افراد کو کمتر گردانے کی غلطی سے اجتناب ضروری ہے۔ برطانوی سسٹم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کسی شعبہ میں بھی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے بلکہ غلامی میں پختگی اختیار کرتے گئے۔ ہمیں اپنا معیار قابلیت بدل کر ہر علاقے کو خدمتِ ملک و قوم کا موقع فراہم کر کے صوبائی تعصبات کو ختم کرنا چاہئے۔

(جاری ہے)

PakSitanipoint.com

آپ بیتی

لمحوں کی صلیب

میں ایک باحیا لڑکی تھی جس کی عصمت پر تقدس کے کڑے پہرے تھے.....
لیکن ایک ہوس کار پیر نے مجھے لڑکی سے عورت بنا دیا..... تہی دامن، میرا
کنوارپن اسی روز ختم ہو گیا تھا جس روز میں داتا دربار سلام کرنے گئی تھی۔

0321-6432472
☆ مرزا شبیر بیگ ساجد

Paksociety.com

برادرم عارف محمود صاحب! یہ ایک قاری کی آپ بیتی ہے جو اس نے مجھے بھجوائی تھی۔ میں نے ایک حساس قلمکار ہونے کی حیثیت سے اس بات سے بالاتر ہو کر کہ میں بھی ایک مرد ہوں اور مردوں کے خلاف قلم نہیں اٹھانا چاہئے۔ میں نے اسے پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ امید ہے آپ اور قارئین میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے۔

جگہ کی قلت کے پیش نظر آخر والد صاحب نے مجھے علیحدہ مکان میں رہنے کی اجازت دے دی اور میں نے اپنے گھر سے دور دوسرے محلے میں کرایہ پر مکان لے لیا۔ نئی جگہ اجنبی لوگ اور بیگانہ ماحول جیسے ہم کسی ویرانے میں آ گئے ہوں۔ میں صبح کا ناشتہ کر کے دکان پر چلا جاتا اور عابدہ (میری بیوی) گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ننھے خالد سے دل بہلاتی رہتی۔ میں بھی عابدہ کی تنہائی کے پیش نظر دن میں دو ایک چکر گھر کے لگا جاتا۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے گھر آیا تو عابدہ کو ایک عورت سے باتیں کرتے پایا۔ کوئی پینتیس چالیس سال کی عمر ہو گی اس کی، شفاف کھلتا ہوا رنگ کشادہ پیشانی پر بڑی بڑی چمکدار آنکھیں گو اُس کے شباب کا سورج ڈھل رہا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر بلا کی کشش اور رعنائی تھی۔

''یہ ہماری ہمسائی سیدی اور یہ ہیں ان کی لڑکی سیما''۔ عابدہ نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو خالد کو نہلا کر غسل خانے سے باہر آ رہی تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے جیسے بجلی کا کوندا سا لپک گیا۔ سولہ سترہ کا سن، مخمور آنکھیں، گداز اور متناسب جسم خوبصورت اعضاء، صراحی دار گردن، ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سیاہ زلفیں اور سرکش حُسن پہ اٹھتا ہوا شباب۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوسِ قزح نے پگھل کر انسانی شکل اختیار کر لی ہو۔ نہ جانے میری آنکھیں کب تک اس حسن کے مجسمے پر جمی رہتیں اگر خالد ابو جی کہہ کر میری ٹانگوں سے نہ چمٹ گیا ہوتا۔ میں جیسے گہری نیند سے چونک اٹھا۔

''ارے بیگم مہمانوں کو چائے وغیرہ تو پلاؤ''۔ میں نے بیگم سے کہا۔

''چائے وغیرہ تو ہم پی بھی چکے۔ عورت نے چائے کے خالی برتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خالد سیما کی گود میں جا دبکا تھا۔

''امی خالد کو تو ہم اپنے گھر لے جائیں گے۔ وہاں مٹھائی دیں گے اپنے بیٹے کو اور بہت سے کھلونے بھی۔ کیوں بھئی خالد چلو گے نا ہمارے ساتھ''۔ اس نے خالد کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور خالد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں ہاں سیما بہن لے جاؤ اس شریر کو بہت تنگ کرتا ہے مجھے''۔ عابدہ نے خالد کو پیار سے گھورتے ہوئے کہا اور جواباً وہ دھیرے سے مسکرا دی جیسے کائنات انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ہو۔

''سیما بیٹی تو بجلی ہے جو سراب کے پیچھے بھاگتی ہے۔ اگر محلے والوں کو پتہ چل گیا تو خالد چھوڑ تیرا اس گھر میں آنا جانا بھی بند ہو جائے گا''۔ سیدی نے آہ بھر کے کہا۔

''کیا مطلب؟ محلے والوں کو کیا بیر ہے آپ سے، کیا جرم کیا ہے آپ نے؟'' میں نے بیک وقت کئی سوال کر دیئے۔

''اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے کہ غریب ہیں اور یہ ایسا جرم ہے جس کی سزا جیتے جی ختم نہیں

۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اس کے
ے پر غموں کی دھول صاف نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ وہ
نے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

تب میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ اس کے
منظر میں جھانکوں کہ اتنی خوبصورت عورت اور اس
دکھی۔ پھر میں نے جھجکتے ہوئے اس سے رونے کا
پوچھ لیا۔ ہمدردی کے دو بول سن کر اس کی
وں میں رکے ہوئے طوفان کا بند ٹوٹ گیا اور وہ
تک روتی رہی۔

''اگر آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا ہو تو میں
ندہ ہوں''۔ میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔
میں نے تو محض اس لئے پوچھ لیا تھا کہ کہہ دینے سے
ن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے''۔

''اللہ نہ کرے بیٹے میں تمہاری باتوں کا برا
وں''۔ اس نے کہا۔ ''دراصل مدت کے بعد کسی منہ
سے اپنے لئے ہمدردی کے چند بول سن کر دل بھر آیا تھا
ر پھر اس نے اپنی کتھا کچھ یوں بیان کی۔

آج سے کوئی پندرہ سال پیشتر سیما کا والد اس کی
یدائش سے چند ماہ بعد ہمیں اس دنیا میں یک و تنہا
چھوڑ کر چل بسا۔ مرحوم کو عشق کی حد تک مجھ سے پیار
تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد میں نے
دوسری شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا اور اپنی پوری توجہ سیما
کی پرورش پر مرکوز کر دی۔ میرے والدین اور بہن
بھائی تو 47ء کے فسادات کی نذر ہو گئے تھے۔ ایک نانی
کی ذات تھی جو مجھے اٹھا لائی تھی۔ وہ بھی میری شادی
کے ایک ہفتہ بعد آخرت کو سدھار گئی۔ بشیر بھی اگرچہ
اپنے بھائی کی طرح خوبصورت اور جوان تھا لیکن ایک
ٹانگ سے معذور ہونے کے سبب ابھی تک کنوارہ تھا۔
بھائی کے چالیسویں کے بعد آہستہ آہستہ اس
نے لوگوں کی معرفت مجھ پر شادی کے لئے دباؤ دینا
شروع کیا۔ میں نے بہت انکار کیا لیکن محلے والوں نے
میری ایک نہ سنی۔ طرح طرح کی تاویلیں پیش کی گئیں
کہ تم جوان ہو۔ خوبصورت ہو یہ پہاڑ سی زندگی اکیلے
کیسے گزرے گی۔ تمہیں قدم قدم پر مرد کے سہارے کی
ضرورت ہو گی۔ بغیر شادی کے جوان عورت پر طرح
طرح کے الزام لگتے ہیں۔ آوازیں اٹھتی ہیں اور پھر
اسلام بھی تو دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے وغیرہ۔
مختصر یہ کہ میری مرضی کے خلاف زبردستی میرا نکاح بشیر
سے کر دیا گیا۔ اسے اللہ کی قدرت کہہ لو کہ میری بدنصیبی
کہ سیما کے بعد میں آج تک کوئی بچہ نہ پیدا کر سکی۔
جب تک میں جوان تھی بشیر نے اولاد کی اہمیت کو محسوس
نہ کیا لیکن اب چونکہ میں بڑھاپے کی طرف گامزن
ہوں اور بشیر کو بھی شاید اپنے بے اولاد ہونے کا شدید
احساس ہونے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ دو ڈھائی
سال سے مجھ سے تقریباً بیزار ہو چکا ہے۔ بات بات پر
مار پیٹ، ڈانٹ، ڈپٹ اور بانجھ پن کے طعنے، سن سن
کر میرا ناک میں دم آ چکا ہے۔ میں اب اس کی نظروں
میں وہ بنجر زمین ہوں جسے زمیندار ناکارہ سمجھ کر چھوڑ دیتا
ہے۔ میری اولاد نہیں تو بتاؤ اس میں میرا کیا قصور؟ کیا
اولاد کا ہونا نہ ہونا میرے بس میں ہے۔ اگر نہیں تو بشیر
مجھ سے کیوں نفرت کرتا ہے؟

اے کاش تقدیر پر میرا بس چل سکتا۔ وہ پھر کہنے
لگی بیٹے کون عورت ہے جسے بچوں کی خواہش نہیں ہوتی
لیکن قدرت کے کاموں میں مداخلت انسان کی قدرت
نہیں۔ میں نے بشیر سے چوری سینکڑوں علاج
کروائے۔ بیسیوں پیروں، فقیروں کے مزاروں کی
خاک چھان۔ اپنی استطاعت سے بڑھ کر روپیہ خرچ
کیا۔ میرے گھر میں سیروں کے حساب سے تعویذ
گنڈے پڑے ہیں لیکن سب بے اثر۔ البتہ ان

تعویذوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ہم ماں بیٹی محلہ میں جادوگرنیاں کے نام سے مشہور ہوگئی ہیں۔ کوئی عورت ہمیں اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ کوئی ماں اپنے بچے کو ہمارے پاس پھٹکنے نہیں دیتی اور یہ سیما ہے کہ یہ بچوں کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ دیوانی ہوئی جاتی ہے بچوں کے لئے جب سے آپ اس مکان میں آئے ہیں ہر روز آپ کے ہاں آنے پر اصرار کرتی تھی لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر کسی نے دیکھ تو لیا یہاں سے بھی بے عزت کر کے نکال دی جائیں گی۔ آج اس کی ضد سے مجبور ہو کر چلی ہی آئی۔

سیدی آنسو پونچھتی ہوئی خاموش ہوگئی اور میں کتنی دیر سوچتا رہا کہ انسان کی سوچوں کا انداز کسی قدر بدل گیا ہے۔ کس قدر بے حس ہو چکا ہے آج کا انسان۔

نہ جانے کیوں مجھے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ سیدی واقعی مظلوم ہے۔ قابل امداد ہے اور..... پھر کوئی مجھے اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتا ہوتا ہوا محسوس ہوا غفور آگے بڑھو اور اس بے سہارا عورت کے آنسو پونچھ ڈالو کہ یہی شان آدمیت ہے۔ میں نے اگرچہ اپنی بیوی کو کسی کے گھر جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا لیکن سیدی کی پُر درد داستان سن کر میرا دل پگھل گیا اور مجھے بے طرح اس پر ترس آنے لگا۔

''خالہ بے وقوف ہیں وہ لوگ جو آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں میں بشیر کو سمجھانے کی کوشش کروں گا اور میرے گھر کے دروازے بھی آپ کے لئے ہر وقت کھلے ہیں۔ آپ کو یہاں آنے سے کوئی نہیں روکے گا۔ یہی نہیں بلکہ آج سے میں خالد کو سیما کی تحویل میں دیتا ہوں''۔ میں نے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ خالد نئی آنٹی مبارک ہو۔ سیما کے چہرے پر حیا کی سرخی بکھر گئی۔ بیٹے تم کتنے عظیم ہو۔

بے اختیار سیدی نے میری پیشانی چوم لی اور وفورِ جذبات سے میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

واقعی میرے گھر میں اس کی آمد و رفت پر محلے بھر میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ بیسیوں عورتیں ہمارے گھر آئیں کہ انہیں اپنے گھر میں نہ گھسنے دیں ورنہ اولاد سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ یہ جادوگرنیاں ہیں، ڈائنیں ہیں نگاہوں سے بچوں کا کلیجہ نکال لیتی ہیں۔ جس گھر میں قدم رکھیں بیماری اور نحوست وہاں ڈیرے جما لیتی ہے اور میں سب کے جواب میں یہی کہتا کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خیر و شر کا مالک ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ یہ تعویذ گنڈے اور جادو ٹونے محض توہم پرستی ہے۔ میرا ان پر ایمان نہیں۔ ان پر یقین ایمان کی کمزوری ہے۔ یوں وہ عورتیں لاجواب ہو کر چلی جاتیں۔ کافی دنوں کے بعد بھی جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھ پر کوئی مصیبت نہیں ٹوٹی، ہم میں سے کوئی مرا نہیں بلکہ ہم پہلے سے بھی زیادہ خوش و خرم ہیں تو رفتہ رفتہ لوگ میری باتوں پر غور کرنے لگے اور ان کے ذہنوں پر پڑے تعصب اور نفرت کے اندھیرے چھٹنے لگے۔ پھر تو لوگوں نے ان ماں بیٹی کی اخلاقی اور مالی امداد کے گویا دروازے کھول دیئے۔ بہت جلدی وہ ماں بیٹی ہمارے دل میں گھر کر گئیں۔ سیدی مجھ سے بچوں کی طرح پیار کرتی۔ میرے کھانے پینے اوڑھنے بچھونے کا خاص خیال رکھتی۔ بشیر چونکہ کاروبار کے سلسلے میں سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا تھا اور رات گئے واپس آتا تھا لہٰذا وہ دونوں ماں بیٹی صبح کا ناشتہ کر کے میرے گھر چلی آتیں اور شام تک یہیں کام کرتیں۔ عابدہ کو انہوں نے گویا تخت پر بٹھا دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا، ایک دن سیدی کو اچانک چند روز کے لئے فیصل آباد جانا پڑا۔ سیما شام ہوتے ہی گھر چلی گئی۔ حالانکہ عابدہ نے کہا بھی کہ تمہارے چچا نہ جانے

ں وقت آئیں لہٰذا تم یہیں سو جاؤ لیکن وہ نہ
ے بجے دکان بند کر کے گھر آیا۔ ابھی کھانے
کر ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ باہر دروازے
ر سے دستک ہونے لگی۔ پھر سیما کی آواز سنائی
ف سے کانپی ہوئی آواز، مَیں نے دوڑ کر
ولا تو سیما کٹی ہوئی شاخ کی مانند اندر آ گری۔
پریشان حال دھجیاں اڑا گریبان نچے ہوئے
خوف سے تھر تھر کانپتا ہوا بدن جیسے اسے لرزے
پڑھا ہو۔ کچھ دیر کے لئے میرا ذہن سن ہو گیا۔
میں عابدہ بھی آ گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں
ھتے ہوئے کہا۔ سیما تم اس وقت اور اس حال
ہمارا دوپٹہ کہاں ہے اور تم آ کہاں سے رہی
میں..... میں گھر سے آ رہی ہوں عابدہ بہن!
ے گھر سے۔ اس طوفان سے نکل کر آ رہی ہوں
بلاخیزی کی اگرچہ مجھے بہا کر نہیں لے گئی لیکن
احساس پر خراشیں ضرور چھوڑ گئی ہے۔ گہری
ں اسی طوفان میں میرا دوپٹہ سر سے اتر کر چچا کے
ں میں الجھ گیا۔ میرے گریبان کے چیتھڑے اور
ے سینے اور گالوں پر خون کی سرخ لکیریں دیکھ رہی
جی..... یہ ان ہاتھوں کی کارستانی ہے جو بیٹیوں کی
ت کے تحفظ میں کٹ جایا کرتے ہیں۔ وہ
ں لے لے کر رونے لگی۔

''اوہ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ سیما صاف صاف
۔ میں نے درمیان ہی میں بات کاٹ دی اور وہ
وں میں بھیگی آواز میں کہنے لگی آپ کے ہاں سے
ے کے بعد میں نے جلدی جلدی کھانا تیار کیا اور
غیرہ بچھا کر چچا کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر
چچا آ گیا اور بیساکھی ایک طرف رکھ کر دالان میں
ی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کھانا نکال کر اس کے
نے رکھ دیا اور خود پانی لینے باہر جانے لگی تو اس نے
لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ اف اس کی خوفناک حد تک
سرخ آنکھوں میں شیطانیت کے سائے لہرا رہے تھے
اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا ہے۔

''آپ کھانا کھائیں میں آپ کے لئے پانی لاتی
ہوں''۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سیما! مجھے کچھ نہیں چاہئے، مجھے صرف تمہاری
ضرورت ہے۔ میں پیاسا ہوں اور..... یہ پیاس پانی کی
نہیں، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ یہ پیاس تم سے ہی
بجھ سکتی ہے۔ آؤ مجھے سیر کر دو''۔ میرے گرد اس کی
بانہوں کا حلقہ تنگ ہونے لگا۔

''چچا جان میں سیما ہوں ہوش میں آیئے چچا
جان مجھے پہچانیئے۔ میں سیما ہوں تمہاری بھتیجی تمہاری
بیٹی''۔ میں نے اس کے بازوؤں میں کسمساتے ہوئے
کہا۔

''کون بیٹی کس کی بیٹی میری کوئی بیٹی نہیں مجھے
کچھ دکھائی نہیں دیتا تمہارے حسن نے مجھے اندھا کر
دیا ہے۔ اس وقت مجھے تسکین چاہئے یہ رشتوں کی بات
کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ آؤ میرے سینے سے
لگ جاؤ سیما کہ میں نے تمہیں پرورش کیا ہے پال پوس
کر جوان کیا ہے سیما آج میں اپنی اس خدمت کا صلہ
چاہتا ہوں''۔ وہ مجسم شیطان نظر آ رہا تھا۔

''بے غیرت بے حیا تیری یہ جرأت''۔ میں نے
اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر ہم دونوں گتھم گتھا ہو
گئے۔ اس دھینگا مشتی میں اس نے میرے لباس کو تار
تار کر دیا اور..... بے تحاشا وہ میرے جسم کو کاٹتا رہا۔
اگرچہ وہ معذور تھا لیکن تھا تو مرد۔ میں بھلا کہاں تک
اس کا مقابلہ کرتی۔ قریب تھا کہ میں بے بس ہو کر گر
پڑتی کہ اچانک میری نظر بیساکھی پر پڑی جسے اٹھا کر
میں نے اس کی ٹانگ پر دے مارا۔ وہ کراہ کر گر پڑا اور
میں بھاگ کر یہاں آ گئی۔

Pakistanipoint.com

''سیما!'' میری آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں کتنی ہی دیر سوچتا رہا کہ کیا خون اتنا بھی سفید ہو سکتا ہے۔ کیا قرابت اور اپنائیت کے کسی رشتے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیا انسانیت اپنے اوصاف سے عاری ہو چکی ہے۔

یوں لگتا تھا کہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ کیا زمانہ آ چلا ہے کہ اپنے خون میں بھی بدی سرائیت کر گئی ہے۔ میرے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ ''میں اس بدطینت کی کھال کھینچ لوں گا۔ تمہارے گریبان تک پہنچنے والے ہاتھ کاٹ دوں گا''۔ میں غصے میں پاگل ہو کر چیخنے لگا۔ پھر میں چند آدمیوں کو لے کر بشیر کے ہاں گیا۔ اس کو لعن طعن کے علاوہ جوتیاں بھی لگائیں۔ بشیر نے گڑگڑا کر اس کمینگی کی معافی مانگ لی اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔ جتنے روز سیدی فیصل آباد رہی سیما احتیاطاً ہمارے گھر ہی رہی۔ سیدی آئی اور بعد کے حالات سن کر یوں گم صم سی ہو گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ وہ بے چاری اس زیادتی پر بشیر سے احتجاج بھی نہ کر سکی جیسے کوئی مجبوری اس کی زبان پر تالہ بن کر لٹک رہی تھی۔ شاید اپنے بانجھ پن کے احساس سے وہ خاموش تھی۔ بس اس روز سے سیدی کے چہرے کی بشاشت ختم ہو گئی۔ وہ انجانی سوچوں میں غرق گھنٹوں آسمان کی وسعتوں میں گھورتی رہتی۔ اگرچہ ہم نے ہر ممکن اسے خوش رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ دن بدن غم کی آگ میں گھلتی چلی گئی۔

سیما کو ہمارے گھر آتے ایک عرصہ ہو چلا تھا۔ کئی بار تنہائی میں بھی مجھے اس سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن وہ حیا کی دیوی آنکھوں پر پلکوں کے پردے گرائے گزر جاتی۔ اس طویل عرصہ میں بھی اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جسے اخلاق گراوٹ، کردار کی ناپختگی یا بے حیائی کا نام دیا جائے۔ اگرچہ میں نے اس کی زبوں حالی پر ترس کھا کر انسانی ہمدردی کے ناطے اسے اپنے گھر آنے جانے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتیں۔ شاید اسی لئے کہ رحم اور ہمدردی محبت کی راہیں استوار کرتی ہیں۔ تو کیا مجھے اس سے محبت ہے۔ میں اکثر اپنے آپ سے سوال کرتا۔ اگرچہ میرے پاس اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ تھا لیکن پھر بھی میرا جی یہی چاہتا کہ میں اسے دیکھتا ہی رہوں۔ جیسے میری زندگی کی دھڑکنیں اس سے ہم آہنگ ہو چکی ہیں وہ چلتی تو یوں لگتا جیسے ریشم کے تھان کھل رہے ہوں۔ وہ افسردہ ہوتی تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا اور وہ مسکراتی تو میرے ذہن سے ہر رنج ڈھل جاتا۔ میرے جذبات میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ مصلحت اور پیش بینی کے بندٹوٹنے لگتے۔ کائنات میری نظروں میں دھندلانے لگتی کہ معاً عابدہ کا چہرہ میری نظروں میں گھوم جاتا اور دوسرے ہی لمحے یہ طلسم ختم ہو جاتا۔

طارق کی پیدائش کی رات وہ ہمارے ہی گھر رہی۔ لیڈی ڈاکٹر سرِ شام ہی ہدایات دے کر چلی گئی۔ سیما کی تیمارداری میں عابدہ جلد ہی آرام کی نیند سو گئی۔ کوئی نو بجے رات میری والدہ (جو کہ چند روز سے ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں) نے کہا سیما بیٹی تم بھی کچھ دیر آرام کر لو میں عابدہ کے پاس بیٹھتی ہوں۔ سیما بادل نخواستہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد مجھے کسی ضرورت کے تحت اس کمرے میں جانا پڑا۔ سیما پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اس خوابیدہ حسن کو دیکھ کر میری نگاہیں کتنی ہی دیر اس کے مرمریں جسم کے نشیب و فراز میں الجھی رہیں۔ پھر میں بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔ میں اسے جھنجھوڑ ہی دیتا کہ میرا ضمیر

چیخ اٹھا۔ ہوش میں آؤ غفور کہ یہ بیوی کے حقوق سے غداری ہے۔ عقل کے ناخن لو غفور کہ تم پھولوں سے ڈھکی شاہراہ چھوڑ کر ان راستوں کی طرف جا رہے ہو جہاں کانٹے ہیں۔ غفور تیرے پاس کیا نہیں۔ خوبصورت اور وفا شعار بیوی، باوقار کاروبار، گھر کا آنگن چاند سے بچوں سے سجا ہے پھر تم کن اندھیروں کی تلاش میں بھٹک رہے ہو؟ اور پھر مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا اور میں کانپ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

ضمیر اور دل کی کشمکش میں کون جیتا اور کون ہارا میں کچھ نہیں جانتا لیکن سیما کی چاہت کا میٹھا زہر رفتہ رفتہ میرے رگ و پے میں سماتا چلا گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میری منزل نہیں، وہ میرے لئے شجر ممنوعہ ہے۔ ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے، ندی کے دو کناروں کی طرح ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کبھی آپس میں نہیں مل پاتے۔ کئی بار سوچا کہ اسے ذہن سے جھٹک دوں مگر وہ میرے قلب و ذہن پر گہری دھند کی طرح چھاتی چلی گئی۔

سیدی اُس روز خلاف توقع بہت ہی خوش تھی۔ اس کا غموں سے مضمحل چہرہ شگفتہ پھولوں کی طرح تر و تازہ ہو رہا تھا جیسے وہ پھر سے جوان ہو رہی ہو۔ میں حیران تھا کہ آخر کیا وجہ ہے؟ میں نے سیما سے اس انقلاب کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ سیدی کی فرمائش پر حیدر آباد سے خالہ جمیلہ (محلے کی عورت) کے پیر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی دعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ ان کے تعویذ گونی کی طرح نشانے پر بیٹھتے ہیں۔ اولاد کے بارے میں تو خاص کر ان کے تعویذ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب تک ہزاروں لوگ ان سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔ سیما چپ ہو گئی اور میرے ذہن کی سکرین پر ہزاروں بہروپئے سرکنے لگے جو پیروں کا لبادہ اوڑھ کر جونکوں کی طرح معاشرے کے وجود سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ولایت کی آڑ میں لوگوں کے اعتماد کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ مردار خور گدھوں کی طرح سادہ لوح مریدوں کی غیرت اور ناموس کو نوچ رہے ہیں۔ آہ! یہ نفس کے کتے جو پیٹ کی خاطر انسانیت کی سربلندی کو پاؤں میں روند ڈالتے ہیں۔ ایک وہ پیر تھے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر دین کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ مساوات کا درس دیا کرتے تھے اور ایک یہ پیر ہیں جو اپنے پیٹ کے لئے غریب اور مفلس مریدوں کے منہ کا نوالہ تک چھین لیتے ہیں۔ اپنے اور خلق خدا کے مابین تکلف اور جھوٹے وقار کی اتنی اونچی دیوار کھڑی کر لیتے ہیں جسے نہ کوئی پھاند کر ان کا قرب حاصل کر سکے اور نہ ان کی اصلیت کو جان سکے۔

میں اگرچہ پیروں کے سخت خلاف ہوں مگر اس وقت میں سیدی پر اپنے جذبات کا اظہار کر کے اس کو رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ سیدی پرستش کی حد تک پیروں، فقیروں سے عقیدت رکھتی تھی۔ دوسرے روز پیر صاحب آ پہنچے۔ وہ منظر بھی قابل دید تھا جب پیر صاحب بس سے اترے بیسیوں عقیدت مندوں کے جلوس میں ہاتھوں میں کوئی دو گز لمبی تسبیح پکڑے اک شان بے نیازی سے چلے آ رہے تھے۔ حق اللہ ہو کے شور میں کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مرید جوق در جوق آتے اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر ان کے ساتھ ہو لیتے۔ پیر کی آمد کے ساتھ ہی سیما کا ہمارے ہاں آنا جانا بند ہو گیا۔ نہ جانے کیوں؟ اور پھر کوئی دس روز بعد ایک صبح وہ دوڑتی ہوئی ہمارے گھر آئی اور عابدہ سے چمٹ کر رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

مجھے معاف کر دینا باجی میں مجبور تھی۔ چچا نے پیر صاحب سے کہہ کر مجھے آپ کے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ آج چچا اور پیر صاحب زبردستی مجھے داتا دربار

PakistaniPoint.com

لے جا رہے ہیں۔ میرا دل کسی انجانے خوف سے بیٹھا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے۔ باجی دعا کرنا اگر زندہ آ گئی تو پھر ملاقات ہو گی۔ اچھا خدا حافظ''۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

اگلے روز محلے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ سیما لاہور میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ سیدی بے چاری نے رو رو کر برا حال کر لیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ سیما کو اس کے چچا بشیر اور پیر نور شاہ کے ایما پر اغوا کیا گیا ہے۔ میں نے سیدی کے علاوہ اور کئی لوگوں پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا مگر سب نے الٹا مجھے ہی بُرا بھلا کہا۔ یہ عقل کے اندھے لوگ پیروں کے خلاف کوئی بات نہیں سننا چاہتے تھے۔ ہم دونوں میاں بیوی سیدی کی حالت زار پر کڑھ کر رہ گئے۔

چوتھے روز سیما ڈرامائی انداز میں واپس گھر پہنچ گئی۔ ہم سب اسے دیکھنے کے لئے گئے۔ اف بے چاری سیما جیسے برسوں کی مریض ہو۔ میری بیوی عابدہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پھر ہمارے اصرار پر سیما کہنے لگی۔ آپ لوگ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ خالہ جمیلہ کے گھر کی بجائے پیر صاحب کو ہمارے گھر میں ٹھہرایا گیا تھا۔ محض اس لئے کہ یہ عظیم ہستی میری والدہ کی فرمائش پر نازل ہوئی تھی۔ پیر صاحب کی آمد کے تھوڑی دیر بعد مستورات کی باری آئی کہ وہ بھی اس عجوبہ روزگار کی زیارت کر سکیں۔ پیر صاحب ہر آنے والی عورت کو یوں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے پرکھ رہے ہوں۔ اپنی باری پہ میں نے بھی پیر صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو..... پیر صاحب نے آہستہ سے میرے ہاتھ کو دبایا..... کسی پیشہ وار دلال کی طرح..... مجھے جیسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا تو پیر صاحب نے کچھ اس طرح سے گھور کر میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہم گستاخی کی بڑی سخت سزا دیا کرتے ہیں۔ پیر صاحب پلنگ پر ایک موٹے تکیے کے سہارے ٹانگیں پسارے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ان کے ہاتھ پاؤں دبا رہے تھے اور باقی فرطِ عقیدت سے سر جھکائے ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور..... میں پلنگ کی مضبوطی کا اندازہ کر رہی تھی جو اس ڈھائی تین من کی لاش کو سہارے ہوئے تھا۔

چچا بشیر نے دو کمرے پیر کے لئے مختص کر دیئے تھے۔ ایک میں تو سارا دن لوگوں کو مال ملازمت اور اولاد سے مالا مال کیا جاتا اور دوسرا کمرہ پیر صاحب کی آرام گاہ تھا جس میں لوگوں کی طرف سے آئے ہوئے قیمتی تحائف بھی رکھے جاتے تھے۔ رات کو اگر کوئی ایمرجنسی کیس آ جاتا تو اس کا بھگتانا بھی اسی کمرے میں ہوتا۔ اگرچہ ہمارے شہر میں سینکڑوں لوگ نور شاہ کے مرید تھے لیکن نہ جانے کیوں مجھ پہ سب کچھ جعلی لگتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے، دھوکہ ہے، نمائش ہے۔ پیر نے جس انداز میں میرا ہاتھ دبایا تھا اس سے اس کی اصلیت واضح ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ دیکھوں تو لوگوں کو نیکی اور عمل کی تلقین کرنے والے خود کیا ہیں۔ اس دن کے بعد رات کو جب سب لوگ سو جاتے تو میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکلتی اور پیر کے کمرے کے دروازے کی درز پر آنکھ جما دیتی۔ دوسرے روز پیر نے چچا بشیر سے کہا کہ میں نے رات استخارہ کیا ہے۔ نظر یہ آیا ہے کہ سیدی پر کسی نے جادو کر کے اس کی کوکھ باندھ دی ہے اور اس جادو کا زور توڑنے کے لئے مجھے بڑی ریاضت کرنی پڑے گی۔ سیدی کو پچھلی رات سامنے بٹھا کر سات روز تک وظیفہ کرنا پڑے گا۔ جس کا ہدیہ تین ہزار روپے ہو گا۔

''بندہ نوازی ہے سرکار کی میں کل ہی تین ہزار ادا

کر دوں گا''۔ چچا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور اگلے روز اکلوتی بھینس فروخت کر کے پیر کو تین ہزار ادا کر دیئے گئے۔

جوں جوں شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے میرا دل کسی انجانے خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ کام کاج سے فارغ ہو کر امی تو کوئی آٹھ بجے شام ہی پیر کے بلانے پر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ میں بستر پر پڑی سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میرے کانوں میں بار بار پیر کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ سیدی پر کسی نے جادو کر کے اس کی کوکھ باندھ دی ہے اور اس کا زور توڑنے کے لئے مجھے بڑی ریاضت کرنا پڑے گی۔ میں حیران تھی کہ وہ کون سا عمل ہے جو معمول کو سامنے بٹھا کر کیا جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح پیر امی کو بھی تو تعویذ دے سکتا ہے۔ پڑھنے کو کوئی وظیفہ بتا سکتا ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے۔ پھر اگلے ہی لمحے میں نے اپنے کمرے کی بتی بجھائی اور پیر کے کمرے میں جھانکنے لگی۔ پیر ہاتھ میں تسبیح لئے پلنگ پر بیٹھا کچھ بڑبڑا رہا تھا اور امی اس کے سامنے زمین پر سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔ دفعتہً پیر نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔ سیدی مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہارے مقدر میں اولاد نہیں۔

''ایسا نہ کہیے سرکار! رحم کیجئے مجھ گنہگار پر۔ کچھ کیجئے حضور! کچھ کیجئے کہ اگر ایسا نہ ہو سکا تو بشیر مجھے طلاق دے دے گا، گھر سے نکال دے گا۔ سرکار وہ بہت ظالم ہے''۔ امی روتے ہوئے اس خبیث کے پاؤں پر سر رگڑنے لگی۔

''ہوں!'' بس ہوں کے ساتھ نور شاہ نے بھرپور نظروں سے امی کے سراپا کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''اچھا میں پھر کوشش کرتا ہوں''۔ وہ ایک کتاب کھول کر بیٹھ گیا اور

Pakistanipoint.com

کتنی ہی دیر انگلیوں پر کچھ پڑھ پڑھ کر گنتا رہا۔

''سرکار! کوئی امید کی کرن نظر آئی؟'' امی نے اس کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔

پیر نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''صرف ایک طریقہ ہے مگر.....''

''مگر کیا حضور! آپ کہیں تو سہی میں اولاد کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔ جلدی کہہ دیجئے سرکار، کیا طریقہ ہے؟'' امی نے بے تاب ہو کر اس کے منہ کی بات اچک لی۔

''سیدی! میں کہتا ہوں کہ تم سے وہ عمل نہ ہو سکے گا''۔ پیر نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ ماری۔

''اب کہہ بھی چکئے حضور! خدا کی قسم، اولاد کے لئے میں اپنی جان بھی دے دوں گی۔ ہر وہ کام کر گزروں گی جو میرے قبضہ قدرت میں ہے''۔ امی کو جیسے مایوسی کے اندھیروں میں امید کی کرن نظر آ گئی تھی۔

''تو پھر یہ لو''۔ نور شاہ نے امی کی طرف ایک تعویذ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے اپنی کمر کے ساتھ اس طرح باندھ لو کہ یہ نیچے تک لٹکتا رہے۔ پھر پیر نے عمل بتایا، اسے سن کر امی کا سر جھک گیا۔

''تم یہ عمل کر لو تو تم امید سے ہو جاؤ گی۔ اس کے علاوہ کسی بھی طور تمہاری مشکل حل ہوتی نظر نہیں آتی''۔

نور شاہ خاموش ہو گیا اور امی کے چہرے کا رنگ بھی سیاہ پڑنے لگا جیسے انہیں کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے چھت کو گھورتی رہیں جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''سیدی! میں نہ کہتا تھا کہ تم سے یہ عمل نہ ہو سکے گا''۔ نور شاہ کی گھاگ نظریں امی کو مائل ہوتے تاڑ گئی تھیں۔

''پیر جی! اگر پھر بھی گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا تو؟'' امی جیسے کسی کنوئیں سے بول رہی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہو سیدی! قضا ٹل سکتی ہے نور شاہ کا تعویذ خطا نہیں جا سکتا''۔ پیر جی یکا یک جلال میں آ گئے۔

''تو پیر جی پھر یہ عمل ہو گا، ضرور ہو گا۔ ابھی اور اسی وقت ہو گا''۔ امی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ نور شاہ تو جیسے بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ جھٹ سے تسبیح پرے پھینکی اور پارسائی کا لبادہ اتر گیا۔

میں پیر کو اس کے اصل روپ میں دیکھ رہی تھی۔ مرید کو اس کی عقیدت کا ثمرہ مل رہا تھا۔ شرافت نے منہ چھپا لیا۔ انسانیت سسک اٹھی۔ لوگوں کو آخرت کی سرخروئی کی بشارت دینے والا خود سرتا پا جہنم کی آگ میں غرق ہو گیا تھا۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ضرورت مند انسان کتنا مجبور ہوتا ہے۔ آج میری بدنصیب ماں اولاد کی خاطر ذلالت کی انتہائی پستیوں میں جا گری تھی۔ بے چاری عورت جس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اور اس کی تذلیل کرنا ہر دور میں مرد اپنا فرض سمجھتا رہا ہے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ زور زور سے چلاؤں اور لوگوں کو پیر کی کرتوت سے آگاہ کروں مگر..... والدہ کی عزت (جو اگر چہ لٹ چکی تھی) کا خیال آتا تھا اور پھر یہ ضعیف الاعتقاد لوگ کب میری باتوں کا یقین کرتے۔ یہ بے وقوف تو ان پیروں کو زمین پر خدا کا نائب سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں کائنات کا نظام ان پیروں کے ہی اشاروں پر چلتا ہے۔ خدا کی طرح وہ بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں، جو چاہیں کریں اور..... ان کے حکم سے سرتابی خدا کے قہر کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ یہ خدا کے خلیفہ ہیں انہیں خلق خدا کی عزت و ناموس سے کھیلنے کی

کھلی چھٹی ہے۔ کیونکہ ان کے گناہوں میں بھی ثواب کا پہلو پوشیدہ ہے جسے ہم جیسے کور چشم نہیں پرکھ سکتے۔

میں خیالوں میں غلطاں گرتی پڑتی چارپائی پر آ گری اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ انسان کو خدا کی ذات سے رُوگردانی کی کچھ تو سزا ملنی چاہئے۔ میں والدہ کو دیکھ کر سوچتی کہ کیا دنیا میں عورت سے زیادہ بے وقوف مخلوق بھی ہوسکتی ہے؟ کیا مرد اس قدر بے غیرت بھی ہوسکتا ہے کہ جوان بیوی کو غیر مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دے؟ کیا انسان خدا سے اس قدر بیزار بھی ہوسکتا ہے کہ انسان کو خدا کا شریک بنا لے؟

دن گزرتے رہے نور شاہ کا عمل جاری رہا۔ امی ہر وقت کسی نئی نویلی دلہن کی طرح بنی سنوری رہتی جیسے ان کا جوبن پھر سے لوٹ آیا ہو اور میں خدا سے اپنے تحفظ کی دعائیں مانگتی رہی۔ ایک ہفتہ گزر گیا، عمل ختم ہو گیا یا ایک ہی کھلونے سے کھیلتے کھیلتے نور شاہ کا دل بھر چکا تھا۔ پھر یکا یک پیر نے مجھ میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ بھوکے گدھ کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا لیکن میں اس کی صورت تک دیکھنے سے بیزار تھی اور امی کا اصرار تھا کہ میں اس کے قریب رہا کروں۔ میرا جی چاہتا کہ اس مردود کا منہ نوچ لوں مگر میں کچھ بھی نہ کر سکی، کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آخر کہتی بھی تو کس سے، سب کے سب تو گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر نور شاہ کی عقیدت و احترام کی پٹی بندھی تھی۔ نور شاہ نے کئی بار تنہائی میں موقع پا کر مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے ہر بار دھتکار دیا۔

جب وہ کسی صورت مجھے مائل نہ کر سکا تو اس نے ایک اور پینترا بدلا۔ ایک رات چچا بشیر سے کہنے لگا۔ بشیر! رات داتا صاحب نے خواب میں مجھے بشارت دی ہے کہ جس گھر میں تم مہمان ہو اس گھرانے پر ایک مصیبت ٹوٹنے والی ہے اور اس مصیبت کا باعث ان کی لڑکی سیما ہے۔ وہ گمراہ ہو چکی ہے، تمہیں صدقہ خیرات کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ کل جمعرات کو اس بچی کو لاہور دربار داتا صاحب لے جاؤ۔ دیگ بھی دے آؤ اور بچی سے کہو کہ وہ بھی کچھ منت سماجت کرے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا اور آپ لوگوں کی بہتری کی دعا کروں گا۔

چچا بشیر تو پہلے ہی میرا دشمن تھا، پیر کی باتیں سن کر بھڑک اٹھا اور میری اچھی خاصی مرمت کر دی۔ چچا نے فوری طور پر دو بکریاں بیچیں اور رقم صدقے کے نام پر نور شاہ کو دے دی۔ اگلے روز مجھے لے کر وہ لوگ لاہور چل دیئے۔ دیگ اور خیرات دینے کے بعد شام تک محفل سماع سنتے رہے۔ شام کو واپسی کے ذکر پر پیر صاحب فرمانے لگے۔ بھئی رات ہو چلی ہے صبح چلے جانا۔ ایک رات اور داتا دربار کی قربت میں گزار لو کہ تمہاری زندگی بھر کے گناہ کٹ جائیں گے۔ کون جانے پھر یہاں کب آنا نصیب ہو۔ چچا تو پیر کی حکم عدولی کفر سمجھتے تھے لہٰذا فوراً مان گئے۔

دربار سے ملحقہ آبادی میں ہم دور تک ایک تنگ و تاریک گلی میں چلتے چلے گئے۔ آخر پیر ایک بوسیدہ سے دروازے پر پڑا ٹاپ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک عجیب سرنگ نما سا مکان تھا۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی تھی اور دوسرے کونے میں ایک بھدی سی ادھیڑ عمر کی بڑھیا چولہے پر روٹی پکا رہی تھی۔ گہرا سانولا رنگ گول چہرہ تنگ پیشانی چوڑا منہ چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں دھوئیں اور ٹمٹماتے ہوئے دیے کی دھندلی روشنی میں وہ عورت کوئی جادوگرنی معلوم ہوتی تھی جو آگ کے سامنے بیٹھی کوئی عمل پڑھ رہی ہو۔

میرے سراپا میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہم

دالان میں بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''حلیمہ! جلدی کرو بھئی مہمانوں کو بھوک لگی ہو گی''۔ پیر بڑھیا سے مخاطب ہوا۔

''بس کھانا تیار ہے سرکار! مہمانوں کے بستر پچھلے کمرے میں بچھے ہیں، انہیں بٹھایئے میں ابھی کھانا لے کر آئی''۔ بڑھیا نے لمبے لمبے مسی آلود دانت نکالتے ہوئے کہا۔ دالان کے ساتھ ہی آگے پیچھے غار نما دو کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں اور آخری کوٹھڑی میں ہمارے بستر۔ مجھے بستر پر بٹھا کر نور شاہ چچا کو لے کر باہر نکل گیا۔

میری چھٹی حس کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ جیسے جلد ہی کوئی طوفان آنے والا ہو۔ کوئی ایک گھنٹہ میں اکیلی بیٹھی رہی۔ میرا شک یقین میں بدلنے لگا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ پھر میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اف میرے خدا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میرے حواس جواب دینے لگے۔ قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑتی کہ معاً دروازہ دھڑام سے کھلا اور نور شاہ لڑکھڑاتے قدموں اندر داخل ہوا۔ میں دوڑ کر کر ایک کونے میں دبک گئی۔ خوف سے میرا جسم پسینے میں نہا گیا۔ پیر نے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور میری طرف بڑھنے لگا۔

''رحم کیجئے مجھ پر پیر جی!'' میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''رحم اور تجھ پر۔ میں نے تمہاری قربت کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے لیکن تمہیں تو مجھ سے نفرت تھی اور آج میں اس نفرت کو پیار میں بدل دوں گا''۔ پیر نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

''چچا جان! مجھے اس درندے سے بچایئے''۔ میں زور زور سے چیخنے لگی۔

''ہاہاہاہا..... چچا جان..... چچا جان میرے بعد میں آئیں گے''۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے زور سے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا اور وہ مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

''یااللہ مجھے اس شیطان سے بچا کہ تُو ہر شے پر قادر ہے۔ میری بے بسی کی لاج رکھو میرے مالک''۔

''اب تجھے اپنے حسن کا خراج دینا ہو گا، میرے ہاتھوں تجھے آج کوئی نہیں بچا سکے گا۔ کوئی نہیں بچا سکے گا'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا اور ..... میں کسی غیبی امداد کے انتظار میں پوری قوت سے اس سے الجھ پڑی..... کوئی معجزہ رُونما نہ ہوا۔ کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ میری قوتِ مدافعت جواب دینے لگی۔ آخر وہ مرد تھا پھر میں نیم بے ہوش ہو گئی اور.....

جب مجھے ہوش آیا تو میں بستر پر اوندھے منہ برہنہ پڑی تھی۔ آہ میں داتا دربار کے قرب میں لٹ گئی۔ داتا کی نگری میں داتا کے پرستاروں نے میرے سر سے چادرِ عصمت کھینچ لی اور داتا خاموش رہے۔ میں ان ہی سوچوں میں غرق تھی کہ دروازہ پھر کھلا اور چچا بشیر شراب کے نشے میں دھت لنگڑاتا ہوا میری چارپائی پر آ گرا۔ عین اسی لمحے نور شاہ بھی خنجر لئے اندر داخل ہوا۔

''اٹھو بشیر اپنی بے عزتی کا بدلہ لو''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ میری نظریں دھندلانے لگیں۔ اف یہ لنگڑا اور..... اس قدر کمینگی پر اتر آئے گا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرسوں پھولنے لگی اور ایک دفعہ میں پھر بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوب گئی۔

آدھی رات ہو گی جب مجھے ہوش آیا پھر مجھے کمرے کے باہر کچھ کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں۔

Pakistanipoint.com

جیسے کسی سودے کا مول تول ہو اور..... پھر کڑکڑاتے نوٹوں کی آواز آنے لگی۔ نوٹ..... جس کے عوض ایمان غیرت و ناموس انسانیت ضرورت پڑے تو لوگ خدا کو بھی بیچ دیتے ہیں۔ مجھے ہول سا اٹھنے لگا۔

''اچھا تو یہ لو پانچ ہزار اور آج شام گھر جا کر یہ مشہور کر دینا کہ سیما کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے''۔ پیر نور شاہ کی آواز واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ اف میرے خدا مجھے کن ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے سوچا۔ میرا سودا ہو چکا تھا اور میں محض خریدار کے رحم و کرم پر رہ گئی تھی۔ کیا میں اب ہمیشہ کے لئے اس بھیڑیے کی قید میں پھنس چکی ہوں کیا میں کبھی رہا نہ ہو سکوں گی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں گڈمڈ ہونے لگیں اور.....

پھر تصور میں ایک بھیانک منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ یوں لگا جیسے میں کسی اونچے درخت سے گرے ہوئے پکے پھل کی طرح سوکھے پتوں پر اوندھے منہ پڑی ہوں۔ میرا سینہ زخمی ہو چکا ہے اور مجھ میں اس بلند شاخ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں جس سے ٹوٹ کر میں گری تھی۔ پھر میں نے ایک تاریک غار دیکھا جہاں چار سو عورتوں کو برہنہ کر کے گرم کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہوں میں پھینکا جا رہا تھا۔ دردناک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔ معاً ایک آدمی میری طرف بڑھا اور.....خوف سے میری چیخ نکل گئی اور میں گھور اندھیروں میں اتر گئی۔

ہوش آیا تو میں ایک کار کی پچھلی سیٹ پر تکیے کے سہارے نیم دراز تھی اور وہی چڑیل نما بڑھیا میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے کراہٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی پسلیوں میں چبھن کا احساس ہوا، میں نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

''خبردار لونڈیا اگر ہلنے کی کوشش کی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی''۔ بڑھیا نے چمکدار خنجر میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا اور میں کسی پرکٹی کبوتری کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ گاڑی چلتی رہی اور میں انسان کے اس بھیانک روپ پر غور کرتی رہی کہ شاید یہی انسان کا اصل روپ ہو۔ اب گاڑی ایک شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے اتفاق کہہ لیں یا میری خوش نصیبی کہ ایک پُررونق بازار میں سے گزرتے ہوئے گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

''کیا بات ہے منظور؟'' پیر نے تشویشناک لہجے میں ڈرائیور سے پوچھا۔

''فین بیلٹ ٹوٹ گیا ہے شاید سرکار!''۔ ڈرائیور نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ پیر نے بڑھیا سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور بڑھیا نے ایک دم خنجر پر دباؤ بڑھا دیا۔ میں ابھی حالات کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ مجھے ونڈ سکرین پر ایک پولیس مین ڈرائیور سے تحکمانہ لہجے میں کہتا ہوا دکھائی دیا۔ ''تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ یہ چوراہا ہے۔ پرے کرو گاڑی دیکھ نہیں رہے کہاں تک ٹریفک جام ہو چکی ہے''۔ سپاہی کو دیکھ کر میرے حوصلے یکبارگی بلند ہو گئے اور میں نے بڑھیا کے خنجر سے بے نیاز زور کی چیخ ماردی..... اگلے ہی لمحے سپاہی میرے سر پہ تھا۔ میں اور زور زور سے چلانے لگی۔ نور شاہ نے دروازہ کھول کر بھاگنے کی کوشش کی مگر سپاہی نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ بڑھیا خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔ اسی اثنا میں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مجھے گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ جب میں نے یہ بتایا کہ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے تو لوگوں کا ہجوم ان تینوں پر ٹوٹ پڑا اور منٹوں میں ان کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔

یہ ملتان شہر تھا جس کے ایک بازار میں یہ واقعہ

پیش آیا تھا۔ ہمیں تھانے لے جایا گیا اور پوچھ گچھ کے بعد ان تینوں کی صفائی ہونے لگی۔ دوران تفتیش نور شاہ نے بتایا کہ وہ ایک مفرور قیدی ہے جو پشاور جیل میں ایک قتل کے کیس میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ آج سے پانچ سال قبل وہ جیل سے بھاگ نکلا۔ باہر نکلتے ہی وہ ایک سماج دشمن گروہ کے ہتھے چڑھ گیا جس کا کام دور دراز کے علاقوں سے نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے کراچی کے بازار حسن میں فروخت کرنا تھا۔ اس گروہ کے آدمی پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے قانون کی نظروں سے بچنے کے لئے نام نہاد پیروں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعیف الاعتقاد لوگ بڑی آسانی سے دھوکا کھا جاتے تھے۔

ٹیلی فون پر میرے گھر والوں کو اطلاع کر دی گئی اور ..... مجھے اس رات تھانے ہی میں رکھا گیا۔ دوسرے روز میرے خالو اور میری والدہ ملتان پہنچ گئے۔ اس سے اگلے دن عدالتی کارروائی مکمل کر کے نور شاہ کو پھر سے جیل بھیج دیا گیا اور میں اپنے گھر چلی آئی۔

سیما چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل چکا تھا جس پر ایک عجیب سی معصومیت کھیل رہی تھی۔ اک تقدس تھا۔ آہ بے چاری سیما، بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں زمانے کی بے حسی پہ خون کے آنسو بہاتا ہوا گھر چلا آیا۔ اس رات سیما میرے حواس پر ایسی چھائی کہ خواب میں بھی سیما ہی دکھائی دیتی رہی۔ پریشان خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی سی۔ پھر میں نے سیما کو ایک تپتے ہوئے ریگزار میں یک و تنہا بھٹکتے ہوئے پایا۔ گویا وہ زندگی کے اس موڑ پر کھڑی تھی جہاں امید کی ہر کرن بجھ جاتی ہے۔ زندگی صرف ایک تاریک دائرہ بن کر رہ جاتی ہے۔ میں نے سیما کو ان اندھیروں سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔ وہ کسی کو پکار رہی تھی، آوازیں دے رہی تھی مگر..... اس کی آوازیں انہیں تاریکیوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتیں۔ میں نے اس کی کٹورہ ایسی خوبصورت آنکھوں کی لمبی لمبی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے بے بسی کے آنسو بھی دیکھے جیسے وہ کسی کے انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے لئے رو رو کر دل بہلا رہی ہو۔ وہ بار بار ان اندھیروں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی جیسے ابھی ان ظلمتوں سے نور کی کرنیں پھوٹیں گی۔

اسی طرح کے خوابوں سے کھیلتے رات گزر گئی۔ دو تین روز کے بعد سیما مستقل طور پر اپنے خالو کے پاس فیصل آباد چلی گئی۔ مجھے ایک ایسے روحانی کرب میں مبتلا چھوڑ کر جو زیست کی ہر آسائش میسر ہوتے ہوئے بھی انسان کو کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ وہ کچھ اس طرح میرے قلب و ذہن پر چھا چکی تھی کہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اور چلتے پھرتے اس کی یاد ذہن سے چپکی رہتی۔ میرے دن اس کی یاد میں یوں گزرتے تھے جیسے کسی ظالم شوہر کے گھر میں دلہن کا سہاگ اَن دیکھے، اَن جانے اور اَن سمجھے گزر جاتا تھا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جس نے میری زندگی میں داخل ہو کر مجھے درد کی لذت سے آشنا کر دیا تھا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد مجھے سیما کا خط ملا۔ لکھا تھا غفور صاحب ..... سکھی رہو کہتے ہیں کہ یادیں سرمایہ حیات ہوتی ہیں مگر اپنے ماضی میں تو کوئی ایسی یاد نہیں جسے یاد کر کے دل بہلایا جا سکے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا ماضی حسین یادوں سے مزین ہوتا ہے اور ایک میں بدنصیب ہوں کہ جس کا ماضی تلخ یادوں سے اٹا پڑا ہے۔ ویران ماضی جہاں ہر سُو کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ میں جنہیں سمیٹتے سمیٹتے اب تھک چکی ہوں۔ میں اپنے کربناک ماضی کو اگرچہ بھول جانا چاہتی ہوں۔ اسے کاش میں ایسا کر سکتی۔ غفور صاحب میرا ماضی حال اور مستقبل محض اندھیروں سے عبارت ہے پھر بھی نہ

جانے کیوں زندگی کی ان تاریک راہوں پر میں نے روشن ستاروں سے خاموش آسمان پر ایک نام لکھا تھا بجلی چمکی اور وہ بکھر گیا لیکن میرے دل پر کچھ اس طرح نقش ہوا کہ لاکھ مٹانے پر بھی نہ مٹ سکا۔ اے کاش میں آپ کو بھول سکتی۔ مارے خوف کے دل کی بات زباں تک نہ لا سکی۔ شاید اس لئے کہ بھابی کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ ان کے اعتماد کا خون نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے مجھے بہن کی طرح چاہا تھا اور میں اس پیار میں زہر نہیں گھولنا چاہتی تھی۔

غفور صاحب یہ سب کچھ کبھی تھا اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اب تو میں آپ کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں آپ کے پاس تھی تو ایک لڑکی تھی، ایک باحیا لڑکی جس کی عصمت پر تقدس کے کڑے پہرے لگے ہوتے ہیں لیکن..... اب میں لڑکی سے عورت بنا دی گئی ہوں۔ ایسی عورت جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ بالکل تہی دامن، میرا کنوارپن اسی روز ختم ہو گیا تھا جس روز میں دربار داتا صاحب سلام کرنے گئی تھی، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ بات اگر یہیں ختم ہو جاتی تو میں شاید زندگی کے لاشے کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتے پھرتی لیکن اب مجھے عمر بھر کے لئے سلگتے ہوئے جہنم میں ڈالا جا رہا ہے۔ خالو ایک ساٹھ سالہ کارخانہ دار سے پچیس ہزار کے عوض مجھے بیاہ رہے ہیں اور میں انسانیت کی یہ توہین شاید برداشت نہ کر سکوں۔ میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اب میں اس بے مقصد زندگی سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ دور افق کے اس پار..... موت کی سکون بخش وادیوں میں۔ موت..... جہاں پہنچ کر زیست کی تلخیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ غریب ہونے کا احساس مٹ جاتا ہے۔ جہاں عصمتیں نہیں لٹتیں، انسانیت بے آبرو نہیں ہوتی۔

غفور صاحب کیا خبر کب یہ سانس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ چونکہ آپ لوگوں کے مجھ پر بہت احسان ہیں لہٰذا مرنے سے پہلے اپنی دانستہ و نادانستہ کوتاہیوں کی معذرت چاہتی ہوں۔ بھابی کو سلام کہنا اور بچوں کو پیار۔

بدنصیب سیما

خط پڑھ کر میری حالت غیر ہونے لگی۔ آنکھیں بے اختیار برسنے لگیں۔

''کیا بات ہے..... کس کا خط ہے؟'' عابدہ نے مجھے روتے ہوئے دیکھ کر پوچھا اور جواباً میں نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھ کر عابدہ نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''سیما انسان نہیں فرشتہ ہے، ہم اسے یوں رسوا نہیں ہونے دیں گے۔ میں بخوشی آپ کو اجازت دیتی ہوں کہ آپ اسے اپنے عقد میں لے لیں۔ میں سیما کے ساتھ مل کر زندگی گزار دوں گی۔ میں التجا کرتی ہوں کہ آپ اسے اپنی زوجیت میں لے لیں''۔

''عابدہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم کیسی عورت ہو جو خود اپنے اوپر سوتن لانا چاہتی ہو''۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سرتاج کچھ بھی ہو آپ کو سیما کو قبول کرنا ہی ہو گا۔ اس کے ساتھ گزارا میں نے کرنا ہے وہ میں کر لوں گی''۔ عابدہ نے روتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''عابدہ! تم کتنی عظیم ہو، کتنا احساس ہے تمہیں دوسروں کا اور..... یہی احساس عین انسانیت ہے۔ عابدہ! تم نے میری بے بسی کا بھرم رکھ لیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن تمہارے سامنے زبان نہیں کھول سکا۔ عابدہ! میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا''۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''تم بے فکر

Pakistanipoint.com

رہو، وہی ہوگا جو تم چاہو گی''۔ میں نے اس کو تسلی دی۔

اگلے روز میں نے اپنی والدہ کو سیدی کے پاس سیما کے رشتے کے لئے بھیجا۔

''بہن میرے لئے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ سیما آپ کی بہو بنے''۔ سیدی نے کہا۔ ''لیکن مشکل یہ ہے کہ سیما اب اپنے جلاد صفت خانو کی قید میں ہے۔ بشیر اور نذیر اسے کسی بوڑھے کارخانہ دار سے پچیس ہزار میں بیچنا چاہتے ہیں۔ بہن میں مجبور ہوں۔ اگر میں نے اس معاملہ میں کوئی دخل دیا تو بشیر مجھے طلاق دے دے گا''۔ سیدی نے روتے ہوئے کہا۔

اگلے روز میرے والد نذیر کے پاس فیصل آباد گئے تو اس نے یہ کہہ کر انہیں ٹرخا دیا کہ ایک تو غفور شادی شدہ ہے۔ دوسرے آپ لوگ دیر سے آئے ہیں، سیما کے رشتے کی بات طے ہو چکی ہے۔

''کتنے میں؟'' ابا جی طیش میں آ گئے۔ نذیر نے میلی نصروں سے ابا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم آپ کو اس بوڑھے سے زیادہ رقم دے رہے ہیں''۔ ابا نے بھرپور طنز کی۔

''بیس ہزار کا تو وہ زیور ہی زیور ڈال رہے ہیں۔ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہیں''۔ نذیر نے عجیب ڈھٹائی سے کہا۔ بیس ہزار کا سن کر ابا جی لرز گئے کیونکہ اتنی بڑی رقم ہماری استطاعت سے باہر تھی۔ ابا جی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا نذیر کچھ خدا کا خوف کرو۔ لڑکیاں فروخت کرنے کی چیز نہیں ہوتیں۔ کیوں اپنی آخرت میں آگ بھر رہے ہو۔

''فضول باتوں کی ضرورت نہیں۔ شیخ صاحب! میں اپنے اور سیما کے بارے میں بہتر جانتا ہوں۔ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ رشتہ جہاں ہونا تھا ہو چکا''۔ نذیر نے گویا آخری فیصلہ دے دیا اور ابا جی اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد بھی ہم نے کئی معزز لوگوں کی معرفت نذیر پر دباؤ ڈلوایا۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہر طرح کی پیشکش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر والدین تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

اپنی ناکامی اور سیما کے مستقبل کا احساس میرے قلب و ذہن پر سیاہ بادلوں کی طرح چھا گیا ہے۔ رہ رہ کر سیما کی بے بسی کا خیال مجھے تڑپاتا ہے۔ کئی بار سوچتا ہوں کہ بجلی کی طرح چمک کر اس گاڑھے اندھیرے کا سینہ چاک کر دوں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ میرے اس اقدام سے سیدی کی زندگی میں زہر گھل جائے گا۔ اس کو طلاق مل جائے گی اور اس عمر میں شاید وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ تو پھر میں کیا کروں، کہاں جاؤں، کس سے فریاد کروں؟ میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اے کاش سیما میری زندگی میں نہ آئی ہوتی۔ آہ میرا ماضی کتنا پُرسکون تھا۔ حال کتنا ہولناک تلخ اور زہر آلود ہے۔ میری سلگتی ہوئی زندگی نے مجھے تلخیوں اور اداسیوں کے سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ میرے چہرے پر ہر دم رقص کرنے والی مسکراہٹیں چھین لی ہیں اور اگر کبھی بھولے سے مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں یار تم مسکرایا نہ کرو..... بہت بھیانک لگتے ہو تم مسکراتے ہوئے۔ اس سے میرے دل پر جو گزرتی ہے وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ بسا اوقات اس احساسِ ناکامی سے میں چیخنے لگتا ہوں۔ لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ اے کاش میں پاگل ہو جاؤں تاکہ اس احساس کی آگ سے تو بچ نکلوں۔ مجھے کچھ یاد نہ رہے۔ اف یہ سلگتی یادیں۔ یہ کربناک احساس۔ ہر گزرنے والا لمحہ میرے کرب کو بڑھا رہا ہے اور میں لمحوں کی صلیب پر مصلوب ہوں۔

ناقابلِ فراموش

پیرزادہ

ایک جاہل پیرزادے کی حرام کاریوں اور عیاشیوں کی شرمناک داستان جسے پیری مریدی ورثے میں ملی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ مریدوں کی جان، مال اور عزت پر پیر کا حق ہوتا ہے۔

☆ محمد افضل رحمانی
0314-4652230
گوجرانوالہ

Pakistanipoint.com

ان واقعات کو تقریباً پچاس سال گزر گئے ہیں لیکن ابھی تک میرے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں ان کی یاد تازہ ہے۔ شاید میں ان کو نوکِ قلم پر نہ لاتا لیکن ان کو چھپا رکھنے کا اب کوئی جواز باقی نہیں کیونکہ پیرزادہ صاحب حال ہی میں دنیا سے رختِ سفر باندھ کر اللہ کے حضور پیش ہو چکے ہیں اور ہماری باری بھی اب قریب ہے۔ پیرزادہ صاحب سے میری ملاقات سیالکوٹ کے مضافات میں ایک گاؤں میں ہوئی تھی جس کا نام خلافِ معمول نہیں لکھ رہا کیونکہ ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ایک مرے ہوئے انسان کے عیوب سے پردہ اٹھایا جائے کہ جس سے اس کے متوسلین بدظن ہوں یا الٹا مجھے کوسنے دینے شروع کر دیں۔ کیونکہ اب پیرزادہ صاحب کا مزار مرجع خلائق ہے اور ان کے مریدین مزار کو چومتے چاٹتے اور چھترے بکرے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان کا مزار نارووال کے قریب ایک بڑے گاؤں میں ہے۔

جب میری ان سے ملاقات ہوئی اس وقت وہ بھرپور جوان تھے اور ان کی عمر پچیس سال کے قریب تھی جب کہ میں ان سے دو تین سال چھوٹا تھا۔ پیرزادہ صاحب حسن و نزاکت اور مردانہ وجاہت کے مالک تھے جبکہ میں جوان تو تھا بانکپن بھی تھا، خصوصاً لباس کے معاملے میں نفاست اور رکھ رکھاؤ بہت تھا لیکن آپ مجھے حسین نہیں کہہ سکتے۔ خصوصاً پیرزادہ صاحب کے مقابلے میں۔ ان کے رخسار گویا دہکتے انگارے تھے۔ چوڑا ماتھا، موٹی آنکھیں، سر پر مینڈھیاں، سبز پگڑی، تنگ پاجامہ، پاؤں میں کھسہ، سبز جبہ جس کے کناروں اور سامنے سینے کی جگہ پر سنہری کڑھائی نے جبے کو چار چاند لگا دیئے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جبے نے پیرزادہ صاحب کی شخصیت کو طلسماتی سا بنا دیا ہوا تھا، ان کے والد صاحب کے سینکڑوں مرید تھے جو اب پیرزادہ صاحب کی ملکیت تھے اور ان کے نذرانوں کی وجہ سے پیرزادہ صاحب خاصے متمول اور صاحب نصاب تھے جس کی وجہ سے ان میں اکڑ اور غرور در آیا تھا اور وہ اپنے آپ کو انسان سے اوپر کوئی مخلوق سمجھتے تھے۔

ظاہر ہے اس میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ جب جیب میں رقم ہو، رگوں میں جوانی کا گرم لہو جوش مار رہا ہو، مریدین جھک جھک کر سلام کر رہے ہوں، ہاتھ چوم رہے ہوں اور طرہ یہ کہ پاؤں پڑ رہے ہوں تو بہت کم لوگوں کے حواس بحال رہتے ہیں۔ عموماً انسان بہک جاتا ہے اور اس میں رعونت اور احساسِ برتری کی بیماری سر ابھارنا شروع کر دیتی ہے۔ یہی بیماری پیرزادہ صاحب کو لگ چکی تھی جو ان کے رویے اور گفتگو کے انداز سے صاف پتہ دے رہی تھی۔ البتہ ان میں ایک زبردست خامی تھی اور وہ یہ تھی کہ بے چارے اَن پڑھ تھے۔ نہ دینی تعلیم تھی، نہ دنیاوی اور یہی وجہ تھی کہ اتنی اٹھان کے باوجود اور ظاہری آن بان کے ساتھ ان کی شخصیت کھوکھلی سی تھی۔ بظاہر تو بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے لیکن جو پرسنیلٹی آپ کے علم کی دولت سے بنتی ہے وہ دستاروں اور جبوں سے کبھی نہیں بن سکتی۔

پیرزادہ صاحب کی منگنی ہوگئی تھی لیکن ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود پیری مریدی بطور گھر کی جاگیر کے شروع کر دی تھی اور مریدین کے بلانے پر فوراً پہنچ جایا کرتے تھے۔ جس پیر کے والد یا گھر کے کسی اور بڑے کا مزار ہو اور اس پر میلہ یا عرس یا محفل وغیرہ لگتی ہو اور لوگ وہاں منتیں مانتے ہوں وہ فکرِ معاش سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو قبر پرستی ایک منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔ آپ کی شوگر ملز تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

PakSociety.com

پیرزادہ صاحب سے تعارف اور دوستی

میری ایک کہانی ''پُراسرار عورت'' جو ''حکایت'' میں پانچ قسطوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں مَیں نے ایک لڑکی کا واقعہ لکھا تھا کہ شادی کے دن نکاح سے ذرا پہلے اسے آسیب نے آ پکڑا تھا اور بڑی عجلت سے مجھے وہاں بلایا گیا تھا جو پُراسرار عورت کی کارستانی نکلی۔ چونکہ اس واقعہ کو بہت سے لوگوں نے دیکھا لہٰذا اس علاقے میں میرا تعارف ہو گیا تھا۔ پیرزادہ صاحب جس گاؤں میں مجھ سے ملے دراصل وہاں ایک گھر میں آسیب کا شک تھا اور ان کی لڑکی کو دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے، اس گھر والے پیرزادہ صاحب کے والد کے مرید تھے لہٰذا انہوں نے مجھے اس غرض کے لئے بلا لیا تھا۔ اس طرح میری اور پیرزادہ صاحب کی ملاقات ہو گئی۔ پیرزادہ صاحب نے مجھے ایسے دیکھا جیسے رقیب کو دیکھا جاتا ہے۔ بیزاری ان کے چہرے پر عیاں تھی لیکن وہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔

کف کالر والی قمیص اور تنگ پائنچوں والی شلوار، کالے رنگ کی جناح کیپ اور دھوپ کا خوبصورت سنہری فریم والا چشمہ لگائے، کمی واچ، چاندی کی انگوٹھی، ہاتھ میں لیدر کا ہینڈ بیگ پکڑے جب میں ان کے گھر داخل ہوا تو سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے لیکن پیرزادہ صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جھوٹے پیروں کے لئے دل میں بغض رکھنے کے باوجود میں آگے بڑھا اور پیرزادہ صاحب سے مصافحہ کئے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے صرف انگلیوں کے پورے میرے ہاتھ سے مَس کئے اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میں طبیعت کا بہت حساس ہوں۔ پیرزادہ صاحب نے میری عزتِ نفس مجروح کر دی تھی، میں نے دل میں سوچا اس ناہنجار سے مصافحہ کرنے کی غلطی کی ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال میں نے یہ بات دل میں بٹھا لی تھی اور آئندہ کے لئے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب بیٹھنے کا مرحلہ آیا تو میں نے پیرزادہ صاحب کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ کیا کیونکہ وہ چارپائی کے اوپر والے حصے پر قابض تھے اور نیچے کی طرف بیٹھنے کو میں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ گو میری یہ عادت نہیں تھی لیکن آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ پیرزادہ صاحب کے مصافحہ کرنے کے انداز کا ردِعمل تھا۔ میرے لئے پانی لایا گیا۔ اس وقت ابھی پیپسی اور کوکا کولا جیسے لذائذ وجود میں نہیں آئے تھے۔ خصوصاً دیہات میں ایسے مشروبات سے کوئی واقف نہیں تھا۔ بارہ بجے تک تو لسی چلتی تھی اور اس کے بعد دودھ جو چینی سے میٹھا کر لیا جاتا تھا۔ برف بھی اس وقت گاؤں میں نہیں ملتی تھی۔ میں نے ایک بڑا سا گلاس دودھ کا پیا تو آنکھوں میں تراوٹ آ گئی اور جسم میں توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ آج کل اتنے دودھ سے دس کپ چائے باآسانی تیار ہو سکتی ہے اور دس مہمان کھڑے لائن لگائے جا سکتے ہیں۔

میں ایک دفعہ ایک حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھا ہوا تھا، وہ کہہ رہے تھے جس گھر میں چار چیزیں استعمال کی جا رہی ہوں اس گھر میں حکیموں کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے چار چیزیں گنوائیں چاول، چائے، برف، سگریٹ۔ شاید اسی وجہ سے آج کل دواخانوں میں مریضوں کا رش ہے کیونکہ یہ چار چیزیں تقریباً ہر گھر میں استعمال ہو رہی ہیں۔ سگریٹ کا تو میں خود عادی ہوں لیکن آخرکار اس عمر میں اس کے نقصانات کھل کر سامنے آ گئے اور میری صحت کو جتنا نقصان سگریٹ نوشی نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ حتیٰ کہ دل کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں جو سگریٹ نوشی سے بچ گیا، وہ پیچیدہ امراض سے محفوظ رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

میں نے دودھ پی کر مسنون دعا پڑھی: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْہِ وَ زِدْنَا مِنْہُ اور پیرزادہ صاحب سے مخاطب ہوا۔ جناب کا نام؟

''میرا نام خلف الرشید سلطان العارفین، سراج السالکین، زبدۃ الاولیاء فلاں بن فلاں ہے''۔

''تعلیم کتنی ہے؟''

''میں مدرسہ دروازہ سیالکوٹ سے فارغ التحصیل ہوں''۔

''کہاں تک پڑھا؟''

''جلالین شریف، ہدایہ شریف، مشکوٰۃ المصابیح تک''۔

''دورہ حدیث کہاں سے کیا؟''

''والد مرحوم اللہ کو پیارے ہو گئے لہٰذا اس سے آگے نہیں پڑھ سکا''۔

''مہتمم کون تھے؟''

''حافظ محمد عالم صاحب''۔

''حافظ محمد عالم صاحب کو میں جانتا تھا۔ شیخ الحدیث تھے اور اپنے مسلک کے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میں نے صرف ونحو کے ایک چھوٹے اور آسان سے سوال سے گویا ان کا امتحان لینا چاہا اور ایک سوال کیا کہ اگر منادیٰ مضاف ہو تو مکسور ہو گا یا مضموم یا منسوب؟ کہنے لگے اس کا مجھے علم نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی تعلیم کے متعلق صاف جھوٹ بولا ہے کیونکہ اس سوال کا جواب تو مبتدی بھی دے سکتا تھا کیونکہ یہ کوئی مشکل سوال نہیں تھا۔ میں اور سوال کرنے والا تھا کہ پیرزادہ نے میرے سوال کا جواب پوچھا۔ میں نے سرسری سا بتا دیا کہ اگر منادیٰ مضاف ہو تو منسوب ہوتا ہے۔

''منادیٰ کون ہوتا ہے؟''

''جیسے پکارا جائے اسے منادیٰ کہتے ہیں''۔ میں نے کہا۔

''وہ کون ہے؟''

''وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے''۔

پیرزادہ صاحب تذبذب میں پڑ گئے پھر پوچھنے لگے۔ منادیٰ کوئی آدمی ہے یا شہر ہے، کچھ تو ہو گا؟ یقین کریں میں نے سر پیٹ لیا، ایسے جاہل سے ابھی تک واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مجھے ساتویں کلاس کے اپنے ایک کلاس فیلو کا واقعہ یاد آ گیا جس نے ایک سوال کہ جنگ بدر پر مختصر نوٹ لکھو، کے جواب میں لکھا۔ جنگ بدر ایک نیک آدمی تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ وہ زمینداری کرتا تھا۔ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ لڑکے نیک اور پانچ وقت کے نمازی تھے، وغیرہ وغیرہ۔ پیرزادہ صاحب منادیٰ کو آدمی یا شہر سمجھ بیٹھے۔ عام لوگ شاید اس لطیفہ سے کما حقہ محظوظ نہ ہوں لیکن مدارس عربیہ کے طلباء کے لئے تفننِ طبع کا باعث ضرور ہو گا۔

''آپ کا نام؟'' پیرزادہ نے پوچھا۔

''میرا نام محمد افضل ہے، رحمانی تخلص کرتا ہوں''۔

''آپ کہاں پڑھے ہیں اور کتنا پڑھے ہیں؟''

''میری تعلیم بس واجبی سی ہے، پڑا لکھا کچھ بھی نہیں ہوں، بس نام کا محمد فاضل ہوں''۔

''آپ کا مسلک کیا ہے؟''

''اسلام''۔ میں نے مختصر جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے آپ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟''

''میں اہل سنت والجماعت ہوں''۔ میں نے کہا۔

''پھر تو آپ ہمارے ہم مسلک ہیں''۔

''آپ کا کیا مسلک ہے؟''

''ہم بھی اہل سنت والجماعت ہیں''۔

پھر انہوں نے اپنے فرقے کے مشہور و معروف خطیب حضرات کے نام بتائے کہ فلاں فلاں ہمارے

Pakistanipoint.com

نہ عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس دفعہ آپ کو بھی کریں گے۔

''لیکن میں وعظ وغیرہ نہیں کیا کرتا''۔ میں نے

''کیوں؟''

''بس جی اس قابل نہیں ہوں''۔

''آپ ہمارے عرس پر آئیں ہمارے بزرگوں دعا سے آپ وعظ کہنے لگیں گے۔ کئی حضرات نے ربہ کیا ہے''۔

''کیا آپ کے بزرگ مبلغین کو تربیت دیتے ں؟''

''نہیں جناب، یہ ان کی کرامت ہے''۔

''کیا آپ وعظ کہہ لیتے ہیں؟''

''جی نہیں''۔

''پھر آپ کے بزرگوں کی کرامت کدھر گئی؟''

''دراصل ہمیں وعظ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ یسے بھی ہم مولوی تھوڑا ہیں جو وعظ کہتے پھریں۔ ہمارا م تو لوگوں کے دلوں کو پھیرنا ہے۔ علماء شریعت پر ں ہم طریقت پر چلتے ہیں''۔

''شریعت اور طریقت میں کیا فرق ہے؟''

''ابھی ایسی باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے''۔

''اجازت کہاں سے ملتی ہے؟''

''بزرگوں سے''۔

''کیا آپ کے بزرگ زندہ ہیں؟''

''جی نہیں، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ واصل بحق و گئے ہیں''۔

''پھر وہ اجازت کیسے دیتے ہیں؟''

''دراصل بزرگ مرتے نہیں ہیں بس ذرا سی آڑ کر لیتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

کون کہتا ہے مومن مر گئے
قید سے چھوٹے وہ اپنے گھر گئے''

''لیکن وہ ابھی اصلی گھر نہیں گئے۔ اصلی گھر تو جنت ہے یا جہنم''۔ میں نے کہا۔

''ابھی تو وہ عالم برزخ میں ہیں، وہ ان کا دائمی گھر نہیں ہے''۔

''یہ عالم برزخ کیا ہوتا ہے؟''

''جناب! یہ وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد روحیں رکھی جاتی ہیں اور یہ عارضی انتظام ہے۔ قیام قیامت کے بعد اعمال کے مطابق جنت یا جہنم دائمی گھر ہوگی''۔

''کیا آپ کا عقیدہ نہیں کہ وہ قبر میں زندہ ہیں؟''

''اس میں عقیدے کا کیا تعلق؟'' میں نے کہا۔ ''قبر میں زندہ ہونا تو بذات خود عذاب کے زمرے میں آئے گا''۔

''اس کا کوئی ثبوت؟''

''ہاں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس غلط خیال کو رد کیا گیا ہے۔

ترجمہ: جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ تو کچھ بھی نہیں پیدا کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں۔ مُردے ہیں ان میں جان نہیں اور نہیں جانتے کہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے۔

(پارہ نمبر 16 سورہ نحل رکوع نمبر 2)

ترجمہ: جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تو مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ پر قائم رہو۔ پھر ان میں پھوٹ ڈال دیں گے تو ان کے شریک کہیں گے کہ تم تو ہماری بندگی نہ کرتے تھے۔ سو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان کافی شاہد ہے۔ ہمیں تو تمہاری عبادت کی خبر تک نہ تھی۔

(پارہ 11 گیارہ سورہ یونس رکوع نمبر 3)

Pakistanipoint.com

میرے خیال میں پیرزادہ صاحب کے پلے کچھ بھی نہ پڑا، جھٹ سے کہنے لگے۔ ''توبہ جی، ہم تو کبھی نہیں مان سکتے کہ پیر، فقیر اور اولیاء قبروں میں مرے پڑے ہیں۔ وہ سب زندہ ہیں۔ ہمارے بزرگ کئی دفعہ ہمیں قبر سے پیغام دیتے ہیں، ہم باقاعدہ ان کی آواز سنتے ہیں''۔

پیرزادہ صاحب کی اس ڈھٹائی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا البتہ انہوں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور گھر کے سربراہ سے کھسر پھسر کرنے لگے۔ میرے خیال میں وہ انہیں مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ اپنی سی کوشش کرنے کے بعد دوبارہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ کیا آپ وہابی ہیں؟

''جی نہیں، میں سنی مسلمان ہوں''۔ میں نے کہا۔

''ویسے میرے خیال میں ہمیں سنی وہابی کے مسئلے میں نہیں پڑنا چاہئے جس کام کے لئے آئے ہیں اس کو کرنا چاہئے''۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے''۔ لڑکی کے والد نے کہا۔

''ہمیں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے، ہمارے لئے سب قابل احترام ہیں''۔

میں نے لڑکی کو بلانے کے لئے کہا۔ والد نے لڑکی کو آواز دی۔ اسے اس کی والدہ اسے کندھوں سے پکڑ کر ہمارے پاس لائی۔ لڑکی ڈگمگاتی ہوئی آ رہی تھی۔ ہمارے قریب آئی اور پھر اچانک دھڑام سے زمین پر گر گئی۔

تشخیص و علاج

میں نے نظر بھر کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی چشمہ لگائے ہوئے تھی، چہرے پر سنجیدگی اور گھبراہٹ کے آثار واضح طور پر محسوس ہو رہے تھے۔ لڑکی خوش شکل اور عمر تقریباً بیس بائیس سال ہو گی۔ اس وقت کے فیشن کے مطابق ٹیڈی قمیص اور تنگ پاجامہ پہنے ہوئی تھی جس سے جسم کے نشیب و فراز واضح نظر آ رہے تھے۔ کاش! ہماری بیٹیاں فیشن ترک کر کے اسلامی لباس اپنا لیں اور ان کے وقار میں اضافہ نظر آئے۔ میں نے اپنے طریقے کے مطابق دیکھنے کے لئے لڑکی سے کہا کہ عینک اتار دو۔ اس نے عینک اتار دی۔

عامل حضرات جانتے ہیں کہ آسیب کی تشخیص کے لئے آنکھوں کی چمک دیکھنا ضروری ہوتی ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ زیادہ دیر تک آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالیں۔ اگر مریض واقعی آسیب زدہ ہے تو آپ کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ میرے ساتھ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا، مجھے چکر آنے لگے تھے۔ میں نے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا گھر میں آبِ زم زم ہے۔ تو خوش قسمتی سے آبِ زم زم مل گیا جس کو میں نے پیا اور آنکھوں پر لگایا تو مجھے افاقہ ہو گیا۔ حافظ صاحب مرحوم نے مجھے آسیب زدہ مریض کی آنکھوں میں دیکھنے کی باقاعدہ پریکٹس کرائی تھی۔ عامل کو چاہئے کہ تشخیص ہو جانے کے بعد مریض کے ماتھے کو گھور کر اور ٹکٹکی لگا کر دیکھے۔ اس سے ایسا محسوس ہو گا کہ جیسے عامل بڑے غصے اور دبدبے سے مریض کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ آپ آسیب کی مقناطیسیت سے بھی محفوظ رہیں گے اور آپ کا رعب بھی آسیب پر پڑ جائے گا۔ مکرر کہتا ہوں کہ زیادہ دیر آسیب زدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا آپ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے حسب ضرورت لڑکی کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ لڑکی آسیب زدہ ہے تو میں نے آنکھوں کا زاویہ اس کے ماتھے پر مرکوز کر دیا۔ اب لڑکی میری آنکھیں دیکھ رہی تھی لیکن مجھے اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس

طرح میں آسیب کی مقناطیسیت کی زد سے بچ گیا تھا لیکن آسیب میری قہر آلود آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ دراصل یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو اکثر کام آ جاتا ہے لیکن اس کے لئے اعصاب کو قابو رکھنا ضروری ہے۔ کمزور اعصاب کے عامل کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔

مجھے ایک شرارت سوجھی میں نے پیرزادہ صاحب کو کہا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر جب انہوں نے ایسا کیا تو نتیجہ وہی نکلا جو میں پیچھے بتا چکا ہوں۔ پیرزادہ صاحب چکرا گئے۔ میں نے جلدی سے پیرزادہ صاحب کی گردن پر ہلکا سا مکا مارا جوں ہی ان کی نظریں دوسری طرف گھومیں میں نے بلند آواز سے کہا۔ خبردار! لڑکی کی طرف مت دیکھنا۔ کچھ دیر بعد انہیں قے آ گئی جس کی وجہ کا میں تعین نہیں کر سکا تھا کہ ویسے اغلب خیال یہی ہے کہ چکرانے کی وجہ سے قے ہوگئی تھی۔

میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور مندرجہ ذیل آیات ترتیل سے پڑھنی شروع کر دیں۔ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ ابتدائی پانچ آیات، سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات۔ آیت الکرسی، سورہ آلِ عمران کی آیات 18 تا 19، سورۃ الاعراف کی آیات 117 تا 122 ان کو کئی بار پڑھا، سورہ یونس کی آیات 81، 80، سورہ طٰہٰ کی آیت 69 اسے بھی کئی بار دہرایا۔ سورہ مومنوں کی آخری چار آیات، سورۃ الرحمٰن کی آیات 33 تا 34، سورۂ جن کی ابتدائی 9 آیات، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس، درود ابراہیمی۔

یہ تو میرا معمول ہے بعض دفعہ کچھ اور آیات بھی ان میں شامل کر لیتا ہوں اور بعض دفعہ مذکورہ آیات میں کمی بیشی بھی کر لیتا ہوں اور ساتھ ہی بسم اللہ الذی لا یفتر مع اسمہ شی فی الارض و لا فی السمآء و ھو سمیع العلیم اور اعوذ بکلمت التامات من شر ما خلق اس کو کئی مرتبہ پڑھتا ہوں اور اس وقت تک پڑھتا رہتا ہوں جب تک آسیب حاضر نہ ہو جائے یا مریض ہوش میں نہ آ جائے۔ کافی کوشش کرنے کے بعد لڑکی ہوش میں آ گئی جو اس بات کی علامت تھی کہ لڑکی کو جادو کی وجہ سے آسیب ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آسیب خود حاضر ہوتا اسے کسی نے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے جادو کروایا تھا لیکن جادوگر یا عامل کی جاہلیت اور نا سمجھی اور اپنے فن سے ناواقفیت کی وجہ سے لڑکی کو دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اسی لئے میں اپنی بے شمار کہانیوں میں کئی دفعہ لوگوں کو تنبیہ کر چکا ہوں کہ کبھی کسی عامل کے پاس نہ جائیں اور اس سے میری مراد وہ عامل ہیں جو بے شرع اور بے دین اور اَن پڑھ ہیں۔ جادو چونکہ ایک حقیقت ہے اور عموماً جاہل، اجڈ، اَن پڑھ لوگ ایسا فعل کرتے ہیں۔ اس کے لئے میرے مضمون ''جادو، جنات اور عامل'' کا مطالعہ فائدہ مند ہوگا۔

پیرزادہ صاحب کا رویہ اب میرے ساتھ مؤدبانہ سا ہو گیا تھا اور اس کا اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ اب جب میں چارپائی پر بیٹھنے لگا تو پیرزادہ صاحب سرک کر نیچے کی طرف ہو گئے اور مجھے بازو سے پکڑ کر بے تکلفانہ کھینچ کر اوپر کی طرف بٹھایا حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اصل احترام تو انسان کے دل میں ہونا چاہئے۔

ایک لڑکی کئی عاشق

مجھے کئی قارئین نے سنجیدہ لہجے میں اور کئی نے مذاق کے رنگ میں فون میں یہ کہا ہے کہ رحمانی صاحب یہ کیا وجہ ہے کہ آپ کی کہانی کا ہر کردار خصوصاً لڑکیاں واقعی اتنی خوبصورت ہوتی ہیں یا آپ کہانی میں رنگ بھرنے کے لئے ایسا خیالی نقشہ کھینچ دیتے ہیں بلکہ ایک

Pakistanipoint.com

بزرگ نے جو ریٹائرڈ فوجی افسر ہیں، انہوں نے تو مجھ پر حسن پرست ہونے کا فتویٰ لگا دیا پھر وہ بڑے زور سے ہنسے اور میں نے جواباً کہہ دیا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں ''مزاج ہے ہمارا مگر عاشقانہ''۔

تو جناب اصل بات یہ ہے کہ بعض ایسے کردار بھی نظر سے گزرے ہیں جن کی تعریف کرنا قلم کے بس کا روگ نہیں ہے میں وہی لکھتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں بلکہ بعض دفعہ تشنگی سی محسوس کرتا ہوں لیکن نرم و نازک دلوں کا خیال رکھتے ہوئے قلم کو روک لیتا ہوں۔ میاں محمد صاحب لکھتے ہیں۔

سوہنی صورت سر الٰہی عام نہ سمجھن سارے
خاصاں باہجہ محمد بخشا کون کرے نتارے

میں نے لڑکی کی آنکھوں میں دوبارہ جھانکا۔ اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو جھیل کی جگہ یوں کہہ دوں کہ سمندر کی طرح گہری آنکھیں لیکن اب پُرسکون تھیں۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا، وہ اٹھی اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے عینک اتارنے کے لئے کہا۔ اس نے اتار دی۔

''دیکھو بہن! آئندہ آپ بالکل عینک نہیں لگائیں گی''۔ میں نے کہا۔

''قاری صاحب! یہ میری مجبوری ہے، میری دور کی نظر کافی ویک ہے''۔ اس نے بتایا۔ مجھے دوہرا افسوس ہوا ایک تو اس کی نظر کا سن کر اور دوسرا عینک لگانے کی اس کی مجبوری۔ کیونکہ عینک نے اس کے حسن کو چار چاند لگائے ہوئے تھے، میں چاہتا تھا کہ یہ عینک لگانا ترک کر دے تاکہ کم نظریں اس کی طرف اٹھیں لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

''کیا آپ پردہ نہیں کرتیں؟''

''جی نہیں''۔

''پڑھتی ہو؟''

''جی!''

''کون سی کلاس میں؟''

''سیکنڈ ایئر میں''۔

''لڑکیوں کے کالج میں؟''

''جی نہیں مخلوط تعلیم ہے''۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''کافی ٹھیک محسوس کر رہی ہوں، عینک لگا لوں؟''

''جی لگا لو''۔ میں نے کہا پھر اس کے باپ سے کہا۔ ''دیکھو بزرگو! میں کچھ باتیں اس لڑکی سے علیحدہ میں کرنا چاہتا ہوں''۔

''کوئی بات نہیں ہمیں آپ پر اعتماد ہے''۔

''میرے ساتھ جانے میں تو کوئی حرج نہیں؟'' پیرزادہ صاحب بولے۔

''حرج ہے، ہو سکتا ہے آپ کی طبیعت پھر خراب ہو جائے''۔

''آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ڈر نہیں''۔

''ٹھیک ہے لیکن میں گارنٹی نہیں دے سکتا''۔

''سرکار! بہتر ہے قاری صاحب جو کہہ رہے ہیں''۔ والد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''قاری صاحب! آپ برا محسوس نہ کریں تو پہلے کھانا ہو جائے''۔

''نہیں، جناب! کھانا بعد میں کھائیں گے۔ اگر پیرزادہ صاحب اور آپ لوگ بھوک محسوس کر رہے ہیں تو آپ کھا لیں''۔

''نہیں، جناب! کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے''۔ پیرزادہ صاحب جلدی سے بول پڑے۔

''ٹھیک ہے پھر آپ کسی علیحدہ کمرے میں انتظام کر دیں''۔

''کیا مکان کے اوپر والے حصے میں ٹھیک رہے

پاکستان میں پنکھے بنانے کے بانی

S.A

ESTD. 1936

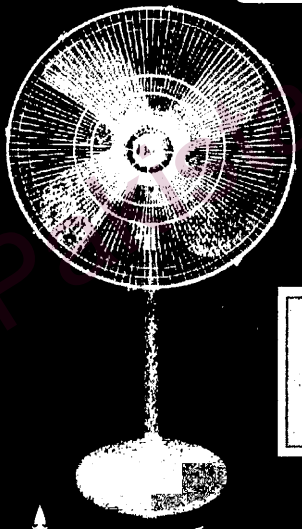

ایس اے پنکھے

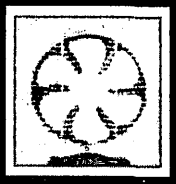

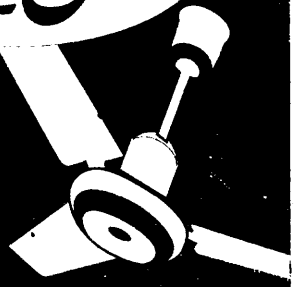

ایس اے۔ الیکٹریکل انڈسٹریز۔ گجرات

053 - 3515327, 3535045, 3533478

گا؟''

''ہاں، کہیں بھی ہو جائے مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔ میں نے کہا۔

لڑکی کے والد نے اپنی بہو کو کہا کہ فلاں کمرے میں انتظام کر دو اور پھر مجھے کہا۔ قاری صاحب آپ صائمہ (فرضی نام) کو اوپر لے جائیں۔ میں نے صائمہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں چلے گئے۔

جب وہ بیٹھی تو اس کے لمبے بال کمر سے نیچے صوفے پر بکھر گئے۔ قارئین کرام اور عامل حضرات یاد رکھیں کہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ تخلیے میں بیٹھ کر دل پر قابو رکھنا جادو اور آسیب کا علاج کرنے سے زیادہ مشکل ہے اور میں اس عامل کو ایماندار کہہ سکتا ہوں جو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی ہمت رکھتا ہو۔ ورنہ اس لنکا میں جو بھی نکلا باون گز کا ہی نکلا، اسی لئے جس گھر میں عامل قدم رکھ لے وہاں بہت کم خیر گزرتی ہے اور اگر عامل کے ساتھ پیر بھی ہو تو کو برا ناگ برا اس سے کہیں کم خطرناک ہوتا ہے۔

خیر یہ باتیں اور واقعات کثرت سے آپ میری کہانیوں میں پڑھ چکے ہیں۔ اس کہانی میں بھی ایک دو واقعات آپ پڑھ سکیں گے۔ اب اس کمرے میں ہم صرف تین تھے۔ صائمہ، میں اور شیطان، کیونکہ حدیث میں موجود ہے کہ جس جگہ دو نامحرم بیٹھے ہوں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ اس لئے احتیاطاً میں نے صائمہ کو بہن کہہ کر بلایا کیونکہ وہ تقریباً میری ہم عمر تھی۔ دوسرے میں اس سے کافی دور ہٹ کر دوسرے صوفہ پر بیٹھا تھا۔

''صائمہ بہن! کیا آپ میری باتوں کا جواب ایمانداری سے صحیح صحیح دو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی کوشش کروں گی''۔

''نہیں، بہن! کوشش نہیں وعدہ کرو کہ ہر بات کا صحیح جواب دو گی''۔ وہ ذرا دیر رکی اور پھر میری طرف دیکھا اور پوچھنے لگی۔ آپ مجھ سے کون سی باتیں پوچھیں گے؟ بھئی جب میں پوچھوں گا تو آپ کو پتہ چل ہی جائے گا۔ وہ پھر کچھ دیر رکی اور پھر کہنے لگی۔ ٹھیک ہے بھائی آپ جو پوچھیں گے سچ سچ بتا دوں گی۔ وعدہ، جی وعدہ۔

''یہ جو پیرزادہ تمہارے گھر آتا ہے یہ کیسا بندہ ہے؟''

وہ ذرا سا شرمائی اور پھر دوٹوک لفظوں میں کہا کہ میری دونوں بھابیوں کے تعلقات پیرزادہ سے خراب ہیں اور اب مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟''

''میری طرف سے ہاں کے منتظر ہیں''۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''آپ سے کیا پردہ مجھے اچھے لگتے ہیں لیکن میری ان سے گاڑھی نہیں چھن سکتی''۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ پہلے دونوں بھابیاں ایک دوسرے کی رقیب ہیں اور کئی بار ان کی لڑائی بھی ہو چکی ہے لیکن اب پیرزادہ صاحب نے ان کی صلح کرا دی ہے اور دونوں نے تقریباً سمجھوتہ کر لیا ہے''۔

''کیا تم ایک معزز آدمی پر غلط الزام تو نہیں لگا رہی؟''

''کون سا معزز آدمی؟ یہ پیر تو بدمعاشوں کا بدمعاش ہے''۔ اس نے بے دھڑک کہا۔ ''لیکن دل چاہنے کے باوجود میں پیرزادہ صاحب سے دور دور رہتی ہوں کیونکہ میری بھابیاں تو میری بوٹی بوٹی کر دیں گی۔ وہ مجھے کئی دفعہ پیار پیار سے سمجھا چکی ہیں کہ میں پیر

Pakistanipoint.com

سے دور رہوں۔ خود تو ایک ماہ چھوڑ کر دوسرے مہینے نذر و نیاز دینے اور سلام کے بہانے آستانہ تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ میرے والد صاحب خود اصرار کر کے انہیں باری باری بھیجتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہمیں جو خوشحالی ہے وہ پیر کی دعاؤں سے ہے۔ قاری صاحب آپ کا آستانہ کیسا ہے، کیا آپ بھی نذر و نیاز اکٹھی کرتے اور عرس لگاتے ہیں؟ میں آپ کا آستانہ دیکھنا چاہتی ہوں اور وہاں جھاڑو پانی کرنے کو سعادت سمجھوں گی''۔

''دیکھو، صائمہ! تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔ یہ آستانے وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوتے، یہ سراسر فراڈ ہے۔ قبروں کو پکی بنانا اور ان پر گنبد کھڑے کرنا شریعت میں حرام ہے''۔

''ہاں، مجھے بھی کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے لیکن پھر پیرزادہ صاحب کی وجاہت سے گھبرا جاتی ہوں''۔

''اچھا اس بارے میں تمہیں میں بریف کروں گا جس سے تم حقیقت تک پہنچ سکو گی۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''فی الحال میرا مقصد کچھ اور ہے''۔

''آپ کا کیا مقصد ہے؟''

''میں چاہتا ہوں تمہاری بیماری کی تشخیص ہو جائے اور تم صحت مند ہو جاؤ''۔

''تھینک یو قاری صاحب! آپ بہت اچھے ہیں''۔

''آپ کا کہیں کوئی افیئر چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ سر سے لے کر کلاس کے پورے سٹوڈنٹس مجھ سے تعلقات بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سر تو میرے بغیر ایک لمحہ نہیں رہ سکتے''۔

''اچھا کوئی ایسا لڑکا جس نے تمہیں پرپوز کیا ہو اور تم نے انکار کر دیا ہو اور اس کو کھری کھری سنا دی ہوں؟''

''ہاں، ہے وہ ایک نکھٹو اور بدصورت سا لڑکا''۔

''کون ہے وہ؟''

''وہ میرے چچا کا بیٹا ہے۔ اِدھر ہمارے گھر کے ساتھ ان کا گھر ہے۔ ہر وقت ہمارے گھر کے چکر لگایا کرتا ہے، ابھی آنے والا ہی ہوگا''۔

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے لیکن اس سے مل کر آپ کو اچھا محسوس نہیں ہوگا بدتمیز سا آوارہ سا لڑکا ہے''۔

میں نے اس مشکوک سمجھ کر ذہن میں رکھ لیا۔

قارئین! آپ یقین کریں اس لڑکی کے ظاہر اور باطن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بظاہر وہ انتہائی خوبصورت، ذہین اور بھولی بھالی سی لگتی تھی لیکن اندر سے وہ پوری شیطان کی خالہ تھی۔ وہ عشق و محبت کے رموز و اوقاف سے انتہائی حد تک واقف تھی۔

''قاری صاحب! آپ مجھ سے اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا مجھ سے نفرت ہے؟''

''نہیں تو مجھے تم سے پیار ہے''۔

''تو پھر مجھے بھی آپ سے پیار ہے''۔ اس نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ریت کی دیوار تھی بلکہ گند کی پوٹلی تھی۔ وہ اٹھی اور میرے قریب آ کر میرے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

''ہمارے سر کہتے ہیں وقت کی قدر کرنی چاہئے۔ جو وقت گزر جائے وہ دوبارہ نہیں آتا''۔

میں نے ضمیر کو تھپتھپایا اور کہا ہوشیار ہو جاؤ امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ ضمیر سے آواز آئی میں تیار ہوں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس لڑکے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور کمرے سے باہر آ کر سیڑھیوں کے قریب آ گیا۔

''صائمہ! آؤ نیچے چلتے ہیں''۔ میں نے کہا۔

Pakistanipoint.com

''قاری صاحب! سوال مکمل ہو گئے؟''

''ہاں پہلا دور ختم ہو گیا ہے''۔

''لو پھر وہ لڑکا آ گیا ہے''۔ اس نے جنگلے سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے تم نیچے چلی جاؤ اور اس کو اوپر بھیج دو''۔

''ٹھیک ہے جناب!'' اس نے افسردہ سے انداز میں کہا۔

لڑکا اوپر آیا، میں اسے لے کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس سے مصافحہ کر کے معانقہ کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ آپ کا نام؟ اس نے اپنا نام امجد بتایا (نام فرضی ہے) کیا کرتے ہو؟ فی الحال فارغ ہوں۔ ویسے باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ کون سے ملک میں؟ سعودی عربیہ۔ کوئی کام جانتے ہو؟ جی وائرنگ کا کام سیکھا ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگوں میں کام کر چکا ہوں۔ شادی کر لی ہے؟ جی نہیں۔ کوئی لڑکی ہے ذہن میں؟ ہاں جی لیکن وہ مانتی نہیں ہے۔

''مانتی نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہم کس مرض کا علاج ہیں''۔

''اگر آپ یہ کام کر دیں تو منہ مانگی فیس آپ کی خدمت میں پیش کروں گا''۔

''ہاتھ دکھاؤ'' میں نے کہا۔

اس نے جلدی سے ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے ذرا دیر غور سے اس کا ہاتھ دیکھا اور پھر سوچتے والے انداز میں کچھ دیر خاموش ہو گیا اور پھر کہا۔ تمہارے ستارے جس لڑکی سے ملتے ہیں اس کے نام کا پہلا حرف ''ص'' لگتا ہے۔ وہ چونکا پھر بولا۔

''لیکن وہ تو میرے ساتھ نفرت کرتی ہے''۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور ذرا دیر بعد کھول کر کہا۔ اس میں غلطی تمہاری ہے۔ تم نے کسی عامل سے اس پر جادو کرایا ہے۔ وہ جادو الٹا پڑ گیا ہے۔ جب تک اس جادو کا توڑ نہ ہو تمہاری شادی اس سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا اور پھر پُر جوش لہجے میں کہنے لگا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اب اس کا حل کیا ہے؟ اس کا حل تو بہت مشکل ہے کیونکہ اس جادو سے وہ لڑکی بہت جلد مر جائے گی اور جب وہ مر جائے گی تو پھر تمہاری اس سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو گیا اور اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ پھر وہ میرے قدموں میں گر گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ شاہ صاحب! اس کا کوئی حل ہے تو خدا کے لئے جلدی کریں۔ وہ لڑکی یہی صائمہ ہے اور جس دن سے میں نے عمل کرایا ہے اسی دن سے اسے دورے پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔

''دیکھو جوان! مجھے افسوس ہے کہ یہ لڑکی اب صرف چند دن کی مہمان ہے''۔ اس نے باقاعدہ رونا شروع کیا اور ہچکیوں کے درمیان کہنے لگا۔ آپ بڑی سے بڑی رقم لے کر اس جادو کا توڑ کر دیں۔ زندگی بھر آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ میں نے سوچا کہ اسے زیادہ دیر اتنے بڑے شاک میں نہیں رکھنا چاہئے کہیں اسے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ میں نے اس کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ پکڑ لئے اور اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''تم بے فکر ہو جاؤ۔ اس جادو کا توڑ ہو جائے گا اور صائمہ کو دورے پڑنے بھی ٹھیک ہو جائیں گے اور تمہاری اس سے شادی بھی ہو جائے گی لیکن میری کچھ شرائط تمہیں ماننی پڑیں گی''۔

''شاہ صاحب! میں ہر شرط ماننے پر تیار ہوں''۔ اس نے بے تابی سے کہا۔ ''اب جلدی سے اس کا توڑ کریں''۔

''دیکھو، جوان! پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جادو تم

نے کہاں رکھا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا اور کہا۔ ''کیونکہ اسے جلد از جلد نکالنا ضروری ہے تاکہ اسے ضائع کیا جا سکے''۔

''آپ ابھی چلیں میں آپ کو بتاتا ہوں''۔

''نہیں ہم شام کے بعد چلیں گے''۔

''ٹھیک ہے شاہ صاحب!''

''ہمیں کتنی دور جانا پڑے گا؟''

''یہی کوئی ایک ڈیڑھ میل تک گاؤں کے قبرستان میں ایک پرانی قبر کے سرہانے میں نے وہ سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں''۔

''دیکھو، جوان! شام کو نہیں ہم کل علی الصبح جائیں گے''۔

''صبح کوئی دیکھ لے گا''۔

''ٹھیک ہے پھر تم تیار رہنا ہم شام کی نماز کے بعد چلیں گے۔ ٹھیک ہے جناب اور آپ کی دوسری شرائط۔ شرائط نہیں صرف ایک شرط ہے کہ آئندہ تم کسی عامل باوے کے پاس نہیں جاؤ گے اور دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرو گے اور اس پر تمہیں مجھے حلف دینا ہو گا۔

''ابھی حلف لے لیں۔ آئندہ کے لئے میری توبہ اور آپ کی فیس کتنی ہو گی''؟

''اس کی تم فکر نہ کرو، میں اپنی فیس صائمہ کے والد سے لے لوں گا''۔

نہیں جناب! میں کچھ نہ کچھ آپ کی خدمت ضرور کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن فیس لینے سے میرے کام میں خلل پیدا ہو گا۔

ٹھیک ہے جناب! جیسے آپ کی مرضی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ادھر میں مطمئن ہو گیا کہ صائمہ کو اب دورے نہیں پڑیں گے۔ گو اس کے علاوہ قرآن و حدیث کے عملیات سے جادو کے اثرات ختم کئے جا سکتے تھے لیکن یہ شارٹ کٹ راستہ تھا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

شام کی دو سنتیں میں نے چھوڑ دیں کیونکہ میں مسافر تھا۔ پیرزادہ صاحب پکے قسم کے بے نمازی تھے۔ وہ لڑکا ویسپا لئے مسجد سے باہر میرا منتظر تھا میں اس کے پیچھے بیٹھا راستہ کچا لیکن صاف تھا۔ ہم پانچ منٹ میں قبرستان میں تھے۔ اس نے مجھے وہ قبر اور وہ جگہ دکھائی جہاں دفینہ دفن تھا۔ پانچ منٹ بعد ہم گھر واپس پہنچ گئے۔ گھر والے کھانا میز پر لگانے میں مصروف تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ کھانا کئی ڈشوں پر مشتمل تھا۔ بھوک چمک اٹھی تھی میں نے دیسی مرغ کے ساتھ صحیح انصاف کیا اور تقریباً چوتھائی مرغ چٹ کر گیا لیکن افسوس اس وقت ہوا جب مجھے پتہ چلا کہ ایک ڈش میں گرما گرم ساگ گھی سے تربتر موجود ہے لیکن پیٹ اب مزید کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے چمچ اٹھایا اور دو تین چمچ صرف ساگ کے منہ میں ڈالے اور گھر والوں سے تاکید کی کہ میرے لئے صبح ساگ بچا کر رکھنا ہے۔ صائمہ کہنے لگی۔ چلو اچھا ہو گیا ہمیں پتہ چل گیا کہ ساگ آپ کو پسند ہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ریڈ لیمپ برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔

صائمہ برتن سمیٹنے لگی تو نظر بچا کر پیرزادہ صاحب نے اس کو چٹکی بھری جس سے بے اختیار اس کی ''سی'' نکل گئی اور وہ ذرا سی دوہری ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا پیرزادہ کا یہ حق ہے آخر ان کی مریدنی تھی اور مرید بے دام کے غلام ہوتے ہیں۔ صائمہ برتن سمیٹ کر چلی گئی تو پیرزادہ صاحب بجائے اس کے کہ اپنی چوری پکڑی جانے پر نادم ہوتے الٹا ہنس کر کہنے لگے قاری صاحب پیس کیسا ہے؟

Pakistanipoint.com

"آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں"۔ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"دیکھیں قاری صاحب! اب آپ میرے دوست ہیں، آپ سے کوئی پردہ نہیں ہوگا"۔ پھر انہوں نے بڑی بہو کو آواز دی، وہ فل میک اپ میں زیور سے لدھی لدائی بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی پیر صاحب کھڑے ہو گئے اور بے تکلفانہ اسے بانہوں میں سمیٹ لیا اور کلمہ شریف کا ورد جاری کر دیا۔ گویا کلمے کو آڑ بنا کر غیر محرم عورت کے لمس سے محظوظ ہونے لگے۔ پھر ان کے ہاتھ آوارہ گردی کرنے لگے۔ وہ ہاتھوں کو جسم کے مختلف حصوں پر پھیرنے لگے، وہ قد کاٹھ والی خوبصورت عورت ان کے ہاتھ میں کھلونا بن چکی تھی مجال ہے جو ذرہ بھر مزاحمت کر رہی ہو ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے پیرزادہ صاحب نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو پھر اس نے لمبی اور گہری سانس لی۔ ساتھ ہی پیرزادہ صاحب نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھم سے صوفے پر گری اور اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کھڑی ہو جاؤ اور جا کر شمسہ (فرضی نام) کو بھیج دو"۔ پیرزادہ نے حکم دیا۔

عورت کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے لیکن پیرزادہ صاحب نے اسے بشارت دی کہ آج میں تمہارا مہمان بنوں گا۔ شمسہ چھوٹے قد والی دبلی پتلی سی کم عمر لڑکی تھی۔ پیرزادہ صاحب اس پر ایسے جھپٹے جیسے باز چڑیا پر۔ اس کے پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گئے۔ اب وہ مکمل طور پر پیرزادہ صاحب کے کنٹرول میں تھی اور اس دفعہ پیرزادہ نے پہلے سے زیادہ بلند آواز سے کلمے کا ذکر شروع کر دیا پھر ہاتھ ڈھیلے کیے شمسہ کے پاؤں زمین پر لگے اور پیرزادہ صاحب کے ہاتھ آوارہ گردی میں مصروف ہو گئے۔ پیر صاحب کی آنکھوں میں خمار اتر چکا تھا ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے شراب کے نشے میں مخمور ہو چکے ہوں۔ پھر ساس کی باری آئی، وہ پچاس سالہ عورت ایسی محسوس ہو رہی تھی جیسے ابھی اس پر جوانی کا جوبن گزرا نہیں بلکہ آ رہا ہے۔ پھر کئی لڑکیاں اور عورتیں آتی گئیں جو دوسرے گھروں سے آئی تھیں اور پیرزادہ صاحب کی مرید تھیں انہوں نے نذریں پیش کیں پیرزادہ صاحب ہر ایک سے گرمجوشی سے ملتے اور گلے لگا کر بلند آواز سے کلمے کا ورد کرتے۔

میں منتظر رہا کہ صائمہ کی باری کب آئے گی لیکن وہ پتہ نہیں کس وجہ سے نہ آئی۔ پھر ایک کمرے میں سب لوگ اکٹھے ہو گئے اور پیرزادہ صاحب کے آنجہانی والد کے قصیدے پڑھنے لگے۔ ایک مصرعہ پیر صاحب پڑھتے اور پھر مرد و خواتین ایک زبان ہو کر اس کو دہراتے۔ مجھے کچھ شعر یاد ہیں لیکن میں وہ شعر لکھ اس لئے نہیں رہا کہ وہ خاص اس درگاہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں بڑے پیر صاحب کا نام بھی بار بار آتا ہے۔ ان قصائد میں یہ ذکر بھی موجود تھا کہ پیر صاحب سے پہلے وہ علاقہ تقریباً غیر آباد تھا لیکن جب سے پیر صاحب وہاں آئے علاقہ سرسبز و شاداب ہو گیا اور یہ بات زباں زد عام تھی وہ عقل کے اندھے کھیتی باڑی کے نئے اور سائنسی طریقوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ بس وہ اسے بھی پیر صاحب کی کرامت ہی خیال کرتے تھے۔ اس مزار کے بارے میں ایک یہ بات بھی مشہور تھی کہ حضور اکرمؐ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ مجھے مشرق سے خوشبو آتی ہے تو اس سے مراد یہ پیر صاحب ہی تھے۔ قصائد کے بعد ورد و وظائف کا دور شروع ہوا جس میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا البتہ میں نے ایک دو وظائف سنے جو بالکل شرکیہ کلمات تھے اور ان میں غیر اللہ کی پکار اور غیر اللہ سے استعانت مانگی گئی تھی اور مرید عقل کے

Pakistanipoint.com

اندھے رو رو کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر خشوع و خضوع سے پڑھ رہے تھے۔

صائمہ اور میں

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور عشاء کی نماز جو کافی لیٹ ہو گئی تھی، قصر کر کے پڑی اور پلنگ پر لیٹ گیا کہ دروازہ چرچرایا میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ صائمہ تھی اور مجھ سے اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ میں تذبذب میں پڑ گیا آخر فوری فیصلہ کیا اور اسے کہا۔ دیکھو صائمہ مجھے زور کی نیند آ رہی ہے اور میں تھکا ہوا بھی ہوں۔

''لیکن مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے''۔ اس نے کہا۔ ''رہا تھکاوٹ کا سوال تو آپ کو اس استادی طریقے سے دباؤں گی کہ آپ کی تھکاوٹ کافور ہو جائے گی''۔

''لیکن میں دبوانے کا عادی نہیں ہوں''۔ میں نے صاف جھوٹ بولا۔ میری بیگم مجھے ہر روز دباتی تھی اور میں تقریباً عادی ہو گیا تھا۔

''چلیں پھر صرف باتیں کریں گے''۔

''بھئی، میرے پاس باتوں کا ٹائم نہیں ہے۔ ویسے بھی کوئی ادھر آ سکتا ہے''۔

''دیکھیں قاری صاحب! ہمارے گھر کا ماحول بہت کھلا ہے اگر کوئی آ بھی گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پیرزادہ صاحب کی چھیاں سب کو برداشت ہیں تو ہمارے صرف بیٹھنے کا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی جس کام میں وہ لوگ پڑ گئے ہیں ہو سکتا ہے وہ ساری رات چلے''۔

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن صبح ہمارے پاس باتیں کرنے کا کافی ٹائم ہو گا''۔ اب وہ کمرے کے اندر آ گئی تھی اور بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی جو اس کے جسم اور لباس سے اٹھ رہی تھی۔ جب میں نے سمجھا کہ یہ ٹلنے والی نہیں ہے تو میں نے اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''صائمہ! پہلے یہ بتاؤ کہ سب لوگ پیرزادہ صاحب سے گلے ملے ہیں تم کیوں نہیں ملی؟''

''ہر دفعہ ملتی ہوں جب بھی آتے ہیں پہلی باری میری ہی ہوتی ہے لیکن آج کل ہماری کچھ ناراضی چل رہی ہے''۔

''وہ کیسے؟''

''وہ اس طرح کہ پیرزادہ صاحب حد سے آگے جانے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ اس نے پوری بے باکی سے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ میری اپنی خواہش بھی تھی کیونکہ پیرزادہ صاحب صاحب کرامت اور روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ حسن کا مجسمہ ہیں انہیں دیکھ کر کوئی عورت بھی اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتی۔ میری دونوں بھابیاں ان سے ہر قسم کا فیض حاصل کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں۔ میری والدہ بڑے پیر صاحب کی مرید تھی۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ بڑے پیر صاحب سے میری والدہ بھی فیض یافتہ ہے اور میں بڑے پیر صاحب کا فیض ہوں۔ آپ اندازہ لگا لیں کہ میرا نین نقشہ کچھ نہ کچھ پیرزادہ صاحب سے ملتا جلتا ہے''۔

''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو''۔ میں نے اس کی تائید کی۔ ''تمہیں اس بات کا کب سے پتہ چلا ہے؟''

''ابھی تھوڑے دن ہوئے مجھے سر نے بتایا تھا''۔

''سر کو کیسے پتہ ہے؟''

''وہ بھی بڑے پیر کے مرید اور ہمراز تھے لیکن اب پیرزادہ صاحب سے ان کا اختلاف ہو گیا ہے اور انہوں نے اس درگاہ سے تعلق ختم کر دیا ہے۔ وہ مجھے بھی سمجھاتے رہتے ہیں اور ان پیروں کی کرتوتوں سے

PakistaniPoint.com

آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ میرا اپنا ذہن بھی اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگا ہے۔ آپ کی باتیں بھی مجھے اچھی لگی ہیں جب میں اپنی آنکھوں سے پیرزادہ صاحب کی بد عادات دیکھ چکی ہوں وہ میری دونوں بھابیوں سے ملوث ہیں ان کا کہنا ہے کہ جو ایک دفعہ بیعت ہو جائے بس پھر اس کی ہر چیز پیر کی ملکیت ہو جاتی ہے اور اس وقت تک وہ پیر کے فیض سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا جب تک فنا فی الشیخ نہ ہو جائے۔ میرا اپنا یہی عقیدہ تھا اور میں ہو سکتا ہے اب تک پیرزادہ صاحب سے فیض یاب ہو چکی ہوتی لیکن سری باتوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور آپ کا انداز دیکھ کر اور باتیں سن کر مجھے اصل اور نقل کا پتہ چل گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کو پھانسنا چاہتی تھی کیوں کہ میں پاک لڑکی نہیں ہوں۔ میری زندگی کا واحد مشغلہ صرف عشق و محبت ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ جتنے عاشق میرے ہیں اتنے بہ یک وقت کسی لڑکی کے ہو ہی نہیں سکتے''۔

''دیکھو، صائمہ! پیر کی نگاہ ویسے تم پر ہے''۔

''استغفراللہ..... اب یہ کبھی نہیں ہوگا۔ ہاں یاد آیا کیا آپ پیرزادہ صاحب کو اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکتے؟''

''کر سکتا ہوں، کیوں نہیں کر سکتا۔ پیر کو اپنے والد کی زندگی کا کچھ نہ کچھ پتہ ہوگا۔ کسی دانا نے کہا ہے کہ آپ اپنی ماں اور باپ کی زندگی کی کرید بھی نہ کریں ورنہ آپ کو پچھتاوا ہوگا اور جب میں نے عقلی دلائل سے پیرزادہ صاحب کو سمجھایا تو انہیں ماننے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوگا''۔

''پھر انہیں بتا دیں''۔

''بالکل، ٹھیک صرف بتاؤں گا ہی نہیں بلکہ قائل کر دوں گا''۔

''قاری صاحب! میری ایک خواہش ہے''۔ صائمہ نے کہا۔ ''اگر آپ پوری کریں تو؟''

''اگر پوری کرنے کے قابل ہوئی تو ضرور پوری کر دوں گا، بتاؤ''۔

''میں آپ کی درگاہ دیکھنا چاہتی ہوں اور آپ کے بزرگوں کو سلام کرنا چاہتی ہوں''۔ (یہاں سلام سے مراد تبرکاً مزار پر چوما چاٹی کرنا ہے)

''دیکھو، صائمہ! ہماری کوئی درگاہ نہیں ہے۔ جب درگاہ ہی نہیں تو سلام کا کیا سوال ہے۔ درگاہ تو رب کائنات کی ہے، اس کی درگاہ پر جھکو اور اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے کہو۔ مرے ہوئے انسان کسی کو کیا دے سکتے ہیں؟'' اور پھر میں نے قرآن پاک اور حدیث پاک سے اسے اس انداز سے سمجھایا کہ وہ میری باتوں میں محو ہو گئی۔ وہ حیرانی اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے عقیدت و احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

میں ہمیشہ علماء سے کہتا رہتا ہوں کہ خدارا ان کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کو حقیر نگاہ سے مت دیکھو۔ ان کو سمجھاؤ جتنا ان کا ذہن تیز ہے اور بات سمجھنے کی صلاحیت ہے اگر ایک بات آپ کسی اَن پڑھ کو ایک سال میں سمجھا سکتے ہو تو انہیں صرف ایک گھنٹے میں سمجھ آ جائے گی۔ ہاں آپ پریپ میں ہی انہیں پردے، ناپردگی کے طعنے دینے شروع نہ کر دیں۔ دلائل سے سمجھائیں، یہ ذہن دلیل مانگتا ہے۔ آپ دیکھنا کہ لوہا کتنی جلد پگھلتا ہے۔ صائمہ نے کئی قسم کے سوالات کر کے اپنی تسلی کی اور آخر میں اپنی بیماری کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے وثوق سے کہا کہ ان شاء اللہ، اب تمہیں دورے نہیں پڑیں گے اور پھر میں نے اسے سو جانے کے لئے کہا تو وہ کہنے لگی۔

''خدا قسم! مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ہیں۔ کاش! آپ ابھی کچھ اور باتیں مجھے بتائیں"۔

"ٹھیک ہے پھر کبھی موقع ملا تو مزید باتیں کریں گے"۔ ٹھیک ہے قاری صاحب اور وہ مجھے سلام کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پیر صاحب کی شرارت

شاید محفل برخاست ہوگئی تھی۔ سب سے پہلے بڑی بہو میرے کمرے میں آئی اور مجھے اٹھنے کو کہا۔ میں اٹھ گیا، اس نے جلدی سے مجھے گلے لگا لیا اور اچھی طرح خوب بھینچا۔ ابھی میں اس اچانک افتاد سے سنبھلا بھی نہیں تھا دوسری بہو میرے گلے میں جھول گئی اور پھر نازنینوں اور حسینوں کی پوری جماعت کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں جلدی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب کوئی تو میرے ہاتھوں کے بوسے لینے لگیں اور کئی پیروں میں بیٹھ گئیں۔ پیر نے ان سے جھوٹ بولا تھا کہ یہ بھی پیر ہیں اور بڑی گدی کے مالک ہیں اور بڑے کرنی والے ہیں۔ ان سے بھی فیض حاصل کرو۔ اصل میں یہ پیرزادہ صاحب کی شرارت تھی اور دوسرے شاید وہ مجھے دکھانا چاہتے تھے کہ وہ ان لوگوں میں کتنے مقبول ہیں۔ جس طرح میں نے ان عورتوں اور لڑکیوں سے گلوخلاصی کرائی یہ میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

قبر کشائی اور دفینہ کا باہر نکالنا

اس رات بڑی بہو پیرزادہ صاحب کے پہلو کی زینت بنی اور یہ بات بڑے فخر سے مجھے خود پیرزادہ صاحب نے بتائی۔ صائمہ نے بھی یہی بات بڑے دکھی لہجے میں بتائی۔ ویسے مجھے خود بھی یقین تھا کہ پیرزادہ صاحب جیسے جوان، صحت مند اور عادی حرام کار سے انتہائی مشکل تھا کہ وسائل اور وقت ہونے کے باوجود مجرد رات کیسے گزار سکتے تھے۔

ناشتے پر دنیا جہاں کی نعمتیں تھیں لیکن صائمہ نے میرے لئے سپیشل ساگ فرمائی کیا۔ دیسی گھی کے پراٹھے سے میں نے مزے لے لے کر کھانا کھایا اوپر سے دو گلاس چائی کی لسی نوش جان کی۔ یقین کریں ناشتے کا لطف آ گیا۔

"جی، اب کیا پروگرام ہے؟" پیرزادہ صاحب نے خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"گھر کے سربراہ کو بلائیں"۔ میں نے کہا۔

اور جب میں نے گھر کے سربراہ کو چند ہدایات دیں تو پیر صاحب سکتے میں آ گئے۔ جب کسّی اور مزدور آ گیا تو میں نے چاچا جی سے کہا۔ آپ اور پیرزاد صاحب میرے ساتھ ہوں گے اور کچھ آدمی بطور گواہ کے ساتھ چلیں گے۔ ہم آٹھ دس آدمی قبرستان پہنچے تو میں نے امجد کے بتائے ہوئے مقام سے قبر کھودنے کو کہا۔ سب لوگ ڈرے، سہمے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں منہ میں ویسے ہی کچھ دعائیں پڑھ رہا تھا کہ کسّی والے نے کہا۔ جناب کوئی چیز آگے آ گئی ہے۔ لوگ ڈر کے مارے پیچھے ہو گئے۔ میں نے کہا کہ دیکھو، کسّی احتیاط سے چلاؤ کہ وہ چیز ضائع بھی نہ ہو اور باہر بھی آ جائے۔ اس نے گڑھا چوڑا کر دیا اور پھر بڑی احتیاط سے ایک چھوٹی سی گٹھڑی کسّی کے ساتھ کھینچ کر باہر نکال دی۔ گٹھڑی بہت گہری تھی۔ بس میت اس سے آگے قریب ہی تھی۔ پیرزادہ صاحب میرے قریب آ گئے اور میرے کندھے پر تھپکی لگائی، ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے مزدور سے کہا۔ قبر پر مٹی ڈال کر ہموار کر دو اور چاچا سے کہا کہ تم گٹھڑی اٹھا لو لیکن وہ ڈر کے مارے تیار نہ ہوئے حتیٰ کہ کوئی بھی گٹھڑی اٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ میں نے خود گٹھڑی اٹھا لی جو زیادہ بھاری نہیں تھی۔

جب ہم گھر واپس آئے تو میں نے گٹھڑی کو کھولا

اس میں ایک قمیص، ایک بنیان، انڈرویئر، کچھ بال، گوشت کا ایک خشک ٹکڑا جس میں گیارہ سوئیاں چبھوئی گئی تھیں اور چند ایسی چیزیں جن کا ذکر یہاں مصلحتاً نہیں کر رہا۔ گھر والوں نے صائمہ کی بنیان جو سرخ رنگ کی تھی اور قیمتی قمیص جو کئی دنوں سے گم تھی، پہچان لی۔ و حیران اور پریشان تھے۔ بال بھی صائمہ کے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اپنے انداز میں جادو کو بے اثر کیا اور پھر تمام چیزیں نہر میں بہانے کے لئے اسی وقت روانہ کر دیں۔ اب میں مطمئن تھا۔ چاچا جان بھاگتے ہوئے اندر گئے اور نوٹوں کی ایک گڈی میری نذر کرنے کی کوشش کی۔

''ابھی نہیں''۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔

''قاری صاحب! یہ آپ کی نیاز ہے''۔

''ہرگز نہیں، نیاز صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ میری فیس ہوگی جو میں اپنی مرضی سے لوں گا''۔

''اور رقم لے آؤ!'' پیرزادہ صاحب نے چاچا سے کہا۔

وہ جلدی سے کمرے میں جانے لگا، میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور کہا۔ فیس کی مجھے جلدی نہیں ہے۔

''لاؤ مجھے دو''۔ پیرزادہ صاحب نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا اور پھر رقم اپنے ہاتھ میں پکڑی اور کچھ روپے اپنی جیب سے ڈالے اور کہنے لگے۔

''قاری صاحب! یہ نہ نذر ہے نہ نیاز نہ فیس یہ آپ کا انعام ہے''۔

میں نے اس شرط پر رکھ لئے کہ پیرزادہ صاحب اپنے روپے واپس لیں۔

میں نے عملیات سے کوئی جائداد نہیں بنائی، اس کے باوجود 1970ء کے لگ بھگ ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ میرے اکاؤنٹ میں تھا اور اس وقت زمین کی قیمت 12 ہزار فی ایکڑ تھی۔ اس حساب سے چالیس پچاس ایکڑ زمین میں خرید سکتا تھا جبکہ آج کل کم سے کم قیمت 20 لاکھ فی ایکڑ ہے۔ وہ بھی شہر سے دور۔ شہر کے قریب تو اب ایک ایکڑ کئی کروڑ میں بھی نہیں ملتا۔ پھر وہ رقم بینک میں پڑی رہی حتیٰ کہ اسّی کی دہائی کے آخر میں لڑکیوں کی شادی کی اور مکان وغیرہ بنائے۔ آج بھی جس کا جی چاہتا ہے آ کر دیکھ لے سادہ سے مکان میں سادہ سی زندگی ہے حتیٰ کہ بوڑھا ہونے کے باوجود اپنی گاڑی تک نہیں ہے، کرائے کی گاڑی یا موٹر سائیکل پر سفر کرتا ہوں۔ ہاں البتہ یہ کہنا جھوٹ ہوگا کہ میں بالکل فی سبیل اللہ کام کرتا ہوں۔ جائز طریقے سے فیس وغیرہ لے لیتا ہوں، وہ بھی اگر کوئی اپنی مرضی سے دے دے، میری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی۔ غریبی کے دور میں بھی میں نے اپنی خو نہیں بدلی۔ ورنہ تو عامل حضرات مؤکلات کی بھاری فیسیں لیتے ہیں جو بالکل ہی جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ کسی کو عامل اور پیر جیسی خونخوار مخلوق سے واسطہ نہ پڑے اور اگر کوئی عامل بھی ہو، پیر بھی ہو، کسی گدی کا سجادہ نشین بھی ہو، اپنے کسی مرے ہوئے بزرگ کی قبر کا مجاور بھی ہو تو اس کی پانچوں گھی میں ہوتی ہیں۔ قبر کے بغیر پیری نہیں چل سکتی۔ جس پیر کے پاس قبر نہیں ہو دھکے کھاتا مر جائے گا لیکن لوگوں کو نہ اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے نہ متمول زندگی گزار سکتا ہے۔

پیرزادہ صاحب کا دولت کدہ

میں نے گھر والوں سے اجازت لی لیکن سب سے پہلے صائمہ بول پڑی۔ قاری صاحب آپ دل میں یہ خیال بھی نہ لائیں کہ ہم آپ کو دو چار دن تک جانے دیں گے۔

''ہاں، بھئی یہ ٹھیک ہے لیکن آج کے بعد قاری صاحب میرے مہمان ہوں گے''۔ پیرزادہ صاحب جلدی سے بول پڑے۔

''پیرزادہ صاحب آج نہیں پھر کبھی ملاقات ہو گی''۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ذرا میری بات علیحدگی میں سنیں''۔ میں ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ''قاری صاحب! میں یہ عمل آپ سے سیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے پیر اور میں آپ کا مرید''۔

''لیکن اس عمل کو سیکھنے کے لئے کم از کم چھ ماہ لگیں گے''۔

''چھ ماہ تو کچھ بھی نہیں اگر آپ چھ سال بھی کہیں تو آپ کی شاگردی کر سکتا ہوں''۔

''لیکن اس میں بہت پابندیاں ہیں''۔

''مثلاً کون سی؟''

''زنا بالکل نہیں کرنا ہوگا''۔

''انتہائی مشکل اور ناممکن''۔ پیرزادہ سنجیدگی سے کہنے لگے۔ ''عیش وعشرت اور زندگی کی بہاریں تو اسی سے ہیں''۔

''پھر آپ یہ عمل نہیں سیکھ سکتے، اس کی پہلی شرط ہی یہ ہے''۔

''چلیں ایک وعدہ کریں، جب میں زنا سے توبہ کرلوں اس وقت آپ مجھے سکھا دیں گے''۔

''بالکل نہیں''۔ میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ آپ کا زنا سے توبہ کرنا ناممکن ہے''۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے؟''

''مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ صائمہ آپ کی بہن ہے''۔

پیرزادہ صاحب ایسے اچھلے جیسے انہیں بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''مجھے قبر میں پڑے ہوئے دفینے کا کیسے پتہ چل گیا؟''

''ہاں، یہ حیران کن بات ہے''۔

''بس اسی طرح آپ اس حقیقت کو بھی سمجھ جائیں۔ آپ ظاہری علامات نہیں دیکھ سکتے؟ مجھے جواب دو کہ صائمہ کی شکل آپ سے کیوں ملتی جلتی ہے؟'' انہوں نے گردن نیچی کر لی اور پھر اوپر کر کے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے۔ آپ کی بات میں ضرور کچھ نہ کچھ حقیقت نظر آتی ہے۔

''کچھ نہ کچھ نہیں سو فیصد حقیقت ہے''۔ میں نے کہا۔

پیرزادہ صاحب کا رنگ کفن کی مانند سفید ہو گیا۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

''پیرزادہ صاحب! اب آپ کا جو رویہ ہے اگر آپ کی بدفعلی کے نتیجے میں ان کی کوئی ایک یا دونوں بہوئیں بارآور ہو جائیں اور پھر آپ کی وفات کے بعد آپ کا کوئی لڑکا اس گھر میں پیرزادہ کی حیثیت سے آئے تو آپ گمان کر سکتے ہیں کہ صورت حال کتنی بھیانک ہوگی؟''

''قاری صاحب! بس کریں، مجھے سوچنے کا موقع دیں''۔

''آپ بے شک سوچیں لیکن امکانات کو بالکل نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ محض فرضی نہیں زندگی کی حقیقتیں ہیں جن سے آنکھیں نہیں پھیری جا سکتیں''۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، آپ میرے مرشد بھی ہیں، استاد بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، ہمراز بھی لیکن دیکھیں کسی کے عیبوں پر پردہ ڈالنا بھی آپ جیسے

لوگوں کی شایانِ شان ہے''۔

''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے عیوب لوگوں پر ظاہر کرتا پھروں گا؟ خدانہ کرے ایسا ہو۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں یہ باتیں میرے دل میں اور اسی کمرے میں دفن ہو جائیں گی''۔

ہم باہر آ گئے اور پیرزادہ صاحب نے حکم دیا کہ دونوں بہوئیں اور صائمہ بھی تیار ہو جائیں۔ میں ابھی نہیں جاسکتی۔ صائمہ نے اپنی بیماری اور کمزوری کا بہانہ بنایا چلو ٹھیک ہے۔ دونوں بہوئیں پہلے ہی تیار تھیں۔ پیر صاحب نے ڈرائیور کو نذرانے گاڑی کی ڈکی میں رکھنے کا حکم دیا۔ نقدی جیب میں ڈالی جو دو تین ہزار تو ضرور ہو گی۔ یاد رہے کہ آج سے پچاس سال پہلے کے دو تین ہزار ایک خطیر رقم تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں گاڑی میں بیٹھا تھا۔ مجھے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا گیا۔ پیرزادہ صاحب درمیان میں ایک بہو ایک کندھے کے ساتھ اور دوسری دوسرے کندھے کے ساتھ۔ میں نے سوار ہونے کی مسنون دعا بڑے خشوع وخضوع سے پڑھی اور ویسے بھی دعا کی کہ یا اللہ یہ قافلہ خیر سلامت گھر پہنچ جائے۔

سفر کافی تھا، ہم شام کے قریب درگاہ کے احاطے میں پہنچ گئے۔ درگاہ کیا تھی کسی بادشاہ کی سیرگاہ تھی۔ اگر اونچی جگہ پر پیر کا خوبصورت مزار نہ ہوتا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ کوئی مقبرہ ہے۔ ایکڑ سے زیادہ کا احاطہ ہو گا جس پر مکمل چاردیواری تھی۔ لائن میں چاروں طرف کمرے تھے۔ کمروں کے باہر کالی تختیوں پر سنہرے حروف میں تختیاں لکھی ہوئی آویزاں تھیں۔ چند ایک میں نے پڑھیں مثلاً حجرہ اعتکاف، مہمان خانہ، لنگر خانہ، مراقبہ ہال، بڑے پیر صاحب جس جگہ پر عموماً بیٹھا کرتے تھے، اس جگہ کا مخصوص نام تھا جو میں لکھ نہیں رہا کیونکہ اس میں اتنا غلو اختیار کیا گیا تھا کہ مجھے لکھنا پسند نہیں ہے۔ شام کا لنگر پک رہا تھا، میں چلتا چلتا مقبرے تک پہنچ گیا۔ مزار کے اندر جانے کے لئے چھوٹا دروازہ تھا لہٰذا میں باہر ہی کھڑا رہا۔ زائرین کا رش تھا کیونکہ آج جمعرات تھی۔ اسی لئے پیرزادہ صاحب مریدوں کی مہمان نوازیاں اور مریدوں کی نوازشیں چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔

پتہ نہیں اس وقت ابھی محکمہ اوقاف وجود میں نہیں آیا تھا کیونکہ ایک بڑا سا صندوق نما ڈبہ جس پر ''نذرانہ یہاں ڈالیں'' جلی حروف میں لکھا تھا اور لوگ دھڑا دھڑ نذرانے صندوق میں ڈال رہے تھے۔ کچھ پیر صاحب کے ہاتھ چومتے اور ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کرنسی نوٹ پیرزادہ صاحب کی نذر کرتے تو آپ انتہائی ہوشیاری سے جیب میں ڈالتے جاتے۔ عورتیں پیرزادہ صاحب کی آغوش گرم کرنے کے ساتھ ساتھ جیب بھی گرم کر رہی تھیں۔ میری نظریں اپنی دونوں ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھیں جو بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی تھیں کہ اچانک میری نظر مزار کی طرف اٹھی، وہ دونوں مزار کی طرف جا رہی تھیں۔ میں لوگوں سے بچتا بچاتا ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مزار کے احاطے میں داخل ہوئیں۔ پھر مزار کے گرداگرد طواف کرنے لگیں۔ پھر دروازے کے قریب آئیں نیچے جھکیں اور چوکھٹ کو بوسہ دیا پھر مزار کے اندر چلی گئیں۔ میں مزار کے دروازے کے قریب آ گیا۔ انہوں نے قبر کی پائینتی کو بوسہ دیا اور پھر سجدہ ریز ہو گئیں۔

وہ بلاشبہ اللہ کی لعنت اور پھٹکار کی مستحق ہو چکی تھیں۔ یاد رہے کہ قبر کو سجدہ ہر مسلک میں حرام ہے حتیٰ کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ''فتاویٰ رضویہ'' میں قبر پر سجدہ حرام قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی ایسی بے حیائی کی تائید نہیں کرتا۔ طواف سوائے خانہ کعبہ کے کسی اور عمارت کا جائز نہیں حتیٰ کہ رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزارِ مقدس پر بھی طواف کرنا ناجائز ہے۔

شام کی اذان شروع ہوگئی تھی۔ میں مسجد میں آیا تو دیکھا کہ چند ایک نمازی تھے اور امام ندارد۔ میں نے نماز پڑھی ابھی دعا مانگ رہا تھا کہ ایک ملنگ قسم کا آدمی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جوں ہی میں نے ہاتھ منہ پر پھیرے اس نے ہاتھ جوڑے اور پھر اپنے ماتھے پر رکھ کر میرے قدموں میں گر گیا۔ میں بجلی کی تیزی سے اٹھا اور معاذ اللہ کہتے ہوئے مسجد سے باہر صحن میں آ گیا۔ وہ میرے پیچھے آیا اور انتہائی لجاجت سے کہنے لگا۔ جناب مرشد آپ کو سرکار بلا رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ پیرزادہ صاحب مسجد کے باہر میرے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ کسی اور درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد مختصر تعارف پیرزادہ صاحب نے کرایا۔

''ہماری ساتھی عورتیں کدھر ہیں؟'' میں نے پیرزادہ صاحب سے پوچھا۔

وہ زور سے ہنسے اور کہنے لگے۔ بس یہیں کہیں ہوں گی۔ ہم ان کے پہرہ دار نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کا قیام و طعام کہاں اور کیسے ہوگا؟ روٹی لنگر سے کھائیں گی اور سونے کے لئے بہت سے کمرے ہیں جہاں سینگ سمائے پڑی رہیں گی۔ گویا اس جگہ ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی، ویسے بھی ان سے بڑھ کر حسین و جمیل باکرہ و غیر باکرہ عورتیں پیزادہ صاحب کی دسترس میں تھیں۔

پیرزادہ صاحب نے اپنی پسلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکے اور مضمحل لہجے میں کہا۔ آج تو عقیدت مندوں نے گلے مل مل کر پسلیاں توڑ دی ہیں۔ مجھے اللہ کا فرمان یاد آ گیا۔ بے شک اکثر پیر اور درویش لوگوں کا مال جھوٹ بول کر کھاتے ہیں اور ساتھ اللہ کی اصل راہ سے روکتے بھی ہیں۔ لنگر میں صرف دال اور روٹی تھی جو لوگ بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔

پیرزادہ صاحب کی منگیتر

''قاری صاحب! آپ ہمارے خاص مہمان ہیں لہٰذا کھانا گھر پر کھائیں گے''۔ پیرزادہ صاحب نے کہا۔ ''اور دیکھیں میں اپنی والدہ اور اپنی منگیتر سے آپ کی ملاقات کرانا چاہتا ہوں''۔

''ایک شرط پر''۔ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں ہاں فرمائیے''۔

''وہ دونوں عورتیں ہمارے ساتھ گھر پر کھانا کھائیں گی اور ان کے سونے کے لئے بستر کا انتظام ہو گا''۔

''دیکھیں، قاری صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس طرح یہ لوگ سر چڑھ جاتے ہیں۔ ان کو جتنا دھتکارے رکھو یہ ٹھیک رہتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے پھر میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا اور اِدھر کہیں پڑ کر سو رہوں گا''۔

''اوہو، آپ تو ناراض ہو گئے۔ ٹھیک ہے جو آپ کا حکم، کھانے جو میں قابل ذکر چیز تھی وہ بکرے کے شانے کا گوشت تھا جو کوئلوں پر بڑی استادی سے پکایا گیا تھا۔ شانے کے گوشت میں صوف بہت کم ہوتا ہے اور وہ دانتوں میں پھنستا بھی نہیں اور لذیذ بھی ہوتا ہے۔ وہ مکمل پیس تھے جو ایک عدد بکرے کے تھے۔ مجھے ایک پیس بھی زیادہ تھا۔ میں نے دوسرا پیس پکڑا اور دونوں خواتین جو ساتھ والے کمرے میں کھانا کھا رہی تھیں ان کے دسترخوان پر رکھ آیا۔ کھانے کے بعد عشاء کی نماز قصر کر کے پڑھی۔ دوران نماز خیال آ گیا یہ بکرا کہیں پیر کی نیاز والا نہ ہو۔ نماز کے فارغ ہوا تو دل میں بدمزگی تھی۔ پیرزادہ صاحب کمرے میں آئے

تو میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ جناب جس بکرے کا گوشت ہمیں کھانے کو دیا گیا تھا، یہ کہاں سے آیا تھا؟

''میں سمجھ گیا، آپ گھبرائیں نہیں یہ ہمارے پالتو بکروں میں سے ایک تھا''۔ پیرزادہ نے جواب دیا۔ حالانکہ یہ سوال مجھے کھانے سے پہلے کرنا چاہئے تھا۔ خیر میں کچھ مطمئن سا ہو گیا۔ پیرزادہ صاحب مجھے لینے کے لئے آئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گیا۔ گھر دیکھا تو علامہ اقبالؒ کا شعر یاد آ گیا۔

گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی

مائی صاحبہ جنہیں صاحب زادی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ایک عام سی عورت تھیں جنہیں میرے خیال میں زندگی کی حقیقی خوشیاں نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ گو وہ بڑھاپے میں بھی زیور سے لدی پھندی تھیں اور دو خوبصورت لڑکیوں نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر سہارا دیا ہوا تھا۔ ان سے جو گفتگو ہوئی میرے خیال میں یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کسی کے گھریلو رازوں کو آشکارا کرنا کوئی اچھی بات نہیں یوں سمجھ لیں کہ وہ ایک حساس عورت رہی ہوں گی جس کو شوہر کی پوری توجہ نہیں مل سکی تھی۔

مائی صاحبہ کے جانے کے بعد ایک لڑکی چار لڑکیوں کے جلو میں کمرے میں داخل ہوئی، میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گرہن لگا چاند۔ چند ستاروں کے جھرمٹ میں اپنی روشنائی چھن جانے سے افسردہ ہے۔ سیاہ رنگ، اوپر والے دانت ہونٹ کے باہر نکلے ہوئے۔ غیر متناسب الاعضاء جو نہ ایک ایک کر کے خوبصورت لگ رہے نہ اکٹھا دیکھنے سے۔ چھوٹا قد، بھدا جسم، سر کندھوں کے بالکل اوپر گردن کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے خیالات اور توقعات کو زبردست جھٹکا لگا میرے خیال میں پیرزادہ صاحب کی منگیتر کوئی حور پری ہو گی یا پھولوں کی شہزادی، یقین مانیں پوری زندگی میں اتنی بدمزگی میں نے نہیں دیکھی تھی۔ جب آپ کی توقعات اور احساسات کو اتنی کاری ضرب لگے تو آپ کا کیا خیال ہو گا؟ اگر کوئی آپ کو کوزہ مشری کے بجائے پھٹکڑی کھلا دے یا شربت کی بجائے سرکہ تو آپ کی کیا حالت ہو گی؟

قارئین کرام! وہ ایک ایسا سیپ تھی جو موتی سے خالی تھا یا ایسا ناضہ تھی جس میں ذرہ بھر کستوری نہیں تھی۔ پیرزادہ صاحب نے میرے تاثرات بھانپ لئے اور پھر زبردستی ہنس کر بولے۔ دراصل ہمارے ہاں غیر برادری میں رشتہ کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ میری ماموں زاد ہے وہ بھی پیر کامل تھے، ان کا در بار بھی مرجع خلائق ہے۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے.....'' مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی میں کیا کہوں۔

''اور یہ ان کی واحد وارث ہے۔ بس اب ہم شادی کرنے والے ہیں۔ آپ کو پیشگی شادی میں شرکت کی دعوت دے رہے ہیں''۔

پیرزادہ صاحب کی دلچسپیاں

ہم تقریباً ساری رات مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ پیرزادہ صاحب پر جو چیز سب سے زیادہ حاوی تھی وہ عورت تھی۔ آپ گھما پھرا کر پھر اسی موضوع پر آ جاتے۔ انہوں نے اپنے کئی معرکے اور فتوحات سنائیں کہ میں تنگ آ گیا۔ آخر میں نے سونے کی تجویز پیش کی جواز راہ کرم آپ نے قبول کر لی۔ صبح نماز سے فارغ ہو کر میں پیرزادہ صاحب کو تلاش کرنے لگا لیکن پتہ چلا کہ ابھی سو رہے ہیں۔ غلام سے پوچھا کہ کب بیدار ہوں گے؟ جناب یہ تو ان کی

Pakistanipoint.com

مرضی پر منحصر ہے کہ ایک صاحب آ گئے۔ میرا نام پوچھا، میں نے نام بتایا تو جھک کر مجھے سلام کیا اور کہنے لگے۔ پیرزادہ صاحب نے آپ کی خدمت کی ڈیوٹی مجھ ناکارے کے سپرد کی ہے۔ آئیں آپ کو سیر کرائیں۔ سب سے پہلے پیر صاحب کے اصطبل پر گئے۔ اعلیٰ نسل کے چار گھوڑ جن کے پچھلے دو پیروں کو ذرا دور کلے لگا کر باندھ دیا گیا تھا۔ اچھا چارہ اور دانہ کھا کر گھوڑے انتہائی موٹے تازے اور چمکیلی رنگت کے تھے۔ ذرا آگے ایک ریچھ بندھا تھا جس کو ملازم خوراک کھلا رہا تھا۔ اس سے آگے بوہلی نسل کے سیاہ و سفید رنگ کے کتے۔ ملازم نے بتایا کہ پیرزادہ صاحب ان کتوں کو گھوڑوں سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ملازم سے پتہ چلا کہ پیرزادہ صاحب کی اپنی خرید کی ہوئی زمین بھی کافی ہے اس کے علاوہ خانقاہ کے نام بھی کافی زمین ہے اور سب سے پہلے جو شخص ان میں پیر بنا تھا اس کا مزار گاؤں سے کافی دور تھا، وہاں تک جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ میں نے ملازم کو کہہ دیا کہ آپ چلے جائیں میں اکیلا سیر کروں گا اور تم ناشتے کا جلدی انتظام کر لینا کیونکہ میں صبح جلدی ناشتہ کرنے کا عادی تھا۔ اصل میں میرا خیال یہ تھا کہ یہ سب لوگ تو پیرزادہ صاحب کے زرخرید غلام ہیں۔ ذرا کسی غیر جانبدار آدمی سے بھی ملاقات کی جائے۔

میں چہل قدمی کرتا کرتا ایک طرف کو نکل گیا۔ میں ایک مکان کے دروازے پر پہنچا، ایک عورت بلند آواز سے رو رہی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا، ایک بزرگ جو متشرع اور بھلے مانس سے نظر آ رہے تھے، میرے قریب آئے، مجھے سلام کیا پھر کہنے لگے۔ بیٹا! آپ ادھر کیوں کھڑے ہیں؟

''دیکھو بزرگوار! میں باہر سیر کی غرض سے جا رہا ہوں۔ رونے کی آواز آئی تو میں کھڑا ہو گیا۔ یہ کون اور کیوں رو رہی ہے؟''

''بیٹا! ہماری بچی ہے، وہ بیمار ہے اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے، اس کی والدہ تھوڑے دل کی ہے، اس لئے بلند آواز سے رو رہی ہے۔

''کیا میں لڑکی کو دیکھ سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں''۔ بزرگوار نے جلدی سے کہا۔ میں اندر چلا گیا۔ لڑکی نے بلند آواز سے چیخ کر کہا۔ یہ کون ہے اور اسے اندر آنے کی کس نے اجازت دی ہے اسے کہو کہ جلدی سے ہمارے گھر سے چلا جائے ورنہ پیرزادہ صاحب اس پر بددعا ڈالیں گے جس سے اس کی نسلیں برباد ہو جائیں گی''۔

''دیکھو بیٹا! بُرا نہ ماننا''۔ باپ نے کہا۔ ''اسے جنات کی پکڑ ہو گئی ہے۔ ویسے یہ بڑی باادب لڑکی ہے''۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ایک لحظے میں پہچان لیا کہ لڑکی فراڈ کر رہی ہے۔ اس کے بال کھلے ہوئے اور لباس تار تار تھا۔ کبھی بے ہوش ہو جاتی جیسے مرگئی ہو اور کبھی اول فول بکنے لگتی اور کبھی وہ شعر گنگنانے لگتی جو میں صائمہ کے گھر سن چکا تھا۔ میں نے بزرگوار سے کہا۔ جناب میں ایک عامل ہوں اور جنات و آسیب کا علاج کر لیتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ذرا لڑکی کو دیکھ لوں۔

''بیٹا! اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ کوئی کامل آدمی مل جائے جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دے''۔ اس کی بیوی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

میں لڑکی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی چوٹی کو مضبوطی سے پکڑا اور زور سے کھینچ کر کھڑا کر دیا اور پھر ایک بھرپور تھپڑ اس

Pakistanipoint.com

کی کنپٹی اور رخسار کے کچھ حصے پر اس زور سے مارا کہ اس کی ماں کی چیخ نکل گئی۔ ''ہائے میری بچی''۔

''دیکھو، ماں جی! میں بچی کو نہیں مار رہا، یہ مار اس جن کو پڑ رہی ہے جو اس پر مسلط ہے''۔ یاد رہے کہ میں نے اس کی چوٹی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اس لئے وہ گرنے سے بچ گئی ورنہ تو وہ قلابازیاں کھاتی ہوئی کسی دیوار سے ٹکرا کر دھڑام سے زمین پر گرتی۔ پھر میں نے اس کی چوٹی چھوڑ دی اور بائیں ہاتھ ایک سے بھرپور تھپڑ اس کے داہنے رخسار پر مارا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ سے ایک اور زناٹے دار تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر مارا جس سے اس کا توازن برابر ہو گیا اور وہ گرنے سے بچ گئی اور ساتھ ہی اس کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

''ہائے..... ہمیں نہ مارو، ہم چلے جائیں گے۔ خدا کے لئے نہ مارو..... تم جو کہو گے ہم کریں گے''۔

لڑکی انتہائی صحت مند اور مکھن گھی سے پلی ہوئی تھی، نین نقشہ ٹھیک تھا۔

''تم اسے تنگ کیوں کرتے ہو؟''

''یہ پیر کے مزار پر نہیں جاتی''۔

''کیوں نہیں جاتی؟'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

''اس کے گھر والے اسے جانے نہیں دیتے''۔

''کیوں بزرگو! آپ کو اس کے مزار پر جانے پر کیا اعتراض ہے؟''

''جناب! یہ مر بھی جائے تو ہم اسے مزار پر نہیں جانے دیں گے''۔ باپ نے کہا۔

''کوئی وجہ تو ہو گی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

''جس باپ یا بھائی میں ذرہ بھر بھی غیرت ہے وہ کبھی بھی اپنی بیٹی یا بہن کو مزار پر نہیں جانے دے گا۔ جس پیر کا مزار ہے ہم اُسے بھی جانتے ہیں اور اس کے بیٹے پیرزادہ کو بھی جانتے ہیں، دونوں عورتوں کے شکاری تھے''۔

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ پیرزادہ صاحب بزرگ اور نیک آدمی ہیں''۔ لڑکی نے برجستہ کہا جو ان کے خیال میں جن کہہ رہا تھا۔ ''تم نے اسے مزار پر جھاڑو پانی کرنے کے لئے نہ جانے دیا، اب چکھو مزہ، ہم تمہاری لڑکی کو کبھی نہیں چھوڑیں گے''۔

''عذرا کے ابا مان جاؤ، کیا بگڑ جائے گا اگر دن کی روشنی میں یہ مزار پر جھاڑو پانی کر آئے''۔ ماں جی نے التجائی لہجے میں کہا۔

''خاموش رہو، عورت! یہ کبھی نہیں ہو سکتا، وہاں پر دنیا و جہاں کی بے حیائی اور شرک و بدعت کا بازار گرم ہے''۔

''دیکھو، بزرگو! یہ تو کوئی مشکل کام نہیں پیرزادہ صاحب ایک دفعہ آ جائیں تو کیا حرج ہے؟''

''یہ جنات جائیں یا نہ جائیں پیرزادہ اس گھر کی دہلیز عبور نہیں کر سکے گا''۔ میں سمجھ گیا کہ اَن پڑھ اور سیدھا سادہ نظر آنے والا بزرگ عقیدے کا پکا ہے اور یہ بھی سمجھ گیا کہ لڑکی بذات خود پرزادہ صاحب میں دلچسپی رکھتی ہے۔ میں نے لڑکی کو یعنی فرضی جن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کیا تم میرے کہنے سے اسے نہیں چھوڑو گے؟

''نہیں''۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ تم سیّد نہیں ہو''۔

''تمہیں کیسے پتہ ہے کہ میں سیّد نہیں ہوں؟''

''سیّد گورے چٹے اور خوبصورت ہوتے ہیں لیکن تم ایسے نہیں ہو''۔

''لیکن میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو

چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں بھسم کر دوں گا''۔

''تم نے جو کرنا ہے وہ کرلو، ہم اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے''۔

لڑکی کا دوٹوک انکار سن کر میرا پارہ ہائی ہو گیا۔ پھر میں نے اس پر تشدد کا ایک ایسا حربہ آزمایا جو میں یہاں بیان نہیں کر رہا کیوں کہ جعلی عامل اسے استعمال کر کے لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ دو منٹ کے اندر اندر لڑکی (فرضی جن) فرفر بولنے لگی اور ہاتھ جوڑنے لگی اور معافیاں مانگنے لگی۔ پھر میں نے اس پر ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا جس نے اس کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم کر دی (وہ بھی یہاں بیان نہیں کر رہا کیونکہ جعلی عامل اسے نوٹ کر کے غلط طریقے پر استعمال کریں گے) وہ میرے تجربات کی تاب نہ لا سکی آخر میں نے اس سے اقرار کرا لیا کہ اسے کوئی جن ون نہیں ہے بلکہ محض فراڈ کر رہی تھی۔ اب وہ میرے اشارہ پر ناچنے کے لئے مجبور تھی۔ اس سے میں نے جو باتیں کیں وہ بذاتِ خود ایک مکمل داستان ہے لیکن کہانی لمبی ہونے کے ڈر سے اسے بیان نہیں کر رہا۔

دراصل وہ لڑکی پیرزادہ صاحب کی منگیتر کی سہیلی اور ہمراز تھی جن کا ڈھونگ رچانے کا مشورہ بھی اسے اسی نے دیا تھا۔ اس بہانے سے پیرزادہ صاحب اس سے ملاقات کر لیا کرتے تھے اور اسی کی وساطت سے پیرزادہ صاحب کی منگیتر اپنے دوست سے مل لیا کرتی تھی۔ اس نے مجھے پیرزادہ صاحب کے گھر کے اندر کی کہانی سنائی تو مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جو کسی کی بہو، بیٹی، بیوی کی عزت برباد کرتا ہے اس کی اپنی عزت کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے قرآن حکیم نے زنا کو سَاءَ تْ سَبِیْلًا فرمایا ہے۔ صائمہ کے بعد یہ دوسری لڑکی تھی جس پر نظر رکھنے کے باوجود پیرزادہ صاحب ابھی تک آخری حد تک نہیں پہنچے تھے۔ صائمہ تو اب ہمیشہ کے لئے پیرزادہ صاحب سے محفوظ ہو چکی تھی اور میں نے اس کی کافی برین واشنگ بھی کر دی تھی اور ابھی اسے مزید نصیحتیں کرنی تھیں۔ اس لڑکی کے لئے میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی کافی اصلاح ہو جاتی۔ میں نے اس کے والدین کو اس کی شفایابی کی خوشخبری سنا دی تھی اور انہیں گاؤں آنے کا کہہ دیا تھا۔

انوکھی بیعت جمعہ

میں مسافر تھا مجھ پر جمعہ واجب نہیں تھا، اس کے باوجود میں واپس مزار کی طرف چل پڑا۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ پیرزادہ صاحب بیدار ہو چکے تھے اور بار میرے متعلق پوچھ چکے تھے۔ ناشتہ کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے دونوں عورتوں کو ناشتہ کرنے کی اجازت دے دی۔ مجھے بھوک نہیں تھی، میں نے تھوڑا سا پھل کھا کر دوسرا کھانا عورتوں کے کمرے میں بھیج دیا۔

اچانک پیرزادہ صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی آسمان سے اترے ہوں۔ ترکی ٹوپی، کالا جبہ، چوڑی دار سفید پائجامہ، جوانی ان کے چہرے پر دمک رہی تھی۔ موٹی اور مخمور آنکھوں میں حیا کی بجائے شیطنت ناچ رہی تھی۔

''کدھر چلے گئے تھے آپ؟''

''آپ کی سلطنت کی سیر کر رہا تھا''۔

فخر سے کہنے لگے کیسی لگی؟ بہت خوب میں نے دل کھول کر داد دی۔

''اور میری منگیتر؟''

''معاف کرنا آپ کی منگیتر سے مل کر حقیقت یہ ہے کہ مجھے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی''۔

''لیکن یہ سب کچھ اسی کے دم قدم سے ہے''۔ اس نے کہا۔ ''ماموں مرحوم بڑی جائداد چھوڑ کر مرے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ان کے مریدین جو اب میرے سلسلے سے منسلک ہو چکے ہیں''۔

پھر وہ مجھے اپنے دعاخانے میں لے گئے۔ دروازے کے باہر دونوں طرف دو لمبی قطاریں سائلین کی تھیں ایک طرف مرد اور دوسری لائن میں مستورات۔ پیرزادہ صاحب جوں ہی کمرے میں داخل ہونے لگے مرد و خواتین پیرزادہ صاحب کے پیروں کو چومنے کے لئے پل پڑے جس کو موقع نہ ملا وہ جبے کو چومنے تک ہی محدود رہا۔ سائلین ایک طرف جاتے اور ایک نلکے سے بوتلوں میں پانی بھر کر لاتے، مشہور تھا کہ اس نلکے کا پانی ہر قسم کی بیماری کے لئے تریاق کا اثر رکھتا ہے۔ ہر سائل نے پانی کی ایک ایک دو دو بوتلیں ہاتھوں میں تھام رکھی تھیں۔ ہر آنے والا لائن میں بیٹھ جاتا۔ پیرزادہ صاحب بوتلوں کے ڈھکن اتارنے کا حکم دیتے اور پھر ایک دو منٹ کے لئے گردن کو اس انداز سے ہلاتے اور زبان سے کسی نامعلوم زبان کے الفاظ ادا کرتے اور کندھوں کو اوپر نیچے کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی پیشہ ور ڈانسر اپنے فن کے عروج پر پہنچ چکا ہے۔ پھر دور سے پھونک لگاتے تو لوگ اپنی بوتلوں پر ڈھکن رکھ لیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ انداز محبوبانہ بھی تھا، مجنونانہ بھی۔ جس کمرے میں وہ بیٹھے تھے اس کا دروازہ مقبرے کے دروازے کی بالکل سیدھ میں تھا جہاں پیر صاحب کی قد آدم فوٹو قبر کے سرہانے رکھی ہوئی تھی اور مزار کے اندر ایک صوفی قسم کا آدمی پیر صاحب کی منقبت انتہائی اچھے لہجے اور سُر میں پڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ قبر پر ہاتھ بھی پھیرتا جاتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی قطار سے نکل کر اندر کمرے میں داخل ہوئی اور پیرزادہ صاحب کے بالکل سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا العیاذ باللہ! پیرزادہ صاحب بجائے اس کے کہ اسے تنبیہ کرتے الٹا اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ جب وہ سجدے سے اٹھی تو مجھے انتہائی افسوس ہوا کہ اتنا خوبصورت مکھڑا جہنم کا ایندھن بنے گا۔

ایک مشکل سب سائلین کو پیش آ رہی تھی جو شاید انتظامیہ کی نظر سے نہیں گزری تھی اور وہ یہ تھی کہ لوگوں کو چلنے پھرنے میں بہت مشکل ہو رہی تھی۔ اگر پیرزادہ صاحب کی طرف منہ کریں تو مزار کو پیٹھ ہوتی تھی اگر مزار کی طرف منہ کریں تو پیرزادہ صاحب کو پیٹھ ہوتی تھی۔ اس لئے مرد و خواتین ترچھے چل رہے تھے۔ اب ان لوگوں کی باری تھی جو پیرزادہ صاحب کی بیعت سے مشرف ہونے والے تھے۔ پیرزاہ صاحب کا بیعت کرنے کا انداز بھی نرالا تھا اور وہ یوں تھا کہ پیرزادہ صاحب نے سب سے پہلے انہیں مطمئن کیا اور کئی قسم کی باتیں کیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ پیر وہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کا ایکسیڈنٹ ہونے لگے تو پیر وہاں پہنچ کر گاڑی کو ہاتھ سے روک دے اور اگر کوئی آپ پر گولی چلائے تو گولی اثر نہ کرے۔ نئے بھرتی ہونے والوں نے جوش سے کہا۔ سبحان اللہ۔

''لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب پیر کو جان، مال، عزت سب کچھ ہبہ کر دیا جائے۔ پیر کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کیا جائے''۔ سب نے کہا۔ اس میں کیا شک ہے۔ پھر بیعت کرنے کا عمل شروع ہوا۔ پیرزادہ صاحب نے سب سے پہلے ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو اپنے قریب آنے کو کہا۔ وہ اتنی قریب آ گئی کہ پیرزادہ صاحب کے کندھے اس کے کندھے سے چھونے لگے۔ پیرزادہ صاحب نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ آنکھیں

Pakistanipoint.com

بند کرو۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ پیرزادہ صاحب مراقبے میں چلے گئے اور اسے کہنے لگے۔ دیکھ آسمان سے ایک تخت [illegible] کیا تمہیں نظر آ رہا ہے؟ وہ ذرا سا جھجکی اور پھر بولی۔ ہاں ایک بڑا تخت آسمان سے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ شاباش۔ پیرزادہ صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اب وہ تخت اس کمرے میں بچھ چکا ہے۔ وہ ذرا سا اٹکی اور پھر کہنے لگی ہاں تخت اب کمرے میں آ گیا ہے۔ اچھا غور سے دیکھو ایک نورانی چہرے والے بزرگ دو آدمیوں کے سہارے آسمان سے اتر رہے ہیں۔

جی سبحان اللہ بہت خوبصورت بزرگ ہیں، اب وہ تخت پر بیٹھ چکے ہیں۔ جی مجھے نظر آ رہے ہیں۔

"پتہ ہے یہ کون ہیں؟"

"جی نہیں"۔

"یہ حضرت عبدالقادر جیلانی ہیں اوپر دیکھو، ایک اور بزرگ آ رہے ہیں"۔

"جی آ رہے ہیں"۔

"کیا وہ تخت پر بیٹھ چکے ہیں؟"

"جی بیٹھ چکے ہیں"۔

"پتہ ہے یہ کون ہیں؟"

"جی نہیں"۔

"یہ میرے والد بڑے پیر صاحب ہیں"۔

"ہاں میں نے پہچان لیا ہے۔ ان کی شکل اس فوٹو سے ملتی ہے جو مزار کے اندر پڑی ہوئی ہے"۔

انہوں نے اور بھی کئی بزرگوں کے نام لئے جو میں یہاں لکھنے سے گریز کر رہا ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ سب ڈرامہ تھا اور لڑکی جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ پیرزادہ صاحب نے پہلے کہہ دیا تھا کہ بزرگ اسے نظر آئیں گے جس کا دل صاف ہوگا اور جس کا ایمان پختہ ہوگا اور میری اس بات کی تصدیق صائمہ نے بھی کر دی تھی۔ اس نے بھی ایسے ہی بیعت کی تھی اور اس نے مجھے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا لیکن کافی لوگوں میں مجھے بے ایمان بننا پسند نہیں تھا، اس لئے میں پیرزادہ صاحب کی ہر بات کی تصدیق کرتی گئی۔

حیرانی والی بات یہ تھی کہ سوائے ایک پختہ کار عورت کے سب نے پیرزادہ صاحب کی باتوں کی تصدیق کی اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس عورت کو پیرزادہ صاحب نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ تم بہت بڑی گنہگار ہو، تم یہ یہ وظیفہ کرنا اور پھر اگلے جمعے کو آنا۔ پتہ نہیں اگلے جمعے وہ آئی یا نہیں آئی۔ ڈھائی بجے بیعت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ اب پیرزادہ صاحب اسی کمرے میں رکھے ہوئے ایک مزین منبر پر بیٹھ گئے اور اپنے مخصوص انداز میں دعا میں مشغول ہو گئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ اندر اور باہر صفوں میں بیٹھ گئے۔ پیرزادہ صاحب نے رٹے رٹائے جملے کہے، لوگ آمین کہتے جاتے۔ یہ سلسلہ تقریباً 10 منٹ تک چلتا رہا پھر ایک مولوی صاحب آئے اور انہوں نے اذان کے بعد خطبہ جمعہ پڑھا اور دو رکعت نماز پڑھائی کیونکہ پیرزادہ صاحب میں یہ لیاقت نہیں تھی کہ وہ خطبہ یا نماز پڑھا سکتے۔ نماز کے فوراً بعد پیرزادہ صاحب ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گئے جس کے دروازے پر سیاہ تختی پر سنہرے حروف میں "خلوت خانہ" لکھا ہوا تھا۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے پیرزادہ صاحب نے مجھے اشارے سے اندر آنے کو کہا میں اندر داخل ہو گیا۔ خادم نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب اس کمرے میں کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا یا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو بغیر اجازت کے نہیں۔

کمرے میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور قطار میں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مجھے نکوٹین کی کافی کمی

Pakistanipoint.com

محسوس ہو رہی تھی لہٰذا میں نے پیرزادہ صاحب سے اجازت لے کر سگریٹ سلگائی اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

''کیسا لگا آپ کو ہمارا غریب خانہ؟''

''غریب خانہ نہیں آپ کا دولت کدہ''۔ میں نے مرعوب ہوئے بغیر ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ کو یہ سب وراثت میں ملا ہے۔ آپ تو ابھی شروع ہوئے ہیں''۔

''ہاں، اس میں زیادہ حصہ میری منگیتر کا ہے۔ مجھے دولت کی اتنی کشش نہیں ہے جتنی عورت کی ہے''۔ انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ہاں، فاطمہ (فرضی نام) جیسی لڑکیاں آپ کی عاشق ہیں''۔

وہ چونکے اور پھر کہنے لگے۔ آپ کو فاطمہ کا کیسے پتہ ہے۔

''مجھے ایسی چیزوں کا پتہ چل جاتا ہے''۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''وہ لڑکی آپ کی منگیتر کی دوست بھی ہے''۔

''بالکل آپ ٹھیک کہتے ہیں''۔

''آپ اس سے متمتع بھی ہو چکے ہیں''۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے''۔

''وہ آپ کے لئے لڑکیاں بھی پھانستی ہے''۔

''لیکن میں اس کام کی اسے پوری پوری اجرت دیتا ہوں۔ ویسے مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے''۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے آپ ماشاء اللہ خوبصورت اور نوجوان ہیں اور میرے خیال میں صحیح خلف ہیں''۔

''یہ خلف کیا ہوتا ہے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''باپ کے صحیح جانشین''۔ میں نے ڈرے بغیر کہا۔ وہ ذرا سا خجل ہوئے لیکن پھر پُرسکون ہو گئے۔

قائداعظمؒ نے فرمایا

آپ کو اپنے صوبے کی محبت اور اپنی مملکت کی محبت کے درمیان امتیاز کرنا سیکھنا چاہئے۔ مملکت کی محبت بلکہ مملکت کی طرف سے عائد کردہ فرض ہمیں ایک ایسی سطح پر لے جاتا ہے جو صوبائی محبت سے بالاتر اور ماورا ہے۔ اس سطح پر آنے کے لئے وسیع تر بصیرت اور بلند تر حب الوطنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مملکت کا فرض اکثر تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے ذاتی یا مقامی یا صوبائی مفادات کو مفاد عامہ کے تابع کرنے کے لئے ہمہ وقت یار رہیں۔ مملکت کا فرض پہلے ہے اور اپنے صوبے، اپنے ضلعے، اپنے قصبے اور اپنے گاؤں کا فرض بعد میں آتا ہے۔ یاد رکھئے! ہم ایک ایسی مملکت کی تعمیر کر رہے ہیں جو پوری اسلامی دنیا کی تقدیر بدل دینے میں اہم ترین کردار ادا کرنے والی ہے۔ اس لئے ہمیں وسیع تر اور بلند تر بصیرت کی ضرورت ہیں ایسی بصیرت جو صوبائیت، قوم پرستی اور اور نسل پرستی کی حدود سے ماورا ہو۔ ہم سب میں حب الوطنی کا ایسا شدید اور قوی جذبہ پیدا ہو جانا چاہئے جو ہم سب کو ایک متحد اور مضبوط قوم کے رشتے میں جکڑ دے۔

ز ---------- رخسار شہزادی۔ لاہور

واپسی

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہئے''۔ میں نے کہا۔

''کیا آپ شکار کا شوق رکھتے ہیں؟''

''شوق تو ہے، وسائل نہیں''۔

''تو ہم کس مرض کا علاج ہیں''۔ اس نے کہا۔

''آپ ایک دن اور ٹھہریں ہم کل شکار کا پروگرام بنا لیں گے''۔

''نہیں، جناب! پھر کسی وقت آج ہمیں لازماً واپس پہنچنا ہے۔ ہاں مجھے یاد آیا ہمیں ان خواتین کا پتہ کرنا چاہئے جو ہمارے ساتھ آئی تھیں''۔

''قاری صاحب! آپ کو ان خواتین کا بہت فکر ہے؟''

''جناب! آخر وہ ہماری ہمسفر ہیں اور ان کے گھر میں ہماری بہت عزت افزائی ہوئی تھی''۔

''دیکھیں، قاری صاحب! اگر ان دونوں میں سے کوئی آپ کو پسند ہے تو بلا جھجک کہہ دیں ہم اسے آپ کے لئے وقف کر دیں گے۔ عورت کا اور مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے سے تمتع حاصل کرو۔ ایک بات یاد رکھیں کسی عورت کو دل میں نہیں بٹھانا چاہئے۔ مطلب حاصل کرو اور بھول جاؤ۔ جو مرد ایک عورت پر قانع ہوتا ہے وہ بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اگر مسلسل ایک ہی کھانا کھاتے رہیں گے تو اکتا جائیں گے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ گوشت مختلف سبزیوں کے ساتھ کھانا چاہئے''۔

میں پیرزادہ صاحب کی منفی سوچ اور شہوانی دماغ سے پوری طرح بدظن ہو چکا تھا۔ پھر انہوں نے ملازم کو بلایا اور حکم دیا کہ فلاں گاؤں کی دو خواتین کا لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا جائے کہ وہ خلوت خانہ میں پہنچ جائیں۔ ملازم نے اعلان کر دیا جلدی ہی دونوں خواتین خلوت خانہ کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ دوسرے لوگ ان خواتین کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ کتنی خوش قسمت عورتیں ہیں جنہیں پیرزادہ صاحب نے خلوت خانہ میں بلایا ہے۔

''اندر آ جاؤ''۔ پیرزادہ صاحب نے اشارے سے حکم دیا۔ وہ دونوں خوشی سے سرشار اندر آ گئیں تو پیرزادہ صاحب نے انتہائی ڈھٹائی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے کہا۔

''دراصل رحمانی صاحب آپ سے اداس ہو گئے تھے، میں باہر جا رہا ہوں تم ان کی اداسی دور کر دو''۔ شرم و حیا سے میرے ماتھے پر عرق انفعال نمودار ہو گیا۔ پیرزادہ صاحب کے جانے کے بعد چھوٹی تیز سے بولی۔

''قاری صاحب! آپ کی اداسی کیسے دور ہو سکتی ہے۔ ہم دونوں آپ کی غلام ہیں اور ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں پسند آپ کی ہو گی''۔

''دیکھو، خواتین! آپ میری بہنیں ہیں، پیرزادہ صاحب نے بطور مذاق کہا ہے۔ میں نے تو انہیں یہ کہہ رہا تھا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ خواتین کو بلا لیں''۔

''ایک دو دن اور رہ لیں تو کیا حرج ہے؟'' بڑی بڑے ناز و انداز سے بولی۔

''دراصل مجھے واپس جانا ہے، میری بیوی زیادہ دن مجھ سے دور نہیں رہ سکتی''۔

''قاری صاحب! ہم آپ کی درگاہ پر ضرور جائیں گی۔ کیا آپ بھی لنگر پکاتے اور نذریں نیازیں وصول کرتے ہیں؟''

''بھئی ہماری کوئی درگاہ نہیں ہے''۔

''لیکن پیرزادہ صاحب تو کہتے ہیں کہ آپ بہت بڑی گدی کے مالک ہیں''۔

''وہ مذاق کرتے ہیں۔ اگر ہماری بھی کوئی درگاہ ہوتی تو قیمتی جبہ اور قیمتی گاڑی کے مالک ہوتے۔ لاریوں بسوں پر دھکے نہ کھا رہے ہوتے''۔

''ویسے آپ کے بزرگوں کا مزار تو ہو گا؟''

''مزار تو نہیں البتہ کچی قبر ضرور ہے جس پر عرس

Pakistanipoint.com

اور میلہ ٹھیلہ نہیں ہوتا''۔

''اگر آپ اپنے بزرگوں کا مزار بنانا چاہیں تو ہم آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں''۔

''دیکھو، خواتین! قبروں کو پکا کرنا، ان پر گنبد بنانا شریعت میں منع ہے''۔

''تو پھر پیرزادہ صاحب نے اپنے والد کی قبر پکی کیوں بنائی ہ اور اوپر گنبد کیوں کھڑا کیا ہے؟''

''یہ تو آپ پیرزادہ صاحب سے پوچھیں ہمیں تو یہ پتہ ہے کہ شہیدوں کے سردار سید الشہداء حضرت امیر حمزہؓ کی قبر مبارک بغیر گنبد کے اور کچی ہے۔ جنت البقیع میں امہات المومنین، بنات النبی، اہل بیت اور تقریباً دس ہزار صحابہ کبار کی قبور مقدسہ سب کچی اور بغیر گنبد کے ہیں''۔

''جی اسی طرح ہے میں جب مدینے گئی تھی تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا''۔

''بہن! پھر سوچو کیا یہ پیر، فقیر ان سے بڑھ کر ہیں؟''

''ہرگز نہیں''۔ بڑی نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ جب کہ چھوٹی بڑے انہماک سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ گو ایسی باتیں کرنا پیرزادہ صاحب سے غداری کے زمرے میں آتا تھا لیکن ہم پیرزادہ کی خاطر حق بات چھپانے کے حق میں نہیں تھے اور اس سے زیادہ کی ابھی خواتین متحمل نہیں ہوسکتی تھیں کیونکہ ان کا دماغ پیرزادہ صاحب کے مکمل اختیار میں تھا۔ اس لئے میں ابھی کھل کر بات کرنے سے احتراز کر رہا تھا۔ ویسے بھی مبلغین جانتے ہیں کہ برین واشنگ کے لئے استدراجاً اصلاح فائدہ مند ہوتی ہے جو واعظ یا مصلح یا مبلغ شروع سے ہی الف کی بجائے یاء پڑھانا شروع کر دیتے ہیں وہ اکثر ناکام رہتے ہیں۔

پیرزادہ صاحب واپس آئے تو میں نے گویا احتجاجاً کہا کہ جناب ہمیں جلد از جلد واپس ہو جانا چاہئے سفر کافی ہے اور میں اتنی دیر گھر سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ پیرزادہ صاحب نے ڈرائیور کو بلا بھیجا اور اسے گاڑی نکالنے کو کہا اور پھر ہم جلد ہی واپس چلنے کو تیار ہو گئے۔ میں فرنٹ پر اور پیرزادہ صاحب دونوں خواتین کے درمیان میں بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد واپس پہنچے تو گھر والوں نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا لیکن صائمہ اس استقبال میں شامل نہیں ہوئی۔ پیرزادہ صاحب نے بھی اس کے متعلق استفسار نہیں کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے صائمہ کی کمی محسوس ہوئی وہ اتنی جلدی بھول بیٹھی تھی لیکن جیسے ہی پیرزادہ صاحب اندر کمرے میں گئے اور میں وضو کے لئے غسل خانے میں گیا تو صائمہ صابن اور تولیہ لے کر میرے قریب آئی اور بڑی گرم جوشی سے السلام علیکم بھائی جان کہا اور میری خیر خیریت پوچھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ مجھے بہت یاد آئیں''۔ میں نے کہا۔

''سچ؟'' اس نے چہک کر کہا۔ ''بھائی جان! آج تو آپ کے پاس کافی وقت ہوگا؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔ کیا آج کوئی خاص بات ہے؟''

''جی ہاں، آج پیرزادہ کی محفل دوسرے گھر ہوگی کھانا بھی اُدھر ہی پکایا گیا ہے''۔

''لیکن وہاں ان کے ساتھ مجھے بھی جانا پڑے گا وہ پیر کا بچہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا''۔

''دیکھنا کہیں آپ بھی پیرزادہ کے قدموں پر نہ چل نکلنا''۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا ویسے پیرزادہ کا جہان نرالا بھی ہے اور متلطف و ملذذ بھی''۔

''اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو ناراض نہیں ہوں گا''۔

Pakistanipoint.com

''پیرزادہ صاحب کے جہان کے بارے آپ کے دونوں لفظ مجھے پسند نہیں آئے''۔

''تو اس کا آسان حل ہے میں معذرت خواہ ہوں امید ہے آپ میری معذرت کو قبول فرمالیں گی۔ آئندہ ایسے لفظ نہیں بولوں گا''۔

''کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیں''۔

''کوشش کروں گا''۔

نماز سے فارغ ہو کر میں نے پیرزادہ صاحب کے کمرے میں جانے کی اجازت مانگی کیونکہ صحن میں اور کمرے میں لوگوں کے اژدہام کی وجہ سے ان کے پاس پہنچنا مشکل تھا۔ مجھے صرف اجازت ہی نہ مل گئی بلکہ پیرزادہ صاحب کی طرف پیغام بھی مل گیا کہ میں ان کے کمرے میں آ جاؤں۔ میں بہ دقت کمرے میں پہنچا تو وہاں عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔ پیرزادہ صاحب کی پائینتی پر عورتیں ماتھا رکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر درگاہ کے خود ساختہ شعر پڑھ رہی تھیں اور پیرزادہ صاحب مسحور و محبوبانہ انداز میں لیٹے ہوئے نذر و نیاز وصول کر رہے تھے۔ ابھی میں پوری طرح بیٹھا بھی نہیں تھا کہ ڈھول بین اور چھینے والے آ حاضر ہوئے ان کے ڈھول اور چھینوں نے گویا زمین ہلا دی اس کا مطلب یہ تھا کہ اب پیرزادہ صاحب دعوت والے گھر جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ میں نے معذرت کر لی لیکن بھلا پیرزادہ صاحب کب ماننے والے تھے آخر میں نے جھوٹ بولا کہ آپ چلے جائیں میں کچھ دیر آرام کر کے آپ کے پاس آ جاؤں گا۔

''نہیں آپ خود نہیں آئیں گے، میں اپنا آدمی بھیجوں گا''۔ انہوں نے کہا۔ ڈھول بین اور ڈھمن چھینے سے میرا سر پھٹنے لگا لیکن جلد ہی یہ بلا ٹل گئی۔

صائمہ کی مزید برین واشنگ

اب گھر میں میں اور صائمہ ہی باقی رہ گئے تھے۔

''صائمہ! ایک بات کہوں؟''

''ضرور فرمائیں''۔

''تم عشق و محبت کے چکروں سے نکل آؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق نے گھروں کے گھر تباہ کر دیئے ہیں۔ اندلس کے اموی شہزادہ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ عشق و محبت کے چکروں میں کبھی نہ پڑنا کیونکہ یہ دل اور دماغ کو تباہ کر دیتے ہیں۔ میرے ساتھ یہ وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی خرافات سے بچ کر رہو گی۔ دیکھو، عشق میں انسان ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ کسی نے خوب نشاندہی کی ہے۔

خود تو پردے میں ہیں اور ذوق نظر دیتے ہیں
اور بھی تیز میرے شوق کو کر دیتے ہیں
پہلے خود آگ لگا جاتے ہیں دل میں
پھر بجھانے کے لئے دیدہ تر دیتے ہیں
پھر اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ بقول شاعر۔

خدارا سوئے مشتاقاں نگاہے
بیا پے گر نہ باشد گاہے گاہے
نگاہ کن کہ امید از کہ دارم
کہ دارم از تو امید نگاہے

خدا کے لئے عاشقوں کی طرف ایک نظر ہی کر دیجئے۔ چلو ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی ہی سہی۔ ایک نگاہ کر کہ جو امید میں رکھتا ہوں تجھ سے ایک نظر کی امید رکھتا ہوں۔

عاشق کی زندگی کا مقصد ہی ایک ہوتا ہے اور وہ ہے وصل۔ دیکھیں کسی نے کہا ہے۔ وصل کے سوا ہر چیز فضول ہے، سو دنیا کے بدلے ایک وصل قبول ہے۔

''قاری صاحب! یہ وصل کیا ہوتا ہے؟''

"بھئی معشوق سے ملاقات تمہیں تو تجربہ ہوگا کہ عاشق وصل کا کتنا خواہشمند ہوتا ہے"۔

عاشق کے نزدیک خزاں کسے کہتے ہیں؟

یہ خزاں کی فصل کیا ہے فقط ان کی چشم پوشی
وہ اگر نگاہ کر دیں تو ابھی بہار آئے

وصل ہو تو بہار آئے ہجر ہو تو کسی پل آرام نہ آئے۔

دل ما دلبرا دیوانہ تست
بیا بے فکر خانہ خاصہ تست
تو از شہد و شکر مارا لذیذی
دل اندر ہجر دانہ دانہ تست

اے محبوب ہمارا دل تیرا دیوانہ ہے۔ بے فکر ہو کر گھر میں آ جا یہ تیرا ہی گھر ہے۔ تو شہد اور شکر سے زیادہ مجھے لذیذ ہے۔ دل تیری جدائی میں ریزہ ریزہ ہے۔

عربی شاعر کہتا ہے۔

اموات اذا ذکرتک ثم احیا
حکم احیاء علیک و کم اموت

جب میں تمہیں یاد کرتا ہوں مر جاتا ہوں پھر زندہ ہوتا ہوں۔ میں کئی مرتبہ زندہ ہوتا ہوں اور کئی مرتبہ مرتا ہوں۔

صائمہ بہن! یہ یاد رکھو کہ عاشق کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہوتی ہے۔ جدائی ہو تو وصل میں ہو تو اس کا مقدر صرف رونا ہے۔

عاشق دا کم رونا دھونا نے بن رووں نین منظوری
دل رووے چاہے اکھیاں رون نے وچہ عشق دے رون ضروری
کئی روندے دید دی خاطر کئی رودن وچہ حضوری
تے اعظم عشق وچہ رونا پیندا چاہے وصل ہووے چاہے دوری

اور جب عشق میں مغلوب ہو کر بالکل ہی بے حیا ہو جاتا ہے تو پھر کہتا ہے۔

نہ تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

☆......عشق ناجائز اور گناہ ہے۔
☆......عشق سے دین و دنیا برباد ہوتی ہے۔
☆......عشق میں ایک نہ ایک دن محبوب سے جدائی ہوگی خواہ بے وفائی سے ہو یا موت سے۔
☆......عشق سے دل سیاہ ہوتا ہے۔
☆......عشق سے دل مردہ ہوتا ہے۔
☆......عشق سے ذلت ملتی ہے۔
☆......عشق کا وبال وقتی ہوتا ہے۔
☆......عشق کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔
☆......عشق میں ہر پریشانی عذاب ہے۔
☆......عشق کرنے والوں کے چہروں پر خزاں کی بے رونقی ہوتی ہے۔
☆...... عاشقاں را سہ نشانی اے پسر، رنگ زرد آہ سرد و چشم تر

اے بیٹے عاشقوں کی تین نشانیاں ہیں۔
(1) رنگ زرد (2) آہ سرد (3) چشم تر

"ہائے اللہ قاری صاحب! یہ سب حالات تو مجھ پر گزرے ہیں"۔ صائمہ نے حیران ہو کر کہا۔ "ایک لڑکے کے عشق میں میں بیمار پڑ گئی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ نہ کھانا، نہ پینا، نہ سونا، نہ پڑھائی کو دل لگتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر پیرزادہ صاحب کی اصل حقیقت واضح نہ ہو جاتی تو میں پیرزادہ سے عشق ضرور کرتی"۔

"صائمہ بہن کیا کیا بتاؤں بعض لوگوں نے عشق کو دو حصوں میں شمار کر دیا ہے۔ ایک عشق مجازی جس کا ذکر تم سن چکی ہو، ایک عشق حقیقی۔ بعض جاہل صوفیوں نے خود ساختہ کلیہ بنایا کہ اگر عشق حقیقی پیدا کرنا ہے تو پہلے کسی خوب صورت لڑکی سے آنکھ ملاؤ اور اس سے عشق کرو اور جب انجن گرم ہو جائے تو رخ حقیقی کی طرف موڑ دو۔ چنانچہ شیخ لال حسین لاہوری ایک ہندو

Pakistanipoint.com

لڑکے سے عشق کرتے تھے اور وارث شاہ گکھڑ قوم کی ایک لڑکی بھاگ بھری کے عشق میں ملوث تھے اور اسی ترنگ میں انہوں نے ہیر وارث شاہ لکھی۔ موجودہ قریبی دور کے بعض صوفیوں کے عشق سے پردہ اٹھانا قرین قیاس نہیں سمجھتا اور پیرزادہ صاحب تو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں''۔

''ہاں جی، وہ تو راجہ اِندر اور واجد علی سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ ہمارے گھر سے اس کا منحوس سایہ ختم ہو جائے۔ خیر چھوڑیں قاری بھائی! میں آپ سے چند دینی مسائل معلوم کرنا چاہتی ہوں''۔

''ٹھیک ہے تم سوال کرو، میں حسبِ علم جواب دوں گا لیکن میری پہلی بات کا تم نے جواب نہیں دیا''۔

''کون سی بات؟''

''بس بھول گئی''۔

''ہاں، میرے ذہن میں نہیں آ رہی''۔

''بھئی میں نے کہا تھا کہ عشق و محبت کے چکروں سے نکل آؤ۔ یہ سراسر فضول بھی ہے اور نقصان دہ بھی''۔

''لیکن میں جن لڑکوں سے وعدے کر چکی ہوں؟''

''بھئی سب بھول جاؤ''۔

''کچھ مہلت دے دیں، ایک ظالم کے پنجہ عشق میں قابو آ گئی ہوں''۔

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے، بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا
وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ تو پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا

''اس کا مطلب ہے تُو سر تا پا عشق نامراد کی دلدل میں دھنس چکی ہے''۔

''ہاں، قاری بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس میں تخم کی تاثیر بھی ہو اور دودھ کی بدھ بھی''۔

''صائمہ! ایک سوال کا جواب دے دو''۔

''جی فرمائیں''۔

''کیا دل سے دل کو راہ ہوتی ہے؟''

''میرے خیال میں ہوتی ہے''۔

''لیکن میرے خیال میں نہیں ہوتی''۔

''آپ کے پاس کوئی دلیل''۔

''ہاں، امجد کو جانتی ہو؟''

''کون امجد؟''

''تمہارے چچا کا بیٹا''۔

''ہاں، وہ نکھٹو''۔

''وہ تم سے عشق کرتا ہے''۔

''عشق کرے وہ اپنی بہن سے یا کرے اپنی ماں سے''۔

''اف توبہ! اتنے گندے لفظ''۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے وہ مجھ سے عشق کرتا ہے؟''

''اس دن اس نے مجھے خود بتایا تھا جب میں نے تمہارے اسی گھر کے اوپر والے کمرے میں اس سے ملاقات کی تھی''۔

''لیکن مجھے تو اس سے کوئی عشق وغیرہ نہیں ہے''۔

''تو پھر میرا خیال ٹھیک نکلا کہ دل کو دل سے راہ نہیں ہوتی۔ وہ تمہارے عشق میں جل بھن رہا ہے اور تمہیں خبر تک نہیں۔ بتاؤ تمہیں ظالم کہوں، ستم گر کہوں یا جفا کار؟''

''آپ مجھے کچھ بھی نہ کہیں۔ اس نانجار کے دماغ کی پستی کہیں اور اس کی جرأت کو داد دیں۔ کمینے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا اسے میرا اور اپنا فرق

Pakistanipoint.com

نظر نہیں آتا؟''

''دیکھو، صائمہ! عشق کے نزدیک فرق ایک بے معنی سا لفظ ہے۔ بہرحال میں نے ایک حقیقت تمہارے سامنے بیان کردی ہے۔ اگر اس پر تمہیں ترس آجائے تو سب سے پہلے میں تمہارا مشکور ہوں گا''۔

صائمہ کی آنکھوں میں سوچ کے سائے لہرانے لگے پھر کہنے لگی۔ میں بھی کہوں یہ امجد کا بچہ ہمارے گھر کے اتنے چکر کیوں کاٹتا ہے۔ ویسے مجھے اس کی حرکتوں سے شبہ ضرور پیدا ہوگیا تھا لیکن میں سمجھتی تھی کہ بے وقوف سا لڑکا ہے پلے نہ دھیلا تے کردی میلہ میلہ۔

اتنے میں مجھے بلانے کے لئے پیرزادہ صاحب کا آدمی آگیا۔ ٹھیک ہے صائمہ! پھر کبھی وقت ملا تو باتیں کریں گے، اب میں چلتا ہوں۔

''لیکن میں آپ کو نہیں جانے دوں گی، کسی بھی قیمت پر''۔

وہ اٹھ کر باہر والے دروازے پر گئی اور پیغام رساں سے کہنے لگی۔ ''دیکھو بھائی قاری صاحب گہری نیند سو چکے ہیں اور سونے سے پہلے مجھے سختی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے جگانا نہیں ہے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں''۔ دونوں میں کچھ اور باتیں بھی ہوئیں، اُدھر سے سخت تقاضا تھا لیکن صائمہ اپنے مؤقف پر ڈٹ گئی۔ آخر پیغام رساں تھک ہار کر واپس چلا گیا۔ صائمہ فاتحانہ واپس آئی اور بڑبڑائی۔ بڑا بنا قاری صاحب کا خیرخواہ اور ہمدرد۔

اب ہمارے پاس پوری رات تھی، آپ سوچتے ضرور ہوں گے کہ ایک عشق زدہ لڑکی جو خوبصورت بھی ہے اور خلوت اور فراغت بھی ہے، رگوں میں جوانی کا خون لہریں مار رہا ہے۔ فریق ثانی ریت کی دیوار ہے، اشارے کی دیر ہے کہ صنفِ نازک چاروں شانے چت گر سکتی ہے اور نفس امارہ کو من پسند خوراک مل سکتی ہے تو پھر رات خیر و عافیت سے کیوں کر گزر گئی۔

تو جناب من! میں کوئی فرشتہ نہ تھا کئی دفعہ میرے پاؤں ڈگمگائے نفس امارہ نے بعد از گناہ توبہ و استغفار کا پُرفریب دھوکہ بھی دیا۔ خدا کو غافرالذنب بھی۔ بتایا علاوہ ازیں کئی قسم کے چکر چلائے پیروں سے نکالا بھی آپ یقین کریں میں کئی دفعہ ڈوبا پھر ابھرا لیکن پھر مجھے تین ہستیوں نے بچایا۔ خدا، صائمہ اور بیوی۔ میں نے وضو کیا اور نانوے بیماریوں کی شفا کی پڑیا کھائی اور دوبارہ تازہ وضو کیا۔ نانوے بیماریوں کی شفا لاحول ولا قوۃ الا باللہ میں ہے۔ صائمہ نے اس طرح کہ جب میں وضو کر کے واپس آیا تو صائمہ نے بغور میری طرف دیکھا اور پھر کہنے لگی۔ قاری بھائی! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی بے حیائی نہیں کروں گی جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ایک لڑکے سے میرا افیئر چل رہا ہے۔ اس کی مجھے اجازت دے دیں صرف اس حد تک کہ اگر ہماری انڈرسٹینڈنگ ہوگئی تو اس سے شادی کروں گی۔

''لیکن امجد کا کیا بنے گا؟ قسم سے وہ تمہارا سچا عاشق ہے''۔ میں نے امجد سے وعدے کی لاج رکھتے ہوئے کہا۔

''قاری بھائی! میرے دل میں وہ بچ نہیں رہا۔ بہرحال آپ کے اصرار کرنے کی وجہ سے میں سوچوں گی ضرور''۔

''ٹھیک ہے''۔ میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے بیوی سے کئے گئے عہد و پیمان بھی یاد آئے اور اس کے حسن اور صائمہ کے حسن کا موازنہ کیا تو صائمہ کہیں پیچھے تھی۔ میرے اندر ایک روشنی کا جھماکا سا ہوا اور پھر بادل چھٹ گئے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

Pakistanipoint.com

جنگ اور محبت

نفرت کی فصلیں

میں گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور ظاہر ہے اس وقت بھی میری آنکھوں میں سروج کی صورت جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ بہت اندھیرے کے باوجود میں ابھی اس لڑائی کو بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆ دستگیر شہزاد 0300-9667909 ٹوبہ ٹیک سنگھ

PakiSoftware.com

میرے بھائی عارف محمود صاحب، السلام علیکم! خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو کچھ ''نفرت کی فصلیں'' میں بیان کر رہا ہوں، اس کا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے۔ ممکن ہے پہلی بار آپ کو یقین نہ آئے یا ممکن ہے سارے واقعات جو اس کہانی میں پیش آئے ہیں، آپ کو بے حد ڈرامائی نظر آئیں اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کہانی تو بہت فلمی ہے۔ دوست! لیکن اس کے باوجود یقین کریں۔ اس کہانی کا جھوٹ سے دور دور کا واسطہ نہیں یا پھر جیسے یہ کہا جائے کہ دھندلے دھندلے سے بادلوں سے ڈھکے چاند کے درمیان ایک بڑھیا رہتی ہے یا پھر اگر آپ 9/11 جیسے ناقابلِ فراموش حادثوں پر دل پر پتھر رکھتے ہوئے یقین کر سکتے ہیں تو ان واقعات پر بھی یقین کیجئے جو بے حد ڈرامائی انداز میں اس کہانی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ بے حد نفرت کرنے والے کیڑے بھی یہیں کہیں آس پاس ہوتے ہیں۔ جہاں محبت کی لہریں اپنی پوری رفتار میں بہہ رہی ہوتی ہیں۔

آپ کو چاہنے والا فقیر دستگیر شہزاد

شاید کوئی دکھ اتنا گہرا نہیں ہو سکتا جیسا کہ میں اس وقت محسوس کر رہا ہوں۔ آنکھوں کے آگے دُھند کی چادر میں غیر واضح مکالمے یا آہٹیں جمع ہو رہی ہیں لیکن جیسا کہ بھیانک سردی کے دنوں میں اکثر ہوتا ہے۔ آپ کے کان سن سے ہو جاتے ہیں پھر چہرے پر برف کی ایک گیلی ٹھنڈی چادر رہ جاتی ہے جو دماغ سے لے کر آپ کے سارے جسم کو سلا دیتی ہے۔ جموں کشمیر میں اس کپکپا دینے والی سردی میں نفرت کے ان مکالموں کو سن رہا ہوں جو موت یا سونامی سے زیادہ بے رحم ہیں۔ میرے لئے جہاں تیزی سے پھیلتی جنگل کی آگ کی طرح صرف وہ شور رہ گئے ہیں جو اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ تیز تیز ڈرم بجنے کی آوازوں کے درمیان خنزیر کا گوشت بھوننے کی بدبو پھیل رہی ہے اور تہذیب و تمدن سے بے نیاز انسانوں کی ہڑبونگ، شاید انسان ہونے کے احساس سے جانور ہونے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اندر ہی کہیں باہر نکلنے کی تیاری میں بیٹھا ہوتا ہے۔

ایک جنگلی جانور جو ایک ہی جھٹکے میں محبت کے احساس کو نیچے سے مار کر باہر آ کر ٹھٹھا مار کر ہنستا ہے۔ صرف ایک جھٹکے میں جیسے ذبح کئے ہوئے جانور ہوتے ہیں یا عام طور پر ہماری فلموں کے ایسے اداکار جو مینٹل ڈس آرڈر یا ملٹی پل ڈس آرڈر کے شکار ہو کر ایک ہی نیک وقت میں دلکش اور بے حد بدصورت جنگلی شکل دکھا کر ناظرین سے واہ واہ سمیٹ لئے جاتے ہیں۔ وہ ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ انہیں ایک سٹیج دیا گیا ہے، کسی بھی بڑے ٹی وی چینل کا ایک بڑا سٹیج۔ وہ ناچ رہے ہیں، گا رہے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں ہمارا دل بہلا رہے ہیں۔ اینکر سے لے کر معزز ججوں کو بھی وہ پسند ہیں۔ وہ مسلسل ہنسا رہے ہیں۔ پھر وہ ہمارے ہی خاندان کے ممبر ہو جاتے ہیں کہ ہم ان کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ایک عام خاندان کے ممبر کی طرح، جہاں نہ دشمنی ہے، نہ دیواریں، نہ سرحد، نہ باڑ کے کٹیلے تار۔

جیسے منظر بدلتا ہے۔ وہ اچانک اُس پار کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایک بھیانک دشمن، بجرنگ دل، کوئی میر جعفر اچانک سیٹ پر آتا ہے اور اس کے گلے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ آج وہ ناچ نہیں رہا، ہنسا نہیں رہا ہے، رو نہیں رہا ہے۔ آج وہ سارا رول بھول کر ایک عام

سہما ہوا جانور بن گیا ہے۔ جہاں اس پر وہی،
ت سے نوازنے والے چیخ رہے ہیں۔ یہ
روزگار تک چھین کر لے جاتے ہیں۔ وہ اداکار
رف ایک غیر محفوظ شخص رہ گیا ہے۔ جنگ کی
وں کے درمیان کشمیر کے گلی کوچوں کے درمیان
تی فوجی ٹکڑیاں، آسمان پر منڈلاتے ہیلی کاپٹر،
دانوں کے بیان اور جنگ کے شعلے، میں شاید
ے کہرے، جنوری کی کپکپا دینے والی بھیانک
حصہ بن گیا ہوں اور جیسا کہ بچپن کے کسی لمحے
ی آنکھوں میں اس جنگ کے شعلوں کو پڑھنے کی
تھی میں نے۔

جنگ ختم نہیں ہوئی، جنگ ابھی جاری ہے۔
ماری بھول ہوتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ سب کچھ
ہے۔ ہم خیریت سے ہیں لیکن دراصل ایسا نہیں
ر ایک جنگ سے نکل کر ہم آہستہ آہستہ سفر میں
ڑی اور بھیانک جنگ کی طرف بڑھتے رہتے
ندوستان سے ہماری آزادی کی جنگ، جنگ ختم
؟ بہتر واں سال گزرنے کو ہے جیسے ایک صدی
لیکن کیا ہندوستان سے ہماری نفرت مٹی؟ یہی
ں جنگ ہے تو تھوڑی دیر کے لئے جنگ پر روک
ز لگا دی جاتی ہے لیکن جنگ نہ ہونے، نہ دیکھنے
اری رہتی ہے۔ پاکستان اور انڈیا کی جنگ ختم
؟'' بابو جی اس وقت اپنے سنگی لہجے میں بول
ے۔ ''وہ یہاں موجود ہے، یہاں''۔ وہ اپنے دل
ں اشارہ کر رہے تھے۔ ''اپنی ہر لمحے تیز ہوتی
میں جبکہ یہ جنگ تو 1947ء میں ختم ہو گئی تھی
اصل میں ختم ہوئی؟ جنگ ایک بار شروع ہو
ختم نہیں ہوتی۔ وہ یہیں کہیں رہ جاتی ہے، کبھی
بدبودار کپڑوں میں کبھی ہمارے پورے جسم میں
انکوں کا رقص جاری ہو جیسے جنگی ٹینک بارودی
شعلے اُگل رہے ہوں۔ آسمان تک دور دور تک دھوئیں
کی چادر آہستہ آہستہ اس نہ ختم ہونے والے دھوئیں
میں ایک سہما سا معصوم چہرہ ابھرتا ہے۔

''جو پوچھوں سچ بتانا، بتاؤ گے نا؟''

''ہاں، پہلے پوچھو تو''۔

''دیکھو جھوٹ بالکل نہیں''۔

''ارے بابا، بکو تو''۔

''اچھا سوچنے دو..... چلو سوچ لیا''۔ اس کی بے حد حسین آنکھوں میں، پیار کی گہرائی کے ساتھ ایک خوف بھی شامل تھا۔ ''دوسروں کی طرح کہیں تم بھی ہم سے نفرت تو نہیں کرتے؟''

جیسے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایک لمحہ کو لگا، جنگ کے دھماکے کو میرے چہرے پر آرام سے پڑھا جا سکتا ہے۔ یقینی طور پر دوسری طرف کیمرے میں میرے چہرے پر آئی کپکپی کو وہ شاید پڑھ رہی تھی۔

''سچ بتانا، جھوٹ بالکل نہیں''۔

''ہاں، تم سے نفرت کرتا ہوں''۔

ایک لمحہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے خوفزدہ چہرے پر پیار کے بے شمار رنگ اور پھولوں کی ہزاروں خوشبوؤں کا تحفہ لے کر موجود تھی۔

''مجھ سے یا میرے بھارت سے؟''

''تمہارے بھارت سے''۔

اب میری باری تھی جیسے میرے اندر خوشیوں کے شادیانے یا آتش بازی کی جگہ مسلسل پھٹنے والے آرڈی ایکس یا بم کے دھماکے جاگ گئے ہوں۔

''سروج اگر یہی سوال تم سے پوچھوں تو؟''

''شاید..... میں نفرت کر سکتی تھی تمہارے یہاں ایک چوہا بھی مرتا ہے تو الزام میرے لوگوں پر آتا ہے۔ مگر میں اپنی کہوں تو میں نفرت نہیں کر سکتی''۔

Pakistanipoint.com

''لیکن کیوں؟''

''تاریخ کی کتابوں میں تمہارے خطے کے لئے اتنی نفرتیں لکھیں کہ یہ نفرتیں آہستہ آہستہ پیار میں بدل گئیں۔ پھر تم مل گئے''۔ کمرے میں گھنے کہرے کے بادل چھا گئے ہیں۔ میں اس گھنے کہرے سے باہر بھی نکلنا چاہوں تو شاید نکلنا ممکن نہیں ہے۔ کیا سیاست صرف جنگ کے آر یا جنگ کے پار دیکھتی ہے۔ یعنی کہیں کوئی انتخاب نہیں۔ آزادی کی جنگ واحد انتخاب۔ شاید ہماری حفاظت ہماری خودمختاری کے لئے سب جیسے اندھیرے میں ایک بھیانک تاریخ لکھے جانے کے لئے، شاید اسی لئے کبھی جھوٹی تاریخ سے پیار نہیں ہو سکا مجھے، شاید اسی لئے ایک بار اس نے بے حد ناراضی سے کہا تھا۔

''تاریخ میں ہم صرف دو نفرت کرنے والی قومیں ہیں جن کے درمیان آزادئ وطن تک کبھی بھی امن کی کوششیں ممکن نہیں''۔ ایک کھلکھلاہٹ بھری آواز ابھری تھی۔ ''لیکن کتنا عجیب اتفاق ہے، دیکھو نا میرا ایک بھائی انڈین آرمی میں ہے۔ جانتے ہو، وہ ہم پر اپنا غصہ کیسے نکالتا ہے۔ ایک ہم ہیں جو کشمیر میں لڑ رہے ہیں، مر رہے ہیں، حملے کے منصوبے بناتے ہیں اور تم لوگ جب دیکھو پاکستانی ٹی وی سیریل سے چپکے رہتے ہو''۔ وہ ہنسی تو اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح سامنے آ گئے۔ ''میرے پاس تم ہو..... جیسے ڈرامے..... ہمارے یہاں سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ ٹی وی کو گھیر کر پورا خاندان بیٹھ جاتا ہے۔ اُف تمہارے یہاں کے اداکار..... مجھے تو معمر رانا سے زیادہ اچھا لگتا ہے ہمایوں سعید، مجھے تمہارے رسم و رواج بہت پسند ہیں''۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایک بھیانک سناٹا تھا۔ ''لیکن میرے مذہب میں یہ سب منع ہے''۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''یہ مذاہب بنے ہی کیوں؟ مذاہب نہیں ہوتے تو تقسیم نہیں ہوتی نا؟'' تقسیم نہیں ہوتی تو؟'' تو وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر جیسے نیلے آسمان سے گرتی بارش کی بوندوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر رہی تھی۔

''مذاہب نہیں ہوتے تو؟ شاید سوالوں کے بھنور سے ہم باہر ہی نہیں نکل پاتے۔ ایک کے بعد دوسرا سوال، نفرت نہ ہوتی تو؟ کشمیر پر ہندو قبضہ نہ ہوتا تو رنگ نسل کے بھید نہ ہوتے تو؟ کشمیر میں نو لاکھ فوجیوں نے لاکھوں کشمیریوں کو محصور نہ کیا ہوتا تو؟ رنگ نسل بھی نہ ہوتے تو؟ بابری مسجد شہید کو شہید نہ کیا ہوتا تو؟ کشمیر پاکستان نہ بنے تو؟''

جیسے خیالوں کی تنگ گلی میں چلتے چلتے میرے پاؤں تھک جاتے ہیں۔ آنکھیں کھولتے ہی جیسے نفرت کے رنگوں سے ہم خود ہی جڑنے لگتے ہیں۔

''ارے، وہ نہاتے نہیں۔ گائے کو ماتا کہتے ہیں اور سانڈ تو ان کا باپ ہوا۔ سالے گائے کا پیشاب پیتے ہیں، کھانے میں تھوک دیتے ہیں، شراب پیتے ہیں، بہنوں سے بھی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ بچپن سے ہی دہشت گردی کی تربیت پاتے بڑے ہو جاتے ہیں۔ ہماری بابری مسجد کو شہید کر کے مندر بنایا۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک نے مندروں کو توڑا نہیں بلکہ حفاظت کی''۔ ایک سے ایک بڑھ کر گھناؤنی کہانیاں۔ جیسے بچپن سے پڑھائی نہیں، ذہن میں یہی بھر دی گئی تھیں۔ اسلام دشمنی، ہم سب اسلامی دشمن ہیں ان کے لئے۔ جنہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جانا ہی ان کا ماٹو ہے۔ اس دہشت گرد انڈیا میں کم از کم دو کروڑ انسان چوہے کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ جسم فروشی انڈیا میں ہے۔ ستر فیصد آبادی کے پاس بیت الخلا کی سہولت موجود نہیں۔ جسمانی اعضاء کی فروخت میں بھی انڈیا نمبر ون ہے اور اسی انڈیا کے

Pakistanipoint.com

بہت سے دیہاتوں میں ایسے بورڈ آویزاں ہوتے ہیں جن پر جلی حروف میں لکھا ہے۔ اس گاؤں میں ہر کسی کا گردہ برائے فروخت ہے۔ ہندو کتابوں سے ملک کی سیاسی تقسیم تک وہی ایک نفرت کا باب اگر چاروں طرف سے آپ کو گھیرتا ہو تو؟ بچپن سے رٹائے گئے لفظ جوان ہوتے ہی نفرت کے شور اور بے ہنگم آوازوں میں بدل جاتے ہیں۔

ڈم، ڈم، ڈم جیسے ہزاروں کی تعداد میں آدم خور جمع ہوں۔ سالوں نے جموں کشمیر پر قبضہ جما لیا۔ اب آزاد کشمیر کو بھی ہندوستان بنانے کا سپنا دیکھنے لگے۔ آپس میں مرو سالو..... اسرائیل، رُوس سے لے کر بھوٹان اور نیپال کی کہانیوں میں عام چہرے والا ہندو بھی درندہ مودی نظر آتا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد انتہا پسند ہندو نتھو رام گاڈ سے نے اپنے باپو گاندھی جی کو پاکستان دوستی کے الزام میں قتل کیا۔ اپنے باپو کو مارنے کے بعد اب اس ناخلف ذہنیت کے گاندھی جی کی ارتھی کی راکھ بھی چوری کر لی ہے اور میوزیم میں موجود مہاتما گاندھی کے مجسمے اور تصویروں پر سبز پاکستانی رنگ بھر کر گاندھی کو پاکستان دوستی کے الزام میں عذاب بھی لکھ دیا ہے۔ سو ایسے جانوروں سے کہیں بدتر جنونیوں کے ہوتے ہوئے میرے مقبوضہ کشمیر میں کھدائی کے دوران 27 سو اجتماعی قبروں کا انکشاف ہو تو حیرت کیسی؟ ہاں پھر گھر سے نکلتے ہی معصوم چہرے والے ہندو دوستوں میں شاید یہ نفرت کے رنگ ایک دم ایسے چھپ جاتے تھے جیسے بادلوں نے سورج اپنے محاصرے میں لے لیا ہو لیکن کب تک۔ پھر کوئی فرقہ وارانہ فساد، دہلی سے لے کر لدھیانہ تک، دہشت گردی اور ہندوستان دہشت گردوں کا سرپرست۔

علاقائی سپر پاور بننے کے خبط میں مبتلا بھارت کی اصل حالت دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ بھارت کے عوام غلاظت میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنے جمہوری آقاؤں کے کوڑے کھا کے لطف اٹھاتے ہیں۔ کرپشن ان کی ہڈیوں میں شامل ہے۔ اس غلاظت میں ڈوبے ہوئے ملک کے ہوش میں آنے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ کشمیر پر ہندوؤں کی دہشت گردی مسلمانوں سے بھتہ لینے سے لے کر آر ایس ایس کے دہشت گردوں تک جہاں فساد سے آر ایس ایس کے لوگ خونی بیانوں میں عام ہندوؤں سے ہمیں ایک دوری بنائے رکھنے کی صلاح دیتے تھے۔ یہ مثل کا نہیں عقل کا دور ہے۔ یہ تعداد کا نہیں ایجاد کا زمانہ ہے اور آج کا میدان جنگ پلاسی، پانی پت یا ساموگڑھ نہیں بلکہ کمپیوٹر کی سکرین ہے۔ پچاس لاکھ ٹارزن، ہرکولیس اور رستم بھی جمع ہو جائیں تو ایک معمولی سا بم ان کی طبیعت صاف کرنے کے لئے کافی ہے اور بے حد سادگی کے ساتھ مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں ہندوؤں سے کبھی محبت نہیں کر پایا۔ وہ میرے اندر نفرت۔ بھرے رنگوں کا ایک حصہ ہی رہے لیکن شاید تب تک جب تک سروج نہیں ملی تھی۔

سروج دیوی، ہندوستان کے کشمیر کہے جانے والے میر قاسم جان محلے میں رہنے والی۔ جیسا کہ میں نے اسے بتایا کہ ایک ایسا ہی میر قاسم جان میرے کشمیر میں ہے تو اس کی آنکھیں بھی محلے میں اڑتے کبوتروں کے درمیان انارکلی فلم کی طرح۔ یہ زندگی اسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا۔ ٹھیک ویسے ہی نور جہاں جیسے اس گیت میں خوبصورت رقص کرتی اس گیت میں کمر لچکاتی۔ ٹھمکے لگاتی۔ اپنی بھرپور اداؤں میں ایک بے حد الفت کی لہر بن گئی تھی۔ ٹھیک یہ گیت سرحد پار بھی گایا جا رہا تھا۔

اداکارائیں بدل گئی تھیں۔ وہاں بھی کبوتروں کے جھنڈ تھے۔ گلی میر قاسم جان محلے کی تنگ گلیاں تھیں۔ آدمیوں کے شور وغل سے بھرا بازار تھا اور شاید سب کچھ

Pakistanipoint.com

وہی تھا جو کشمیری کشمیر کی گلیوں میں تلاش کرتے تھے۔

سروج دیوی سے ملنے سے پہلے تک بھارت صرف ایک ملک تھا میرے لئے۔ ایک دشمن ملک، ایک دہشت گرد ملک جہاں ہمارے کشمیر کو تباہ کرنے کے لئے دہشت گرد تیار کئے جاتے ہیں۔ پھر دہشت کا ماحول پیدا کرنے کے لئے ہمارے خطے میں انہیں اتار دیا جاتا ہے۔ پاکستان سے کشمیر تک ایک خونی، کبھی نہ ختم ہونے والی عبارت لکھنے کے لئے لیکن شاید ایک ایسی ہی عبارت محبت کے اندھے یقین کی ہوتی ہے، جہاں دماغ نہیں، صرف دل کی سلطنت چلتی ہے۔

ہم عام طور پر شاید ایک دوسرے کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا میڈیا اور سیاست ہمیں بتاتی ہے۔ نیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے ہم دیس بہ دیس کے کتنے ہی لوگوں کو قریب سے جان پاتے ہیں۔ شاید اسی لئے اس بے حد اندھیرے وقت میں نیٹ کا ساتھ مجھے غنیمت لگتا تھا اور بہت سے اپنے دوسرے دوستوں کی طرح میرے اندر بھی ہندوستانی لڑکیوں کی قربت پانے کی ایک چاہت ظاہر ہو چکی تھی لیکن کیا وہ بات کریں گی؟ وہ بھی کسی کشمیری سے؟ کسی مسلمان لڑکے سے؟ آزادئ وطن کے نام پر جہاں ایک کے بعد دوسرا شہادت کے لئے سینہ تان دیتا ہے کہ دشمن یہ نہ سمجھے کہ مظلوموں کی تعداد تھوڑی تھی۔

نیٹ روشن تھا۔ ہندوستان پر کلک کرتے ہی بہت سارے موجود ناموں میں ایک نام سروج دیوی کا بھی تھا۔ آہستہ سے میں نے اس نام پر کلک کیا۔ میسج باکس میں آہستہ سے لکھا۔ ہیلو..... پھر شروع ہوا انتظار کا لمحہ..... میں نے پھر میسج ٹائپ کیا۔ ''آر یو دیئر؟''

دوسری طرف سے جواب آیا۔ ''ناٹ انڈر سٹینڈ''۔ مجھے تعجب نہیں ہوا شاید اب میں لڑنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے ٹائپ کیا بٹ وہائی..... کیونکہ میں کشمیری ہوں؟ ہاں ہوں، کشمیری ہونا کوئی جرم؟

''کیونکہ تم لوگ گندے ہو۔ تم لوگ، ہمارے بارے میں افواہیں پھیلاتے ہو الزام لگاتے ہو''۔

''ہم الزام نہیں لگاتے، یہ تم ہو جنہوں نے کشمیر میں چار ماہ سے لاکھوں کشمیریوں کو محصور کر رکھا ہے۔ ایسا مسلسل کرفیو جنگِ عظیم اوّل اور دوم میں بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا''۔

اب میسج کا سلسلہ چل پڑا تھا، مجھے احساس تھا کہ اب اس کے چہرے پر بل پڑ گئے ہوں گے۔ اس بار میسج تاخیر سے آیا۔ پوچھا گیا تمہارا نام؟

''حسن صدیقی''۔

''مسلمان ہو؟'' اچانک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ گئی۔

''میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم ہندو ہو؟''

''سوری!''

''سوری کی ضرورت نہیں لیکن کیا مسلمان ہونا جرم ہے؟'' شاید باتیں کرتے ہوئے ہم ایک بے حد گھناؤنا ماضی بھول کر لا مذہب اور لبرل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

''تم ہندو اس لئے ہو کہ ہندوؤں کے گھر پیدا ہوئی''۔

''ہاں، جیسے تم مسلمان اس لئے ہو کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے۔ تم ہندوستان میں جنمی داس لئے نفرت کے ماحول میں یہاں کے دروازے تمہارے لئے بند۔ جیسے تم کشمیر میں دشمنی کی سوغات لے کر آؤ گے تو ہم مشین گنوں کا رخ تمہاری جانب موڑ دیں گے''۔

''اتنی نفرت کیوں؟''

''نہیں جانتی''۔

''کیا سب سیاست ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی

ہے۔ شاید نہیں، کیونکہ ہم سیاست کے شکار نوالے ہوتے ہیں۔ جنہیں نگلتے ہوئے سیاست دان ہمارے بارے میں نہیں سوچتے تمہارا نام کیا ہے؟''

''سروج دیوی!''

''سروج..... اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟''

''ندی کی پیدائش..... کنول''۔

''لیکن تم ایسی دکھتی تو نہیں''۔

''شٹ اپ!'' لیکن ساتھ ہی اس نے جلدی سے ٹائپ کیا تھا۔ ''مجھے کشمیری اچھے لگتے ہیں۔ بہت دنوں سے کسی کشمیری سے بات کرنے کی خواہش تھی''۔

شاید سرحد کے اُس پار ممکن ہے یہ ایک عام سی خواہش ہو۔ جیسے یہاں کے ماحول میں ایسی ہی ایک خواہش میرے اندر بھی جاگی تھی۔

''تم لوگ اتنے گندے کیوں رہتے ہو۔ بس..... ذرا سے پانی سے نہا لیا اور بازو سے وہ باریک سا دھاگہ..... امام ضامن ہاں وہی باندھ لیا۔ دھاگہ باندھ لینے سے آدمی پاک ہو جاتا؟'' میں نے اپنے سوالوں کو روک لیا تھا۔ اس لئے کہ میں اچانک چونک گیا۔ میں بھی پوچھ سکتا تھا۔ اچھا امام ضامن باندھ کر ہم پاک نہیں ہو سکتے مگر جو تم لوگ رام دیو درشن کرتے ہو۔ بتوں کی پوجا کرتے ہو۔ گنگا کے تعفن زدہ پانی میں اشنان کرتے ہو، وہ؟ ماضی کی کہانیوں میں ہندوؤں کو گندا اور ملیچھ کہے جانے پر کتنے ہی واقعات گھوم گئے تو وہاں بھی ایسی ہی رائے ہمارے بارے میں بھی ہے۔ وہاں بھی ایک میر قاسم جان گلی ہے۔ نور جہاں کی طرح شرارتی ادائیں دکھاتی ایک اپسرا سرحد پار بھی ہے۔ جو اِدھر ہے وہی کچھ اُدھر ہے۔ امن سے دہشت اور خواہشات سے سیاست تک۔ شاید اس دن پہلی ملاقات میں ہی ہم دوست بن گئے تھے۔ بے حد اچھے دوست اور دوستی کے لئے سرحدیں، ذات پات، مذہب، شاید ساری چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس دن سروج دیوی دیر تک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ہمارے دین اسلام کو دیکھ کر اس کے اندر عجیب عجیب سوالوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سچ مچ خدا کے پیارے نبی تھے؟ جدہ کی اہمیت کیا ہے۔ وہاں مسلمان شوق سے کیوں جاتے ہیں؟ مسلمان سعودی عرب شوق سے کیوں جاتے ہیں؟

''کیونکہ یہ ملک ہمارے محبوب کا ملک ہے۔ جہاں کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پلے بڑھے تھے۔ دنیا کو انہوں نے اپنے پیغام سے متوجہ کیا۔ مسلمان جدہ جاتے ہیں۔ مکہ جاتے ہیں۔ خانہ خدا کو دیکھتے ہیں۔ حجرِ اسود کو دیکھتے ہیں کہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خانہ کعبہ میں رکھا تھا۔ پھر مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ شاید اِدھر سے ہمارے رسول گزرے ہوں۔ پھر مدینہ جاتے ہیں، روضۂ اقدس کو دیکھتے ہیں۔ منبر کو دیکھتے ہیں کہ جہاں رسولؐ کھڑے ہو کر اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ منبر کے سامنے کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ شاید یہیں حضورؐ کھڑے ہو کر اللہ کی بارگاہ میں سجدے کرتے ہوں۔ پھر مسجد قبا بھی جاتے ہیں۔ جو رسولؐ نے بنائی تھی، جو دنیا کی پہلی مسجد تھی۔ اس جگہ کو بھی دیکھتے ہیں جہاں سرورِ دو عالم کھڑے ہو کر خدا کی واحدانیت کا اعلان کیا کرتے تھے۔

ہر مسلمان کی خواہش صرف اتنی ہوتی ہے کہ اس جگہ آنکھیں بچھا دے۔ جہاں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قدم رکھا ہو۔ اس جگہ سجدے کریں کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سجدہ کیا ہو۔ ایک

مسلمان کے لئے یہی حاصل زندگی ہے''۔

اب مذہب گم تھا۔ دل میں اسلام سے عقیدت کی آواز، مندر کی گھنٹیاں اور مسجد سے آتی اذان کی آواز۔ جیسے سب ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ سرحدیں ٹوٹ گئی تھیں اور شاید جنگ کے تمام ممکنات کے باوجود محبت اور صرف محبت باقی رہ جاتی ہے جو جنگ کی بھیانک تباہی کے دوران بھی زخمی دلوں میں مرہم لگانا جانتی ہے۔

پھر سروج سے مکالمے کے دروازے کھل گئے۔ وہ ہندوستان، وہاں کے معاشرے، بندشوں اور گھٹن کے بارے میں بتاتی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ ایک نفرت باقی رہ گئی ہے۔ تم لوگوں کے لئے۔ آر ایس ایس کے نوجوان داڑھیاں بڑھا رہے ہیں۔ نفرت اب چہرے کی گھنی ہوتی داڑھیوں سے بھی جھانک رہی ہے۔ یہاں معاملہ مذہب کا نہیں ہے۔ اخبار، میڈیا اور سیاست نے جو زہر بھرا ہے اس سے مورچہ لینا آسان نہیں لیکن اب..... سروج کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

''پہلے میرے لئے یہ ایک عام سی بات تھی لیکن شاید اب نہیں کیونکہ وہاں تم رہتے ہو''۔

''اور اگر میں نہیں رہتا تو؟''

''نہیں جانتی''۔

''شاید یہی احساس میرا بھی ہے۔ تمہارا وہاں ہونا میرے اس احساس کو بہت حد تک کم کر چکا ہے جہاں تم سے ملنے سے پہلے تک صرف نفرت کا بسیرا تھا۔ نفرت چند لوگوں کے لئے نہیں۔ ایک پورے ملک کے لئے''۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''کیا یہ عجیب نہیں لگتا۔ اس گلوبل ولیج میں جہاں سب ایک چھوٹے سے آشیانے میں سمٹ آئے ہیں۔ یہ کیسی خوشی ہے کہ ہماری حفاظت کے لئے ایک ملک کو بم اور مزائلوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے؟''

''کیم'' پر اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ ایک بے حد حسین چہرے میں جیسے خود کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کی آزادی سمٹ آئی تھی۔ کیم پر ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کو سن رہے تھے۔

''ہم بھی اُڑنا چاہتے ہیں حسن صدیقی! جیسے تمہارے ملک کی لڑکیاں اڑتی ہیں ہواؤں میں۔ اپنی آزادی کے خوبصورت سپنوں کے ساتھ لیکن یہاں کے معاشرے میں پیدا ہوتے ہی ہمارے پر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں پڑھایا اس لئے جاتا ہے کہ اس ماحول میں پڑھائی بھی ایک سٹیٹس سمبل ہے بس..... لڑکی کہاں پڑھ رہی ہے؟ کانونیٹ کسی؟ انگریزی کس لہجے میں بولتی ہے؟ تاکہ پارٹی اور نمائشی میلوں میں اپنے سٹیٹس کی بھی نمائش کی جا سکے لیکن ہم کچھ بھی پڑھ لیں صدیقی! سپنے نہیں ہوتے ہمارے پاس سپنے بڑی خوبصورتی سے ماں باپ کی تحویل میں ہوتے ہیں اور جانتے ہیں ان سپنوں کا فیصلہ وہ کرے گا، کل جو ہماری زندگی میں آئے گا۔ ہمیشہ کے لئے اور اس ہمیشہ کے لئے زندگی میں آنے والے مرد کو بیوی نہیں، گھر سنبھالنے والی ایک عورت چاہئے لیکن میں اُڑنا چاہتی ہوں۔ میں نے ایم بی اے کیا..... کچھ کرنا چاہتی ہوں زندگی میں لیکن.....'' اس کی آنکھوں میں نمی سی لہرائی، ''ہمارے ملک میں یا تو عورت نمبر ون ہے یا پھر زیرو۔ اندرا گاندھی، بے نظیر، خالدہ ضیاء یا شیخ حسینہ جیسی عورتیں ہیں لیکن ان عورتوں کا بھی ایک سیاسی بیک گراؤنڈ رہا ہے۔ انہیں چھوڑ دیں تو یہاں سے سعودی عرب تک سیاست میں بھی عورتیں کہیں نہیں ہیں اور اب لشکر ہیں۔ آر ایس ایس کے ہندو دہشت گرد ہیں اور کتنے ہی لشکر کہ کبھی بھی ہمارے پڑھنے یا باہر نکلنے کے خلاف بھی ایک تحریک آ سکتی ہے۔ پھر ہم ڈرپے

میں بند مرغیاں بن جائیں گی صرف گردن مروڑنے والے جلاد کے انتظار میں''۔

وہ رو رہی تھی۔ ''یہ کوئی زندگی ہے صدیقی! اس زندگی سے تو مر جانا اچھا لگتا ہے''۔ سروج سائن آؤٹ کر گئی تھی۔ یکم پر اندھیرا چھا گیا تھا لیکن اندھیرے میں بھی اس کے لفظ چیخ رہے تھے..... یہ کوئی زندگی ہے صدیقی! اس زندگی سے تو مر جانا..... اسی دن شاید اس کیفیت میں مَیں دیر تک سو نہیں پایا۔ کبھی ہم کتنے مجبور اور بے یار و مددگار ہوتے ہیں۔ دیواریں، سرحد پار خارزار تاروں کی قطار، ان تاروں کے آر پار صرف بجلی کے جھٹکے یا نفرت کے رنگ۔ اب تک شاید آپ نے اندازہ کر لیا ہو کہ یہ کہانی بے حد نفرت کے دنوں میں شروع ہوئی۔ یعنی ایسے موقع پر جب دہشت کی بساط پر کشمیری بھارتی افواج کی سفاکی کا شکار ہیں لیکن آج وادیٔ کشمیر سے بدلی ہوئی ہوا کی خوشبو آ رہی ہے۔

کشمیر..... ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کی صداؤں سے گونج رہا ہے۔ کشمیر کے گلی کوچے مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہو گئے ہیں۔ یہ خون آشام ماحول دیکھ کر مستقبل کا مؤرخ بھی منہ ڈھانپے کھڑا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہے کہ دنیا کے ضمیر کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی اندھا بھی اتنا اندھا نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں کو نہ دیکھ سکے پھر دنیا کی آنکھیں تو ہر آن کھلی ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھیں تو یہ کھلی زیادتی ہے۔ یہ دور عجیب دور ہے کہ جس نے بے ایمانی کا نام سیاست رکھ دیا۔ یہاں تو ایٹم بم بھی اس لئے بنائے جاتے ہیں تاکہ دنیا میں امن قائم رکھا جائے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ کشمیر کے عوام آزادیٔ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ جیل جا رہے ہیں، گولیاں کھا رہے ہیں لیکن یہ توپ کے گولے، ہوائی جہازوں کے بم، مشین گنوں کی گولیاں، دنیا کی اخلاقی امداد اور ہمدردی سے نہیں رک سکتیں۔ مگر سر کٹانے کا جذبہ اس کا بھوکا ہی کب ہوتا ہے۔

لیکن اس بار مسلمانوں کے قتل عام میں ہندوؤں کی کٹر تنظیموں نے جگہ لی تھی۔ یہاں یہ اشارہ صاف تھا کہ مسلمانوں کی نسل کُشی کے بغیر چارہ نہیں۔ میڈیا کے خلاصے نے دہشت گردی کا ایک نیا چہرہ دکھایا تھا۔ شاید انہی دنوں پہلی بار سروج کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد میرے خیالوں اور کرٹپن میں تھری سی کمی آئی تھی لیکن بابو جی کا لہجہ ویسا ہی تیکھا اور شدت پسند تھا۔ بالکل جب کسی قوم میں وطن کی حرمت پر سر کٹانے کا جذبہ راسخ ہو جاتا ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت محکوم بنائے نہیں رکھ سکتی۔ جہاں وسائل، کوششیں اور خواہشیں ناکام رہتی ہیں۔ وہاں مستحکم ایمان سہارا دیتا ہے۔ کیونکہ ایمان کی قوت ہی دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔ شاید جنگ کا کوئی راستہ نہیں لیکن نفرت دور بھگانے کا ایک ہی راستہ ہے، پیار..... جو اچانک آپ کو ساری ناامیدی سیاست داؤ پیچ سے باہر نکال کر صرف ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ بس..... چلتے..... چلو.....

سروج پوچھ رہی تھی۔ ''تمہارا میڈیا ہم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟ ایک ہی ملک کے تھے ہم، ایسی باتیں اب شاید گزری تاریخ کا حصہ لگتی ہیں۔ اب یہ دو نفرت کرنے والی آنکھیں ہیں۔ ایک دوسرے کو گھورنے والی''۔

''یہ تم کہہ رہی ہو اور جو تمہارے ملک کا میڈیا کرتا ہے؟''

''ہمارا میڈیا اتنا سٹرونگ نہیں جتنا تمہارا ہے۔ تمہارے یہاں سے بس زہریلی گیس کی بارش ہوتی ہے''۔

''ہم تو صرف بارش کرتے ہیں اور تم..... تم اپنے ہندو دہشت گرد بھیجتے ہو، کشمیر کو ختم کرنے کے لئے، کشمیر

سے پاکستان تک''۔

''کشمیر کا نام مت لو، وہ ہمارا ہے۔ دوبارہ یہ بولنا بھی مت''۔ کیم پر میرے کانپتے چہرے کو یقیناً وہ دیکھ رہی ہوگی مگر جیسے میرا خون کھول گیا تھا۔

''ہم جانتے ہیں تمہارا ملک یہ سب کشمیر کے نام پر کر رہا ہے۔ کیونکہ تم کشمیر کو پاکستان کا حصہ ماننے کو تیار نہیں۔ تم ایک سڑے اور بدبودار ماضی میں سانس لیتے ہو اور تمہارا ہندو لشکر کشمیر کو ہتھیانے کے لئے پاکستان کی بربادی کے مہرے بٹھاتا ہے۔ تمہارے مندر دہشت گردی کی فیکٹری بن جاتے ہیں اور تمہارا ہندو مذہب، بس مسلمانوں کو مارو، مار دو اور ہندو راج قائم کرو کے بیہودہ اور ناممکن تجربات میں جٹ جاتا ہے''۔

''بکو مت!'' وہ غصے میں چلائی تھی۔ ''اور تم لوگ وہاں ہندوؤں کو مارتے ہو۔ زندہ جلاتے ہو۔ دنگے کرتے ہو۔ دوسرے درجے کا شہری سمجھتے ہو؟ پلوامہ حملے میں ہندوؤں کو بھون دیتے ہو اور مندروں کو توڑ دیتے ہو۔ ایک بابری مسجد کا جواب تم لوگ ہزاروں مندر توڑ کر دے چکے ہو اور ہاں یہ بھی سن لو۔ جنہوں نے بابری مسجد توڑی، یہ معاملہ بھی عدالت میں ہے، اسے ملک کے کسی بھی ہندو نے قبول نہیں کیا لیکن تم..... تمہاری مسجدوں میں گولیاں چلتی ہیں۔ تم اردو بولنے والے کو مہاجر کہتے ہو''۔

''جو کچھ تمہارے یہاں گجرات میں ہوا؟ تم بھول جاتی ہو کہ تمہارے دہشت گرد تمہارا اپنا ملک بھی تباہ کر رہے ہیں''۔ وہ ایک لمحہ کو ٹھہری تھی۔

''ہم سیاست لے کر کیوں بیٹھ گئے؟ ایک آگ یہاں بھی لگی ہے۔ دہشت کے سوداگر خوف اور وحشت کی زبانیں ہی جانتے ہیں۔'' میں سیاست بھولنا چاہتی ہوں صدیقی! اور اس وقت جانتے ہو میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کبھی ہم ایک تھے..... ایک ملک، کتنا نادر اور خوبصورت خیال ہے..... جیسے جسم ایک..... ایک روح۔ ایک ملک و فاصلے ہی مٹ جائیں۔ ایک ہونے کا تصور بھی کتنا عجیب ہے..... ہے نا؟'' کیم پر اندھیرا..... مائیک آف تھا۔ سروج نے ٹائپ کیا..... ٹی سی اینڈ بائی!

لیکن جیسے ابھی ابھی اس کے بولے گئے الفاظ میزائل راکٹ لانچرز جیسے گھناؤنے ہتھیاروں سے الگ میرے پورے وجود میں ایک ایسی کوبتا لکھ گئے تھے۔ شاید جسے سننے کے لئے میں کب سے بے قرار تھا۔ مگر سب کچھ ایسا ایک یوٹوپیا جیسا۔ سرحد کی دیوار سے بھی بڑی ایک مذہب کی دیوار لیکن خوف اور دہشت کے ماحول میں ہماری نفرت بھری باتوں کے درمیان اس نے خاموشی سے ایک پیار کا پودا لگایا تھا لیکن میں جانتا تھا۔ یہ کوئی برلن کی دیوار نہیں۔ جسے آپسی سیاسی سوجھ بوجھ سے توڑ دیا جائے اس دیوار کے ایک طرف ہندو ہے اور دوسری طرف کشمیری مسلمان..... لیکن سروج کا آخری لفظ اس بار مجھے حیران کر گیا تھا۔ وہ دو دن تک غائب رہی۔ نہ فون آیا، نہ نیٹ پہ کوئی بات ہوئی۔ شاید یہ میرے لئے بے حد حیران کرنے والے دن تھے۔ جہاں ایک انجانی سی کسک اور چبھن مجھ میں جاگ چکی تھی۔ تیسرے دن وہ نیٹ پر ملی۔

''کیسے ہو؟''

رسمی بات چیت کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے ٹائپ کیا۔

''اس دن جو کچھ تم نے کہا، کیا صرف ایک مذاق تھا؟''

''نہیں''۔

''لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟''

اب کیم روشن تھا، ہم ایک مائیک پر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

Pakistanipoint.com

''صدیقی! دو دن تک میں اس پہیلی میں ڈوبی ہی جو انجانے میں میرے ہونٹوں سے نکل گئی تھی لیکن ب کہہ سکتی ہوں۔ انجانے میں نہیں۔ شاید تم سے قات کے بعد مسلسل اس موضوع پر سوچتی رہی تھی۔ یکھو، میں پیار کو کوئی بندھن کوئی کانٹکٹ نہیں مانتی کہ ار کیا ہے تو سامنے والا مل ہی جائے۔ پیار ان سب سے الگ ایک احساس ہے، جہاں نہ دیکھنا ضروری ہے ملنا..... اگر ہم نیٹ پر ایک دوسرے کو نہ دیکھتے، نہ تیں کرتے تو کیا پیار نہیں ہوتا؟ یہ جانتے ہوئے بھی ہ پیار صرف ایک میل آئی ڈی سے بندھا ہے جس کا س ورڈ تمہارے پاس ہے۔ ایک دن پاس ورڈ بدل دو کے یا دوسری آئی ڈی بنا دو گے۔ یہ رشتہ بھی ختم ہو ئے گا لیکن تب بھی تمہارے لئے آخر تک ایک پیار ی تو رہ جائے گا، میرے پاس''۔

کیم پر اس کی آنکھوں میں کشمکش کے آثار تھے۔ لیکن اس دن جو کچھ کہا بے حد سنجیدگی سے کہا۔ مجھے تم وں کے لباس پسند ہیں کھانے پسند ہیں، عبادت کا یقہ پسند ہے۔ پسند کے معاملے مذہب سے بلند تے ہیں۔ یہاں مذہب نہیں آتا۔ جیسے تم پسند ہو اور تم رے مذہب کے نہیں۔ یہ سوچ کر تمہیں پیار نہ کروں یہ ایک طرح کا خود پر ظلم ہوگا۔ ممکن ہے مجھے تمہارے س اور پہناوے پسند ہوں لیکن تمہیں ہمارے لباس یا ناوے بالکل پسند نہیں ہیں۔ تو کیا ایسی صورت میں رے پیار کو خارج کر دو گے؟''

''نہیں''۔

''جانتی ہوں، آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے م و رواج بھی قبول کر لیں گے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں سے ملتے گلیشیئرز تک ہم اپنی مٹھی میں کرنا جانتے ہیں۔ ند سے خلاء اور نئی دنیا کی تلاش تک۔ پھر ایک چھوٹا سا ج قبول کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا صرف اس لئے کہ کسی بدتر دھماکے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں یہ دیواریں جو مذہب کی ہیں؟'' وہ سنجیدہ تھی۔ ''چلو..... ایک بار پنگا لیتے ہیں لیکن..... مجھے چاہتے ہو یا نہیں۔ سوال یہ ہے؟ ہاں تو پنگا لو..... اٹھائیس سال کے مرد ہو..... جاب کرتے ہو جہاں دنیا میں اتنی بڑی بڑی باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم ایک چھوٹا سا پنگا نہیں لے سکتے؟ خ

اس دن ایک بار پھر وہ مجھے حیران کر گئی تھی۔ وقت کو حاضر و ناظر جان کر کہ یہ سب کچھ انہی دنوں واقعہ ہوا جب ہندوستان نے کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر کے اسے بھارت کا ایک حصہ بنا دیا۔

آئین کی شق 370 اور A-35 کو واپس لے لیا گیا۔ اب کشمیر بھارت کا ایک حصہ بن گیا جیسے کرناٹک وغیرہ ہیں۔ اب بھارت کا کوئی بھی شہری کشمیر میں جائداد خرید سکتا ہے۔ کشمیر میں سرکاری ملازمت کر سکتا ہے۔ پچھلے 72 سال سے کسی ہندوستانی شہری کے کشمیر میں جائداد خریدنے اور سرکاری ملازمت اختیار کرنے پر پابندی تھی۔ اس سے آہستہ آہستہ کشمیر میں مسلم اکثریت ختم ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک طویل عرصے میں مسلم اکثریت مسلم اقلیت میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔

مسلمان 1947ء ہی میں ایک ملک کے مالک نہیں بنے بلکہ ایک ہزار سال تک وہ پورے برصغیر کے مالک رہے۔ ان میں اس دور میں کوئی نفرت کوئی کدورت نہیں تھی۔ 1947ء کے بعد بھی وہی انسان ہیں۔ صرف انداز فکر کی تبدیلی نے یہ سب کچھ بدل ڈالا۔ ایک ہزار سال کے بعد ایک بار پھر 72 سال تک کسی نہ کسی سطح پر مل جل کر رہنے والے آج ایک بار پھر الگ ہو گئے۔ اگر بھارت پاکستان سے کمزور ہوتا تو کشمیر اوّل تو تقسیم نہ ہوتا، تقسیم ہوتا بھی تو آج بھارت نے کشمیر کے ساتھ جو کیا وہ نہ کیا جاتا۔ نسل کشی اور فرقہ واریت کا ننگا کھیل الگ الگ ماسٹر مائنڈوں کی تلاش کا

Pakistanipoint.com

سلسلہ اس سے پورا خطہ کانپ اٹھا تھا جس سے پاکستان نے جنگ کے بگل بجا دیئے۔ چار دن تک پاک فضائیہ نے سارے ہندوستان کی نیند اُڑا دی تھی لیکن سب سے اہم تھا کہ اگر سرحد پار کے انتہا پسندوں کا اس پورے معاملے میں کوئی رول ہے تو ملک کے سارے عوام کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اس پر اپنی ناراضی جتائے بلکہ ہندوستانی ہونے کے احساس کو بھی نفرت سے دیکھے۔

مجھے لگا کہانی ختم ہوگئی..... شاید ایسی کہانیاں اسی طرح سونامی کی شدت کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں۔ جیسے نفرت کے اس ماحول میں ہندوستان یا اس ملک کے کسی بھی شخص سے محبت کا رشتہ رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اخبار چیخ رہے ہیں۔ میڈیا آگ اُگل رہا تھا۔ حملے کی وارننگ کے باوجود رات کے اندھیرے میں افغانستان کے راستے سے پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے والے درندوں نے دہشت کی وہی کہانی لکھی تھی جو امریکہ میں 9/11 کو پیش آیا تھا لیکن امریکہ اپنی دادا گیری کے حالات کو بہتر بنانے میں کامیاب رہا تھا لیکن یہ کشمیر ہے۔ امریکہ نہیں، جہاں سکیورٹی فورسز کے اعلیٰ افسر بھی اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ وہاں حفاظت کے بڑے ذریعے یا حل سوچنا بھی مشکل لگتا ہے لیکن حفاظتی دستوں کے ٹکراؤ میں وہ شخص پکڑا گیا تھا۔ جن سے ثبوت جٹانے کا کام اب پاکستانی سرکار کر رہی تھی۔ وہی سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک حیوان چہرہ۔ دائیں ہاتھ میں بندھی لال پٹی۔ بائیں ہاتھ میں کالی، دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا AK47 کشمیر ہوٹل چاروں طرف چل رہے موت کے مناظر سارا کشمیر جیسے سانسیں روک کر دیکھ رہا تھا۔

محبت ہار گئی تھی، آخر یہ ایک دکھ بھری خبر تھی، دہشت کی فتح ہوئی تھی۔

سروج کی آواز دھماکوں میں کہیں کھو گئی تھی۔ تم ایک پنگا بھی نہیں لے سکتے۔

یہاں دوبارہ ان خونی کارروائیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا لیکن جب میری خیریت کے لئے اس حادثہ کے ساتویں دن سروج نے فون کیا تو جیسے ساری نفرت میرے ہونٹوں پر آ گئی تھی۔

''مر گیا میں..... حسن صدیقی! سری نگر پرائیویٹ C.C.C کمپنی میں کام کرنے والا ایک آفیسر اس آفیسر کے پاس اپنے باؤ جی کو تسلی دینے جانے والے سارے الفاظ چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ تم جانتی ہو نا ان کا تعلق آر ایس ایس سے ہے؟''

''ہاں''۔

''کیا سمجھتے ہو تم لوگ؟ کلبھوشن کی سزائے موت اور ابی نندن کی چھترول کافی نہیں تھی جو اب پھر ایسی کارروائیاں کرنے چلے آئے۔

''لیکن صدیقی یہ میں تو نہیں تھی''۔

''یہ تم ہی تھیں..... تم سب ایک ہی ہو ہندوستانی..... جو اس وقت ہمارے لئے ایک ناسور یا کینسر کے زخم سے زیادہ بدتر ایک ایسا وائرس ہے جو ہم سے سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے''۔

''سیاست کی سزا ہمیں کیوں دے رہے ہو؟''

''سیاست!، کیا یہ صرف ایک سیاست ہے یعنی پاکستان اگر اس جنگ کو ٹالتے ہوئے تمہیں ثبوت دے رہا ہے تو تمہارے ان دہشت گردوں کو مانگ بیٹھتا ہے تو یہ سیاست ہوگئی؟'' میں غصے میں ابل رہا تھا..... شاید وہ تمام رپورٹس میرے سامنے تھیں جو میں اسے بتانا چاہتا تھا۔ 2007ء کے بعد سے اب تک بھارت کے ذریعہ شہید کئے گئے معصوم لوگوں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہم صرف گھریلو جنگ لڑ رہے ہیں اور عراق سے تھوڑا پیچھے ہیں۔ صرف بارہ برسوں میں ڈوڈھ، کشتواڑ، رام بن، اُدھم پور، بارہ مولہ، کپواڑہ، سری نگر، لداخ اور

یہ سب ایک جیسے خطے ہیں۔ بس یہاں جدوجہد آزادی کے 72 سال بعد بھی 77 فیصد لوگ آج بھی دس روپے روزانہ پہ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری ہمدردی ہماری کمزوری نہیں ہے۔ اب ہم نے بھی تمہاری غلامی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے''۔

''بہت غصے میں ہو؟ تمہارا یہ چہرہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ مگر اچھا ہے صدیقی! میرے ملک سے نفرت کرو لیکن میں..... کیا ملک میں رہنے والے عوام سے نفرت جائز ہے؟ یہاں کئی لوگ ہیں جو تمہاری طرح سوچتے ہیں..... ہم اس بے حد نفرت بھرے نظام کی کٹھ پتلی بن جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا صدیقی؟'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''ایک پلوامہ حملے کے جواب میں جب یہاں ہزاروں مسجدوں کو شہید کیا گیا تھا تو بہت سے دلوں میں اس سیاسی نفرت اور نظام کے خلاف غصے کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ نفرت کا حل نفرت نہیں ہے''۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''اسی لئے مجھے بلا لو نا..... دیکھو کم از کم مجھ سے نفرت مت کرو۔ میں تمہاری نفرت کو قبول نہیں کر سکتی..... مجھے بلا لو نا صدیقی!''

فون کٹ گیا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھی..... میرے اندر کے دھماکے رک گئے تھے۔ اب ایک دوسرا دھماکہ شروع ہو گیا تھا لیکن یہ دھماکہ پہلے والے دھماکوں سے زیادہ طاقت ور تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ سروج کو بلایا جا سکتا ہے؟ اس دہشت بھرے ماحول میں، نفرت بھری فضا میں؟ یعنی موجودہ دہشت کی ایسی فضا میں کیا یہ ممکن ہے؟

دو دن بعد سروج دوبارہ نیٹ پر آئی تو جیسے اس کے حوصلوں کو پر لگ چکے تھے۔ میری الجھنوں پر اس کا سیدھا سا جواب تھا۔ ''ہاں سب ممکن ہے''۔

''لیکن کیسے؟''

''9/11 ورلڈ ٹاور میں جو کچھ ہوا، کیا یہ ممکن تھا؟ تمہارے ملک میں سمندر کے راستے انتہا پسند آئے اور جان کی بازی لگا کر اپنے ناپاک ارادوں کا کھیل کھیل گئے۔ ان کی دہشت گردی اگر ممکن ہے تو ہم ایک پیار کے لئے اتنا کیوں سوچتے ہیں''۔

شاید وہ صحیح تھی، میں ہار گیا تھا۔ دہشت گرد اپنی جان پر کھیل کر انسانی بم بنا کر ایک دہشت بھری کارروائی کو انجام دے رہے ہیں۔ یوں چٹکیوں میں اور ہم..... پیار کی ایک چھوٹی سی ندی کو پار نہیں کر سکتے؟

''صدیقی سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا تم بھی مجھے اسی شدت سے پیار کرتے ہو جیسے.....''

''شاید اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ''۔ میں نے اس کی آواز درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ''پیار کوئی پیمانہ نہیں جہاں سکیل ڈال کر دیکھنے اور ناپنے کی گنجائش باقی ہو..... لیکن شاید نفرت کے اس شدید حملہ کے باوجود میں ایک لمحہ بھی تم سے دور نہیں رہا لیکن جہاں سارا ماحول ہمارے خلاف ہو۔ وہاں ہم یہ جنگ کیسے جیت سکتے ہیں؟''

''ویسی ہی ہمت سے جیسی ان دہشت پسندوں نے ایک ذلیل کارروائی کے لئے دکھائی..... اچھا بتاؤ۔ اگر ہم شادی کر لیں گے تو؟ کیا مجھے اپنے مذہب کو بھولنا ہوگا؟''

شاید اب تک مجھے پیار کی اس بے پناہ طاقت کا اندازہ نہیں تھا جہاں ایک مسلمان خاندان کے زیر سایہ ہوتے ہوئے بھی اچانک میں ایک ایسے راستے پر چل پڑا تھا۔ جہاں فرقہ واریت سے دور ایک عام سا انسان رہ گیا تھا..... ہاں عام انسان..... مٹھی بھر آسمان اور اپنے پیار کے لئے وقف..... ایک متوازن اور لبرل چہرے والا عام انسان۔

''نہیں..... پیار میں مذہب، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ جان..... مذہب پیار کے درمیان آئے تو پیار،

Pakistanipoint.com

پیار نہیں رہ جاتا''۔

''تسلی ہوئی..... ورنہ میں تو ہر روپ میں تمہاری تھی۔ تم جیسے چاہتے..... لیکن چاہتی یہی تھی۔ ہم اپنے رنگوں میں ایک دوسرے سے پیار کریں..... ایسا پیار جو نہ دیکھا گیا ہو..... نہ سنا گیا ہو''۔

کیم روشن تھا۔ آنکھیں روشن تھیں..... آواز جیسے سونامی لہروں جیسی موسیقی پیدا کر رہی تھی۔

''میں نے سب سوچ لیا ہے..... تم جانتے ہو نا..... محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے''۔

''ہاں''۔

''مجھے کل لڑکے والے دیکھنے آئے تھے، تمہیں بتایا تھا۔ میرا ایک بھائی آرمی میں ہے..... انہوں نے ہی یہ رشتہ لگایا تھا۔ دوسرا بھائی افغانستان میں ہندو تنظیموں سے جڑا ہے مجھ سے ایک سال چھوٹا۔ پتا بوڑھے ہو گئے ہیں۔ پوجا اور گیتا پڑھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ کل میں نے سب کی امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے صاف منع کر دیا کہ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔ اب گھر والوں کو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے، میں اسی لمحے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں''۔

''لیکن کیسے؟''

''وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ ہم ویڈیو کال پر شادی کریں گے۔ میرے جاننے والوں میں ایسی ایک شادی ہو چکی ہے''۔

''شادی؟ لیکن میں مسلمان ہوں''۔ میری آواز کانپ رہی تھی۔ ''تم جھوٹی شادی کا مطلب سمجھتی ہو؟ کیا ایک مسلمان کے ساتھ تمہارے گھر والے شادی پہ مان جائیں گے؟''

''شادی کے وقت تم اور تمہارا خاندان ہندو ہو گا..... ہندو ہو تم..... سمجھو میری بات صدیقی..... میں آنا چاہتی ہوں اور اس کے لئے اس بے رحم وقت سے بہتر کچھ بھی نہیں..... میں گھر والوں کو منا لوں گی..... یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں کہہ دوں گی کہ تمہارے گھر والے تمہاری شادی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑا..... سنو صدیقی.....''

بادل گرج رہے تھے، مزائل چھوٹ رہے تھے، دھماکے ہو رہے تھے، نیٹ بند تھا، آواز گم ہو گئی تھی۔ میں ایسے گہرے سناٹے میں تھا جس کے بارے میں شاید میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر شاید سروج ٹھیک کہتی ہے۔ انسانوں کے قتلِ عام کے لئے جب دہشت گرد اپنا حوصلہ جٹا سکتے ہیں تو ہم محبت کے لئے کیوں نہیں؟ یہ کوئی پریوں کی کہانی نہیں تھی لیکن سب کچھ جیسے پریوں کی کہانیوں جیسا ہی لگ رہا تھا۔ ہندوستان میں اتنی گھٹن اتنی بندشوں میں رہنے والی سروج دیوی جب ایسا دلیرانہ قدم صرف میرے لئے اٹھانے کو سوچ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟ ممکن ہے یہ سب کچھ بے حد غیر معمولی اور غیر ممکنات سے الگ دکھائی دے لیکن کبھی کبھی اصلیت شاید اس سے بھی زیادہ تلخ ہوتی ہے۔ اب میں حیران نہیں تھا۔ صرف نئی حکمت عملی پر اپنی طرف سے کارروائی کرنے کی دیر تھی۔ ایک دھوکا، ایک جھوٹی شادی لیکن ہم دونوں یہ اس محبت کے لئے کر رہے تھے جسے اس دہشت بھرے کہرے میں بچانا ہمارے لئے ضروری ہو گیا تھا۔

سروج نے اپنی طرف سے پورا ہوم ورک کر لیا تھا۔ اسے احساس تھا دونوں بھائی اس کی مخالفت میں کھڑے ہو جائیں گے۔ نہ ماتا جی اس حقیقت کو تسلیم کریں گی نہ پتا جی۔ اسے ٹھیک ویسی ہی بغاوت اپنے گھر میں انجام دینی ہو گی۔ جیسی تختہ پلٹ بغاوتوں کی کہانیاں اس نے سن رکھی ہیں۔ اس لئے کہ اسے جموں کشمیر پہنچنا ہے۔ اور ظاہر ہے، حسن صدیقی! ایک مسلمان نام سننا اس کے گھر والے کسی بھی صورت میں

برداشت نہیں کریں گے۔ اس لئے صدیقی یا اس کے گھر والوں کو ہندو بن کر ہی ملنا ہوگا۔

اس واقعے کے ٹھیک تیسرے دن اس نے نیٹ پر اطلاع دی۔

''خوش ہو جاؤ، میں نے مورچہ جیت لیا ہے''۔ اس نے تفصیل سے بتایا۔ ''پہلے دونوں بھائی اور ماتا اور پتا جی محبت کی بات سے ہی بھڑک گئے۔ پھر جب یہ سنا کہ تم ہندو ہو اور جموں میں رہتے ہو تو پتا کا لہجہ ذرا نرم پڑ گیا۔ ان کا بچپن کشمیر میں ہی گزرا تھا۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے کہ میں نے یہ مورچہ کیسے فتح کیا لیکن میرے گھر والے راضی ہو گئے ہیں۔ میں نے بتا دیا ہے کہ تمہارا نام جگدیش ہے اور گھر والے تمہاری شادی جلد کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے پتا کی طبیعت خراب رہتی ہے، اس لئے وہ ہندوستان نہیں آ سکتے اور اس سے پہلے کہ گھر والے جگدیش چندر کی شادی کہیں اور کر دیں۔ ہم نیٹ پر ہی اپنے انگیزیمنٹ کی منظوری دیں گے اور جگدیش یہ بات مان گیا ہے''۔

سروج نے آگے بتایا۔ ''میرے پتا تمہارے پتا سے بات کرنا چاہتے ہیں تاکہ شادی کی رسم پوری کی جا سکے''۔

میں شاید اندر تک لرز گیا تھا۔ زندگی کے اس بے حد اہم موڑ پر اچانک دنیا کے نظارے بدلے تھے، میرے لئے..... شاید محبت کی شدت آپ سے آپ کو چھین لیتی ہے۔ پھر جیسے آنکھوں کے آگے کی پرچھائیوں میں صرف جلتے ہوئے قمقمے رہ جاتے ہیں۔ حیرانیوں کا ایک وائٹ ہاؤس ہوتا ہے جس کے ہر دروازے پر محبت کی ایک بڑی سی مورت ہوتی ہے لیکن اب یہ مورت جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی تھی۔ ایک جھوٹ سے نکلنے والا دوسرا جھوٹ جیسے جھوٹ ان دنوں ہندوستان دنیا سے بول رہا ہے۔

بابو جی کے الفاظ میں۔ ''جنگ ہی اکیلا راستہ ہے''۔ اور یہاں ہمارے لئے شاید محبت ہی اکیلا راستہ تھا۔

سروج اپنے جھوٹ کے مہرے چل چکی تھی اور اب جھوٹ کا یہ پانسہ مجھے پھینکنا تھا۔

آزادئ وطن کے لئے اہل پاکستان نے اپنے دل و دماغ، اپنی کشمیری ماؤں، بہنوں، بھائیوں اور بچوں کے جذبوں، ان کی اُمنگوں، خوابوں اور آرزوؤں سے ہم آہنگ کیے عالمی ضمیر سے صرف یہ سوال کیا کہ کشمیر کو انصاف دو کہ کشمیر تمہارے ہاتھ سے نکل چکا۔ اب کوئی طاقت، کوئی خود ساختہ قانون، کرفیو اور جبر و بربریت اس وادی کو غلام نہیں رکھ سکے گی۔ ظلم کی رات ڈھلنے والی ہے، کشمیریوں کی آزادی کی صبح طلوع ہو کر رہے گی۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ ماں اور بابو جی سے دفتر سے نکلتے ہوئے میں اپنی بات بتا چکا تھا کہ آج آپ دونوں سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ شاید وہ اس ضروری بات کا مطلب وہ سمجھ چکے تھے۔ سردی میں ان کے چہرے پہ اس بے حد ضروری بات کی تپش کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میرے اندر کمرے میں داخل ہونے تک جیسے وہ خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''کسی کی زندگی بچانے کے لئے اگر جھوٹ کا سہارا لیا جائے تو مان لیجئے کوئی شخص ایک گھٹن بھرے قید خانے میں ہے۔ آپ اسے باہر نکالنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور اسے زندگی مل جاتی ہے؟''

ماں، باؤ جی پُراسرار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے''۔

ممکن ہے، اچانک یہ جملہ ماں اور باؤ جی کے

لئے کسی دھماکے کا کام کرتا لیکن وہ ابھی بھی غور سے میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ماں بولی۔ ''اچھی بات ہے''۔

باؤ جی بولے۔ ''میں ریٹائر ہو چکا ہوں، ہم دونوں تمہارے ہی بھروسے سے ہیں۔ محبت میں جھوٹ کی شادی، میں نہیں جانتا۔ یہ سن کر بھی نہیں کہ وہ لڑکی ایک ہندو ہے؟'' اب چونکنے کی باری ماں کی تھی۔

''ہندو اور ہندوستانی بھی..... لیکن اگر یہ نہیں ہوا تو میں بھی نہیں رکوں گا''۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بابو جی کے الفاظ نے مجھے روک لیا۔

''بیٹھو''۔ ان کی آنکھیں کشمکش یا الجھن کا احساس کرا رہی تھیں''۔ کیسے ملاقات ہوئی؟'' میں نے بتا دیا۔

''دیکھا ہے؟''

''ہاں''۔

''فون پہ بات ہوئی ہے؟''

''ہاں''۔

''تم اسے مسلمان بناؤ گے؟''

''نہیں''۔

ماں کا چہرہ سناٹے میں ڈوبا تھا۔

''میرا تعلق ہندوؤں سے رہا ہے''۔ باؤ جی نے کہا۔ ''جانتے ہو، عمر کے اس پائیدان پہ بھی ان کے خوشی اور غم میں آتا جاتا رہا ہوں لیکن وہ بھی جانتے ہیں کہ بچے اپنا مستقبل خود چنتے ہیں۔ حالات اچھے نہیں، تم بھی دیکھ رہے ہو۔ دونوں طرف جنگ کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ ایسے میں شادی کا بندھن؟ چلو مان لیا میں تیار ہو جاتا ہوں لیکن وہ لوگ؟ میں قریب سے جانتا ہوں، ان ہندوستانیوں کو''۔ بابو جی نے آنکھوں پہ ڈھیلے ہو رہے چشمے کو ٹھیک کیا۔ ''میرا بچپن ہندوستان میں ہی گزرا، دنگے پھیلے، لٹے لٹائے ہم جموں آ گئے۔ آج بھی اردو اخبار پڑھ لیتا ہوں..... ہم ہندوؤں کے محلے میں تھے''۔ شاید وہ پرانی یادوں میں گم تھے۔ چشمہ اتارا آنکھیں صاف کیں۔ ''وہ کسی مسلمان کو برداشت نہیں کریں گے''۔

''جانتا ہوں''۔

''پھر؟'' اس بار چونکنے کی باری ماں کی تھی۔

''سروج کا یہاں کوئی بھی نہیں رہتا''۔

''سروج!'' بابو جی دھیرے سے بڑبڑائے۔

اگر کوئی اور ہوتا تو یہ کسی بھی جھوٹ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

''ہم جانتے ہیں، حالات خراب ہیں۔ شاید حالات اور بدتر ہوتے چلے جائیں۔ ہم سب ٹھیک کر لیں گے لیکن اس کے لئے صرف ایک راستہ ہے کہ سروج جموں آ جائے''۔

''یہ کیسے ہوگا؟''

''ہم نیٹ پہ ایگریمنٹ کریں گے''۔

''ایگریمنٹ؟ پاگل ہو..... ایگریمنٹ کا مطلب سمجھتے ہو؟ ایگریمنٹ کا مطلب، معاہدہ..... میل ملاپ۔ تم اپنے دین سے دھوکہ کرو گے، ہندو بنو گے؟ ہندنی سے شادی تو تبھی ہو سکتی ہے جب تم ہندو بن جاؤ''۔

وہ شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی ہندوستانی چال تو نہیں۔

''کیونکہ ایگریمنٹ کے بغیر سروج جموں کشمیر نہیں آ سکتی''۔ میری آواز کمزور تھی۔ ''ہاں ایک بار، وہ ہمارے ہاں آ جائے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' باؤ جی اب بھی مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔

''ہم تندولکر خاندان کے ہیں۔ میں جگدیش..... آپ سریش اور ماں شیلا دیوی''۔

''تم شیلا ہو سمجھی''۔ باؤ جی ماں سے بول رہے

Paksociety.com

تھے۔ ''بچپن میں پڑوس میں ایک لڑکی تھی شیلا..... میرے ساتھ کھیلتی تھی، سپنے کتنی دور نکل گئے''۔

ان کا لہجہ ایک بار پھر بجھ گیا تھا۔ ماں باپ بڑے بچوں کے لئے صرف ایک کٹھ پتلی ہوتے ہیں جنہیں ان کے پڑھے لکھے نوکری کرنے والے بچے نچاتے ہیں۔ اپنے کمرے میں آنے تک میں پریشان تھا۔ شاید سب کچھ اتنی جلدی ہو جانے کی امید نہیں تھی لیکن ابھی کئی امتحانات باقی تھے۔ شادی پنڈت یعنی ایک جھوٹی شادی کو سچ بنانا..... کون ہندو اس کے لئے تیار ہو گا؟ دوسرے دن صبح بابو جی نے اپنے دو پرانے ہندو دوستوں کو بلا لیا تھا۔ میں نے چھٹی لے لی تھی۔ جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں موت جیسا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید باؤ جی للت کمار (جو پڑوس ہی میں رہتے تھے اور صبح بابو جی کے ساتھ مورننگ واک پر نکلتے تھے) اور پنڈت انل کمار دونوں سے اس نازک موضوع پر بات کر چکے تھے۔ پنڈت انل کمار کی باؤ جی نے کچھ بے حد دشوار کن لمحات میں مدد کی تھی لیکن اس وقت دونوں کے چہروں سے ناراضی ظاہر ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ، دونوں کے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی، کرتہ پائجامہ میں پاس بیٹھ گیا۔

''مذہب بچوں کا کھیل نہیں''۔ انل کمار نے جیسے بغاوت کر دی تھی۔ ''وہ لڑکی اگر پاگل ہے اور ہندو مذہب سے بے دخل ہونا چاہتی ہے تو کیا تمہارا بھی لڑکا.....؟''

''میاں جوانی کے جوش ہیں دو دن میں بجھ جاتے ہیں''۔ پنڈت للت کمار آہستہ آہستہ سے بولے۔ ''تمہاری دوستی میں آ گئے لیکن جھوٹی شادی؟ رام رام یہ ممکن نہیں۔ ویسے بھی نیٹ پر شادی جائز نہیں ہے، یہ بس چند مجبوریوں کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی شادی بغیر پنڈت کے جائز نہیں''۔

''برخوردار ہندو بن جائیں پھر کوئی قباحت نہیں''۔ انل کمار نے کہا۔ ''ویسے بھی یہ آج کل عام ہو گیا ہے شادی کے لئے پریشانی آئے تو غیر مسلم ہو جاؤ''۔

گفتگو چل رہی تھی، سارے تیر میرے خلاف جا رہے تھے۔ میں جیسے یکا یک گہرے سناٹے میں آ گیا تھا جس امتحان کی گھڑی کو آسان مان کر چل رہا تھا، وہ اس قدر الجھی ہوئی اور بھیانک ہو سکتی ہے۔ شاید یہ سوچ پانا بھی میرے لئے ممکن نہیں تھا مگر ایسا ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا یکا یک سروج کا وجود میرے اندر سے گم ہونے لگا ہو۔ سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ پھر اچانک جانے کیا ہوا۔

''جھوٹ کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتا''۔ میں زور زور سے بول رہا تھا۔ ''آپ بڑے لوگ ہیں، ہم تو بچے ہیں لیکن اتنا جانتا ہوں۔ جو جھوٹ کسی کو بچانے کے لئے بولا جائے، وہ جھوٹ، جھوٹ نہیں ہوتا۔ یہاں بھی دو زندگیاں داؤ پر لگی ہیں اور دوسری طرف آپ کا مذہب ہے۔ مجھے پیار گوارہ ہے تو ہندو بن جانا بھی گوارہ ہے لیکن سروج نہیں چاہتی جیسے میں نہیں چاہتا کہ سروج میرے گھر آ کر اپنا مذہب چھوڑ کر میرے مذہب کو ماننے لگے۔ دو مذہب کے لوگ اگر ایک دوسرے کو چاہنے والے ہیں تو اپنے اپنے مذہبوں کے ساتھ ایک چھت کے نیچے کیوں نہیں رہ سکتے؟ اس دنیا میں جب قتل و غارت کے لئے ہزاروں تسلیاں یا فتوے مل جاتے ہیں تو دو پیار کرنے والوں کو ایک جھوٹ کا سہارا کیوں نہیں مل سکتا؟ کشمیر پر قبضے سے لے کر ہزاروں واقعات ایسے ہیں جہاں لاشوں کی تجارت ہوئی ہے اور آپ کے یہاں..... آر ایس ایس کے لوگ۔ نریندر مودی جیسے لوگ جو مذہب کے نام پر معصوم جانوں کا قتل کر رہے ہیں یہ سب جائز ہے تو پیار کا ایک

جھوٹ جائز کیوں نہیں؟'' میں چلایا تھا۔ ''وہ وہاں مر جائے گی اور میں یہاں، کیا یہ آپ دونوں کے مذہب کے لئے فخر کی بات ہوگی؟ یا وہ جھوٹ جو وہ زندگیوں کو بچالے؟'' شاید میں رو رہا تھا، کچھ عجیب سے احساس رہے ہوں گے میں زیادہ دیر تک کمرے میں ٹھہر نہیں سکا۔ میرے جانے کے فوراً بعد ہی دونوں پنڈت صاحبان بھی اپنے گھر چلے گئے تھے۔ میں گہرے سناٹے میں تھا۔ اس کے باوجود پُرامید اندر جل پریوں کی طرح رقص کرتی سروج موجود تھی۔ جو کہہ رہی تھی گھبراؤ مت، ڈرتے کیوں ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

رات کو انل کمار اکیلے واپس آ گئے وہ کئی جگہ بالخصوص گاؤں کی شادیوں میں پنڈت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ چائے پیتے ہوئے انہوں نے بابو جی کو اپنے دل کی بات بتادی۔

''رازداری ضروری ہے''۔ انہوں نے کہا۔ ''اب تو جیسے ہونٹوں پر ہندوستان کا نام لینا بھی ملک سے غداری جیسا ہوگیا ہے۔ میاں! بیٹے کی باتوں میں وزن تھا۔ آپ تیاری کرو لیکن یہ فیصلہ دل پر پتھر رکھ کر کیا ہے۔ بھگوان معاف کرے اگر اس جھوٹ سے دو زندگیاں بچ سکتی ہیں تو پھر یہ جائز ہے''۔

وہ بابو جی کی آنکھوں میں جھانک رہیت تھے۔ ''شاید تم یہ بھی جان جاؤ کہ ایک انسان کی زندگی بچانے کا معاملہ سامنے آتا ہے تو ہندو پیچھے نہیں ہٹتا۔ وحشیوں نے ہندو مذہب کو درندوں کا مذہب بنا دیا ہے''۔

جاتے ہوئے وہ ٹھہر کر بولے۔ ''میں منڈپ میں آگ کے پھیرے لگوا دوں گا۔ دو گواہوں کی ضرورت پڑے گی۔ ایک پنڈت للت کمار ہو جائیں گے۔ دوسرا میں اپنے چھوٹے بھائی کو تیار کرلوں گا''۔

ایک وزنی پتھر میرے وجود سے اتر گیا تھا۔ اس رات دیر تک بابو جی میرے پاس بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ چلو، تم خوش ہو، شاید اسی میں ہماری خوشی ہے لیکن تم نہیں جانتے ان ہندوؤں کو..... قریب سے دیکھا ہے میں نے ان لوگوں کو..... یہ آج بھی اسی بدھ مت دور میں جیتے ہیں۔ ان کے لئے سب کچھ ان کا مذہب ہے تو پھر ہمارے لئے ہمارا اسلام کیوں نہیں؟ وہ اپنا ہندوستان لے چکے، ان کی نفرتوں سے پنجاب خالصتان بننے جا رہا ہے۔ یہ اپنے بھائیوں کے بھی نہیں ہوتے۔ پھر مسلمان کیوں شرماتا ہے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے میں؟ ایک اجمل قصاب کا موضوع پچھلے کئی دنوں تک بار بار اٹھتا رہا اور کشمیر اور پاکستان میں جو ہزاروں مسجدیں شہید کردی گئیں وہاں؟

دراصل یہاں بھی وہ ہندو کی حکومت چاہتے ہیں یا وہ یہاں بھی فاشٹ حکومت کا خواب دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مذہب میں لکھا ہے۔ مسلمانوں کی نسل کشی کرو، یہ دہشت گرد آر ایس ایس کی ہی شکل ہیں جسے وہ کبھی کم نہیں کریں گے''۔

ایک باب کھو گیا تھا۔ ہندو کا سانپ مذہبی چولے سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ میں ڈر رہا تھا یا شاید حیران ہو رہا تھا۔ ہم جھوٹ سے الگ نہیں ہوتے جھوٹ ہمارے ساتھ چلتا ہے۔ ہم اپنی خوشیوں کے لئے بار بار جھوٹ بولتے ہیں لیکن جھوٹ اپنی زہریلی زبان دکھا کر ہمیں ڈراتا بھی رہتا ہے۔

یہ وہی دور تھا جب برہان مظفر وانی کی شہادت کے بعد پاک و ہند کی سیاست گرما چکی تھی اور ادھر امریکہ ایٹمی دھماکوں سے آزاد دنیا کا اعلان کرنے والے ہیرو اوبامہ کے ساتھ ایک نئی تاریخ کا گواہ بننے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہائٹ ہاؤس کے 132 کمروں والے محل میں جسے کبھی 18 ویں صدی کے کالے غلاموں نے مل کر بنایا تھا۔ پہلی بار ایک حبشی صدر کے ذریعہ اس محل میں جا کر نئے خوابوں کو پورا کرنے کا

وقت آ گیا تھا۔ یہ خوابوں کو سچ کرنے کا وقت تھا۔ شاید اسی لئے ایک نئے خواب کی بنیادیں بھی رکھ چکا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی میں نے سروج کو اپنی کامیابی کی خبر دے دی۔ جاوید صدیقی یعنی سریش تندولکر سے تقریباً 2 بجے سروج کے والدین کی ایک رسمی بات چیت ہوگئی اور آئندہ جمعرات رات 8 بجے نیٹ پر شادی کا وقت مقرر کر دیا گیا۔

جیسا میں نے شروع میں بتایا ہے، میرے لئے سب کچھ کسی پریوں کی کہانی جیسا تھا۔ کالے دیو کے چنگل میں قید پری، شہزادہ جنگل جنگل بھٹکتا ہوا ہزاروں طلسم سے گزرتا آخرکار شہزادی کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے لیکن شاید میں بھول گیا تھا۔ پریوں کے کرشمے یا معمولی سی عام زندگی کے کرشمے یا قدرت کے سامنے بالکل پھیکے ہیں۔ شاید میرا اصل پیچ اب شروع ہوا تھا۔

جمعرات شام ساڑھے سات بجے ہی پنڈت انل کمار، پنڈت للت کمار اور انل کمار کے چھوٹے بھائی آ گئے۔ ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل چکا تھا۔

صوفے کنارے کر دیئے تھے۔ قالین پر سفید چادر بچھ گئی تھی۔ گاؤ تکیے لگ گئے تھے۔ اس کے درمیان ہندوستان، سروج کے والدین سے دو تین بار بات ہو چکی تھی۔ مجھے ایک اشتہار یاد آ رہا تھا۔

جہاں ایک موبائل سے گاؤں دیہات کے سادہ سے بچے پڑھ رہے تھے اور یہاں یہی موبائل، جھوٹ سہی، سرحد کی دیواریں توڑ کر دو رشتوں کو ایک بندھن میں باندھنے جا رہا تھا۔ آٹھ بج گئے، موبائل آن تھا تاکہ ایگریمنٹ کی تحریر اور میرے دستخط کو وہاں دیکھا جا سکے اور لڑکی کے قبول نامے کے لفظ یہاں سب کو دکھائی دے سکیں۔ میں نے اپنے دوست محمد احمد کو اس رازداری بھرے جھوٹ میں شامل کیا تھا کہ وہ اپنے موبائل سے اس موقع کی تصویر لے لے تاکہ اسے ثبوت بنا کر سروج کے گھر والوں کو کشمیر آنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ بابو جی سفید کرتے پائجامے میں تھے۔ سر پر ٹوپی۔ باہر کا دروازہ بند تھا۔ اس حلیے میں پہلی بار دیکھ کر عجیب سا لگا تھا۔ بابو جی جاوید صدیقی نہیں، مندر میں پوجا پاٹ والے پنڈت صاحب لگ رہے تھے۔ لباس نے مذہب کا فرق مٹا دیا تھا۔

آٹھ بج گئے، انل کمار نے گیتا کے الفاظ پڑھنے شروع کئے، کمرے کا سناٹا، ایک بھیانک خاموشی، آواز گونج رہی تھی... محمد احمد...... بابو جی، پنڈت للت کمار، انل کمار کے چھوٹے بھائی...... اور پردے سے جھانکتی ماں، میرے لئے ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ماں پہ کیا گزر رہی ہوگی لیکن شاید ایک جھوٹ کو پیٹتے ہوئے بھی سچ کا احساس ہوتا ہے۔ نیٹ پر سروج کے رونے کی آواز سن رہا تھا۔ اُف میں، بھیانک سناٹے میں تھا۔ جھوٹ اب صرف ایک سچ تھا۔ ہمارے ملک ہمارے خون سے گزر رہا تھا...... وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی۔

نیٹ پر پنڈت کی آواز ابھر رہی تھی۔ سروج آگ پر پھیرے لگا رہی تھی۔

"آپ کی شادی جاوید تندولکر یا سریش تندولکر کے ساتھ دو لاکھ روپے، سکہ رائج الوقت دو معزز گواہوں کی موجودگی میں ..... آپ نے قبول کیا۔ رونے کی آواز کے درمیان سروج کی آواز ابھری۔

"ہاں، قبول کیا"۔ پنڈت کے 3 بار سروج سے قبول نامے کے بعد اب میری باری تھی۔

میری آنکھیں بند تھیں، اب شاید یہ جھوٹ نہیں رہا تھا قبول کرنے کے ساتھ ہی وہ میری زندگی میں آ گئی تھی۔ اس کے رونے کی آوازیں ابھی بھی ٹھہر ٹھہر کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

ممکن ہے دوسروں کے لئے یہ جھوٹ ہو یا ناٹک لیکن ہمارے لئے زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا اور یہ

Pakistanipoint.com

بھی سچ تھا۔ اب وہ مکمل طور پر میری زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ دوسرے دن میں نے شادی کی فلم سروج کو میل کر دی۔ سروج کا فون آیا تھا۔ وہ چہک رہی تھی۔

''مسز صدیقی بول رہی ہوں۔ اُف..... پکے ہندوستانی لگ رہے تھے تم..... ارے اب تو میں تمہاری بیوی ہوں لیکن مسٹر ابھی اتنا بے صبرا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات خراب ہیں۔ بڑے بھائی کشمیر آنے کی اجازت لے رہے ہیں۔ میں ماتا جی اور اجے شری رام آئیں گے۔ اجے شری رام میرا چھوٹا بھائی ہے۔ پتا جی کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ اس لئے وہ نہیں آ پائیں گے۔ گھبرانا مت، ایمرجنسی ٹکٹ مل جائے گی ہم آ جائیں گے''۔

اور اس کے ٹھیک سات دنوں بعد اس نے خوش خبری دی۔ ''ٹکٹ مل گئی ہے۔ اجازت سات دونوں کی ملی ہے لیکن ابھی ہم چار دنوں میں لوٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس صرف چار دن ہوں گے اور یہ چار دن تمہیں سنبھالنے ہیں''۔

زندگی، ناٹک یا ڈرامے سے کہیں زیادہ ایک کڑوی سچائی ہے۔ ہم زندگی میں ایک معمولی سا بھی قدم اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو جیسے ایک ناٹک اپنے بھیانک روپ میں ہمیں نئی صورت حال سے آگاہ کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک ہم کامیاب رہے تھے لیکن اب راستے پریشان کن اور الجھے تھے۔ کشمیر آئے ہوئے ہندوستانی ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے۔ بے حد ایمرجنسی حالت میں ہی آنا ممکن تھا۔ پھر اس فارمیلٹی کو پورا کرنے کے لئے پولیس ویری فیکشن لیکن یہاں بھی ہمارے پڑوسی پنڈت للت کمار نے مدد کی تھی۔ سروج کے بھائی نے دوڑ بھاگ کر ٹکٹ حاصل کر لیا تھا اور اب وہ آ رہے تھے۔ پولیس انکوائری میں پنڈت للت کمار نے ساتھ دیا تھا کہ سریش تندولکر ہمارے کرائے دار ہیں اور اچھے آدمی ہیں۔

ایک بلا ٹل گئی تھی لیکن اصل امتحان ابھی باقی تھا۔ سروج کو اجے شری رام سے خطرہ تھا جس کے بارے میں اس کا شک تھا کہ وہ آر ایس ایس جیسی دہشت پسند تنظیم سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے اس شک کی کچھ بنیاد بھی رہی ہو گی لیکن اب تک کی ساری مہم اتنی کامیابی سے انجام پائے گی۔ میں نے سوچا نہیں تھا۔ سروج کے پاس صرف چار دن ہوں گے ان چار دنوں کو زندگی بھر کا ساتھ بنانا تھا۔

اصل زندگی کا جوا اب شروع ہوا تھا۔ کتنے ہی خیالات آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ وہ معافی مانگ لے گا۔ گڑگڑا کر اپنی محبت کی بھیک مانگے گا۔

لیکن وہ ایک جھوٹ کو کیوں تسلیم کریں گے؟ اگر وہ سروج کو ساتھ لے کر چلے گئے تو کیا ان حالات میں اس کا ہندوستان جا کر سروج کو لانا ناممکن ہے؟ شاید نہیں، صرف ایک ہلکی سی امید کہ پیار جیت جائے۔ جیسے پنڈت للت کمار یا انل کمار نے اس پیار کی عظمت کو دہشت گردانہ کارروائیوں پر ترجیح دی۔ شاید سروج کی ماتا جی کا دل بھی پسیج جائے۔

لیکن ابھی سب سے بڑی الجھن تھی۔ ان چار دنوں میں اس کے گھر والوں کا ہندوؤں کی طرح رہنا اور تواضع کرنا کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟ لیکن یہ ممکن کرنا پڑے گا۔ قدم قدم پر احتیاط برتنی ہو گی۔ ذرا بھی لاپروائی اور خطرہ سامنے اور خطرہ بھی ایسا کہ ان نازک اور سیاسی حالات میں معاملات کے بے حد بگڑ جانے کا خطرہ بھی سامنے تھا۔

ایک مسلم گھر کو ہندو گھر بنانے کا کام جاری تھا۔ دیوار پر ٹنگے اسلامی کیلنڈر چھپا دیئے گئے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے کیلنڈر دیواروں پر جگہ جگہ لگا دیئے گئے۔ قرآن پاک اور نماز پڑھنی بند کر دی گئی۔ باؤ جی تو سفید

کرتا پائجامہ پہن کر ہندو بن جائیں گے اور ماں؟ مشکل ماں کی تھی۔ ماں سر سے دوپٹہ اور تعویذ اتارنے کو راضی نہیں تھی۔

''مر جاؤں گی لیکن نہیں اتاروں گی''۔ ماں نے اعلان کر دیا۔

لیکن بابو جی کے سمجھانے پر ماں، شیلا دیوی بن گئی تھی۔ شلوار جمپر..... سر پر آنچل ڈالے اپنے گھر میں ہو کر بھی، جیسے ہم کسی اجنبی گھر میں تھے۔ کہاں سے مسلمان تھے ہم؟ گھر کی دیواروں سے لے کر پہناوے تک، کہاں ہیں ہم؟ بس لباس پا پہناوے کی حد تک؟ لیکن ایک مشکل اور تھی، گھر میں حرام گوشت نہیں کھایا جاتا تھا۔

بابو جی اور ماں اس کی بُو تک سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ ذمہ داری پنڈت للت کمار نے قبول کر لی تھی کہ میرے گھر سے آ جائے گا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا، جاوید صدیقی بابو کے یہاں ان کے بچپن کے ہندوستانی دوست آ رہے ہیں۔

''اس ماحول میں؟'' ممکن ہے ان سے پوچھا گیا ہو لیکن جواب آسان تھا۔ دوست تو کسی بھی ماحول میں آ سکتے ہیں۔ دشمن تھوڑے ہی آ رہے ہیں۔

''ہماری طرف سے ساری تیاری مکمل تھی لیکن احتیاط برتنے کے باوجود بھی خطرے کا پہلا سائرن اس وقت بجا جب گاڑی گھر کے دروازے پر داخل ہوئی۔ دروازے میں جاوید صدیقی کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ اس نیم پلیٹ کے بارے میں ہم نے اس سے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ مگر حادثہ ہو چکا تھا۔ چھ بجے صبح یہ دہلی بس سے چلے تھے اور شام چھ بجے بس انہیں کشمیر گیٹ چھوڑ گئی تھی۔ میں گاڑی لے کر پہلے ہی ان کے استقبال کے لئے کھڑا تھا مگر سروج کو چھوڑ کر ماتا جی، اجے شری رام دونوں میں کہیں وہ گرم جوشی نہیں تھی۔ شاید میں جس کی امید کر رہا تھا، گاڑی چلاتے ہوئے میں نے سروج کی طرف دیکھا وہاں قندیل کی طرح روشن مسکراہٹ کے ساتھ ایک گھبراہٹ بھی چھپی تھی۔ گاڑی کے باہر پہنچنے تک سناٹا ہی رہا۔ کسی نے کوئی بھی ذکر چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب گاڑی چرمرا کر گھر کے دروازے پر رک گئی تھی۔

''جاوید صدیقی''۔ اجے شری رام کے چونکنے کی باری تھی۔ مجھے دن میں آسمان کے تارے نظر آ گئے۔

''یہ انہی کا فلیٹ ہے ہم کرائے میں رہ رہے ہیں''۔

اوہ، سروج کے بے حد پیارے معصوم چہرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ماتا جی غور سے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''اپنا مکان نہیں ہے؟''

''ہو جائے گا، جلد ہی''۔

گاڑی رکنے کی آواز کے ساتھ ماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اجے شری رام، بابو جی کے گلے ملا۔ علیک سلیک ہونے کے بعد یہ لوگ صوفے پر بیٹھ گئے۔ دیوی دیوتاؤں کے کیلنڈر دیکھتے رہے۔ پہلے ناشتہ یا چائے یا آپ لوگ فریش ہونا پسند کریں گے؟ سروج کی ماں کے چہرے پر ناراضی کے آثار اب بھی برقرار تھے۔ جیسے اس شادی میں ان کی رضامندی شامل نہیں ہو۔

''دونوں بھائی بہت پیار کرتے ہیں، اس سے ورنہ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا''۔

سروج سہمی ہوئی تھی۔

''یہاں تو ہندوؤں پر بہت ظلم ہوتا ہے''۔ اجے شری رام پوچھ رہا تھا۔ ''آپ لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں اتنا ظلم؟'' بابو جی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ میں نے روک دیا۔

''ظلم تو نہیں ہوتا''۔ میں نے کہا۔

''نہیں ہوتا؟ کشمیر میں آئے دن ہلاکتیں، ظلم اور

کیا ہوتا ہے؟'' وہ آر ایس ایس کی زبان بول رہا تھا۔ بابو جی خود کو روک نہیں پائے۔

''آپس میں لڑائی تو ساری دنیا میں چلتی ہے۔ کشمیر میں انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیاں ہوئیں تو اخبار سے میڈیا تک سب نے خوب خبر لی۔ سول آبادی پر بھارت کی اشتعال انگیز کارروائیاں اب بھی جاری ہیں''۔

''وہی، آپ لوگ شاید ایک خاص طرح کی سنسر شپ میں جیتے ہیں۔ اس ملک کے خلاف بولنے کی آزادی نہیں''۔

''ایسا نہیں ہے''۔

ٹھیک یہی وقت تھا جب پاس کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی پڑی۔

سروج کی ماتا جی چونک پڑیں۔ یہاں پاس میں مسجد ہے؟ اجے شری رام نے پوچھا۔ آپ مسجد کے سائے میں رہتے ہیں؟ کشمیر مسجدوں اور مندروں کا شہر ہے۔ قدم قدم پر مسجد۔ بابو جی بولتے بولتے رہ گئے۔ میں بابو جی کی بے بسی اور لاچاری سمجھ رہا تھا۔ ماں چپ تھی۔ نظریں بچا بچا کر وہ سہمی ہوئی سروج کو دیکھ رہی تھی۔

''مندر میں پوجا پاٹ کا وقت ہو گیا ہے۔ یہاں پاس میں کوئی مندر ہے؟'' اجے شری رام کے اس اچانک سوال سے ہم جیسے سناٹے میں آ گئے تھے۔

''نہیں ہے''۔ میرا لہجہ ذرا ڈرا ڈرا سا تھا۔

''کوئی بات نہیں گھر میں پوجا پاٹ کر لیں گے۔ مورتی کدھر ہے؟'' سروج کی ماتا، ماں سے پوچھ رہی تھی۔ ہمارے دل ڈوب سے گئے تھے۔ ماں چپ تھی، ہونٹوں پر تالا۔ اس نئی مصیبت کے بارے میں تو ہم نے غور بھی نہیں کیا تھا۔ اجے شری رام کی آنکھوں میں شک کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

''آپ لوگ پوجا پاٹ نہیں کرتے کیا؟'' سروج کی ماتا کہہ رہی تھیں۔ وہاں سناٹا تھا''۔ کشمیر کے لوگ غیر مذہبی ہوتے جا رہے ہیں۔ پوجا اور گیتا سے کوئی مطلب ہی نہیں''۔ ناراضگی اب آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھی۔ ''ہم اشنان کریں گے پھر پوجا پاٹ پھر گیت پڑھیں گے۔ گیتا تو گھر میں ہو گی ہی۔ وہ ماں سے پوچھ رہی تھی۔ غسل خانہ کہاں ہے۔ بھگوان کا بت کہاں ہے۔ پوجا پاٹ کے بعد ہی ہم ناشتہ کریں گے، پھر باتیں کریں گے''۔

اجے شری رام، سروج اور ماتا جی کو ان کا کمرہ دکھایا گیا تھا۔ باہر ہم تینوں سکتے میں ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوئے بھی گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔

وہ بھیانک رات گزر گئی۔ پنڈت للت کمار کے گھر سے مورتی اور گیتا ان کا چھوٹا بیٹا لے آیا تھا اور یہ بات اجے شری رام اور امی جان پر ظاہر ہو گئی تھی۔ رات کھانے کے بعد سروج کی ماتا نے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''بیٹ پر ایجاپ و قبول کو ہم صرف ایک رسم مانتے ہیں۔ یہاں آ کر آپ کا گھر گھرانہ اور ماحول دیکھنا تھا۔ بنگلہ دیش کو ہندوستان آنا ہوگا۔ تبھی ہم سروج کی رخصتی کر سکیں گے''۔

رات جیسے کمرے میں ڈھیر ساری چمگادڑیں جمع ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا سروج کی ماتا اور اجے شری رام گھر کا ماحول دیکھ کر خوش نہیں تھے۔ جیسے جبرا بیٹی کی ضد میں کشمیر تو آ گئے لیکن اب اس آنے پر افسوس ہو رہا ہو۔ اجے شری رام بار بار پاک بھارت دشمنی کے تذکرے لے کر بیٹھ جاتا یا پھر کشمیر کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ بابو جی کے لئے یہ سب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا لیکن وہ برداشت کئے ہوئے تھے۔

Pakistanipoint.com

رات کسی طرح کٹ گئی لیکن صبح یعنی دن کا وقت دھماکے جیسا تھا۔ ماں نے علی الصباح نظریں بچا کر جائے نماز والا کمرہ کھول دیا تھا۔ وہ اپنی عبادت میں مصروف تھی کہ اچانک چونک گئی۔ دروازے پر لال لال آنکھیں لئے اجے شری رام اور سروج کی ماتا جی کھڑے تھے۔

''تو ہمیں بے وقوف بنایا گیا۔ آپ لوگ ہندو نہیں مسلمان ہیں''۔ پھر جیسے ایک کے بعد دوسرے دھماکے ہوتے چلے گئے۔ ڈرائنگ روم میں سب اس وقت ایسے بیٹھے تھے جیسے کسی کی میت میں آئے ہوں۔ ایک طرف دونوں گھر والے تھے۔ دوسری طرف سر جھکائے پنڈت للت کمار۔

''دھوکا!'' اجے شری رام کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ''اتنا بڑا دھوکا..... مجھے کل ہی شک ہو گیا تھا لیکن جھوٹی شادی؟ ہندو مذہب کی بے حرمتی ہم گوارہ نہیں کریں گے''۔

سروج کی آنکھیں روتے روتے پھول گئی تھیں۔

''ہم پولیس میں جائیں گے، ایف آئی آر درج کرائیں گے۔ دھوکے بازوں کا خط ہے یہ۔ اتنا بڑا دھوکہ میرے لئے یہ بات موت سے زیادہ بھیانک ہے کہ میں ایک مسلمان کے یہاں ہوں۔ ہم ہی بے وقوف تھے جو اس بے حیا کے بہکاوے میں آ گئے۔ تھوڑی سی جانچ پڑتال کر لیتے تو شاید اصلیت سامنے آ جاتی۔ یہ نیٹ چیٹنگ بالکل بے شرمی کا اکھاڑہ ہے''۔

''تو پولیس کے پاس جائیں گے؟'' کافی دیر بعد پنڈت للت رام نے منہ کھولا۔ ''رام رام میں بھی ہندو ہوں۔ سچ اور جھوٹ کے معنی جانتا ہوں۔ میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ ان بچوں نے جو کیا وہ پاپ نہیں۔ کتنا مذہب جانتے ہیں آپ، کشمیریوں کا مذہب کیا ہندوستانیوں کے مذہب سے الگ ہے؟ وہی ہندو مذہب جو میرے دل میں ہے، وہی آپ کے دل میں ہے اور ہندو مذہب نفرت نہیں محبت سکھاتا ہے۔ دل کو توڑنا نہیں جوڑنا سکھاتا ہے۔ میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ دونوں نے جو کچھ کیا۔ وہ ذرا بھی غلط نہیں ہے''۔

''اس لئے کہ آپ بھی اس سازش میں شامل تھے۔ وہ بھی ایک ہندو ہو کر۔ گیتا کا پاس رکھنا چاہئے تھا آپ کو۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ ناقابلِ معافی ہے''۔ اجے شری رام کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ''اتنا بڑا فریب، شاید یہ سوچ پانا بھی میزائل کے چھٹنے جیسا ہے''۔

''تو آپ پولیس کے پاس جائیں گے۔ فریاد لے کر اور پولیس آسانی سے اس پریم کہانی کو سچ مان لے گی؟ ایسے ماحول میں جہاں تلوار سر پر منڈلا رہی ہے، جنگ کا ماحول ہے، کشمیر میں دہشت گردی ہو رہی ہے اور کشمیریوں کے پاس ثبوت بھی موجود ہے۔ ایسی صورت میں آپ جانتے ہیں پولیس کے پاس جانے کا مطلب؟ ایمرجنسی ٹکٹ و مشکل حالات میں آپ کی مدد۔ ان سب کو دہشت گردانہ کارروائیوں کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ جایئے پولیس کے پاس''۔

جیسے اچانک آنکھوں کے آگے کی دھند انسان کو ایک نہ ختم ہونے والے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہے۔ میں جیسے اچانک صفر میں دھکیل دیا گیا..... میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سروج کی آنکھوں کے آنسو اس کے گال پر جمع ہو گئے تھے۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں جیسے ڈاکٹر نے سہارا دیتے ہوئے جواب دے دیا ہو۔

''ہم سب پھنسیں گے..... پولیس میں جانے کے بعد کوئی نہیں بچے گا''۔ بابو جی کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ''میں بھی مسلمانوں کا آدمی ہوں۔ ایک کٹر اور مذہبی انسان لیکن کیا کٹر پن بچوں کی خوشی سے زیادہ معنی

Pakistanipoint.com

رکھتے ہیں؟'' پہلی بار بابو جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''میں نے بس ان بچوں کی خوشی کے لئے یہ بھی سوچ لیا تھا۔ سیاست کی عمر نہیں رہی اب، ریٹائرمنٹ لے لوں گا۔ مسلمانوں کی محفلوں میں جانا بند۔ سچ اگر لاکھوں لوگوں کی جان لینے سے زیادہ بھیانک ہے تو ایک سچ کے لئے کیوں آگے نہیں آ سکتے''۔

''دھوکا!'' اجے شری رام کمرے میں ٹہلتا ہوا بے چین تھا۔ ''ہم ایک اجنبی خطے میں چند مسلمانوں کے درمیان اپنی غلطی سے پھنس گئے ہیں۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ پولیس کے پاس گئے تو شاید وہ ایک نیا کلبھوشن ڈھونڈ لے گی''۔

''ہماری پولیس ایسی نہیں ہے''۔ شاید پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھے بولنا چاہئے۔ ''سروج نے یہ ساری لڑائی صرف میرے لئے لڑی ہے۔ اس وقت ہندوستان جیسے ملک سے ساری بندشوں کے باوجود اگر یہاں تک آنے کی ہمت جتائی ہے تو صرف میرے لئے ...... لیکن شاید تاریخ کے سارے بے رحم اوراق میں ہمیشہ سے پیار کو شکست ملتی رہی ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے...... سروج کو بھی''۔

الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔ صرف آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں...... ہونٹ لرز رہے تھے...... ''ہم نے سوچا تھا...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... پاکستان کی آزادی نے سب ٹھیک کر دیا تھا ناں؟ دو ملک...... دو الگ ملک...... اپنی جگہ چین سے زندگی گزارنے والے دو ملک لیکن کہاں سب ٹھیک تھا۔ 72 برسوں میں سب ٹھیک کہاں ہوا۔ لڑتے ہی رہے ہیں، نفرت بوتے رہے...... نفرت کی فصلیں کاٹتے رہے۔ نفرت بھلا کیوں نہیں سکتے ہم؟'' میں نے آنسو پونچھے۔ ''بتائیے کیا راستہ ہے؟ حسن صدیقی سے سچ مچ جگدیش تندولکر بن جاؤں تو آپ مجھے ہندوستان بلا کر سروج مجھے سونپ دیں گے؟''

''نہیں''۔ ماتا کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

''پھر راستہ بتائیے...... حل نکالئے''۔ آنسو ایک بار پھر آنکھوں میں سمٹ آئے تھے۔ ''ہم نے سوچا تھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں آپ کے آنے کے بعد آپ کے پاؤں پر گر کر ہم معافی مانگ لیں گے۔ آپ بدلتے وقت کے ساتھ ہمارے پیار کی گہرائی سمجھیں گے اور معاف کر دیں گے''۔

الفاظ ٹھہر گئے ہیں۔ میں کمرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ دیوار پر جھولتے دیوی دیوتاؤں کے کیلنڈر میں ایک بچہ گیتا پڑھ رہا ہے۔ دیوتا اور مندروں کی تصویریں، صرف کمرہ بدلا ہے۔ ہم حالات نہیں بدل سکتے لیکن برسوں کی تہذیب سے جڑنے کے بعد کسی نئے فیصلے کی جماعت میں ہی یہی کمرہ ایک نئی تہذیب تو اوڑھ سکتا ہے؟ پھر حالات کیوں نہیں بدلے جا سکتے۔

اور یہ وہی نازک دور تھا جب ہندوستان سے ہندو دہشت گردوں کی دھمکیاں آ رہی تھیں۔ لڑکیوں کو پڑھانا منع ہے۔ باہر سڑک پر نکلنا، غیر مردوں کو دیکھنا اور ایسی تمام دھمکیوں میں عورت کی بغاوت کی سزا موت تھی۔ عورت ایک بار پھر پندرہویں صدی میں پہنچ رہی تھی۔ شاید سروج کی بغاوت کو بھی ہندو مذہب سے جوڑ کر دیکھا جائے گا۔ محبت...... موت ......

صرف موت کا جان لیوا احساس رہ گیا تھا۔ شاید ہم ہار چکے تھے۔ ماتا چپ تھیں، سروج کی سسکیاں گونج رہی ہیں۔ بابو جی ادھ مرے سے کرسی پر ہیں ماں کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان ہو چکی ہیں۔

''ہم ابھی جائیں گے یہاں سے''۔ اجے شری رام نے فیصلہ سنا دیا۔ ''اب یہاں رکنا مناسب نہیں اور ہاں محبت جیسی چیز کا واسطہ دے کر ہمیں روکنے کی کوشش مت کیجئے۔ ہم بے شرمی اور بے حیائی جیسی چیزوں کو

Pakistanipoint.com

غیر مذہب اور غیر اخلاقی مانتے ہیں۔ ہم جا رہے ہیں''۔

''ایک منٹ''۔ سروج اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ ''یہ شادی آپ کے لئے جھوٹ سہی، میرے لئے نہیں ہے۔ اس لئے خود کو جگدیش کی بیوی سمجھتے ہوئے میں اس سے دو منٹ اکیلے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں''۔

اجے شری رام نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا لیکن ماتا جی نے خاموش اجازت دے دی۔ کمرے میں اس وقت صرف ہم دونوں تھے، لاچار و بے بس خوفزدہ سروج نے مجھے بانہوں میں لے لیا۔ مجھے ایک الوداعی بوسہ کیا پھر جدا ہوئی۔

''گھبراؤ مت، تمہاری بیوی ہوں اب کوئی گناہ نہیں کیا میں نے اور وقت گواہ ہے۔ دشمنی اور دہشت کے ایسے ماحول میں ہم نے ایک دوسرے کو چنا اور جو کچھ ہم کر سکتے تھے..... ہم نے کیا''۔

''لیکن وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ بے شرمی اور بے حیائی کے مظاہرے کی سزا وہاں صرف موت ہے''۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''تم سے الگ ہو کر زندہ بھی کہاں ہوں مگر اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ وہ سروج دیوی کو ہندوستان لے جا رہے ہیں۔ میں اپنا جسم، اپنی روح یہیں چھوڑے جا رہی ہوں..... تمہارے پاس''۔ وہ جھٹکے سے مڑی پھر باہر نکل گئی۔

میں بت بنا اپنے وجود پر اس کے ریشمی بدن کے لمس کو ہمیشہ کے لئے اپنے اندر محفوظ کرتا رہا۔ باہر ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ وہ لوگ چلے گئے تھے۔ بھیانک تنہائی اور سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے دھند کی ایک گہری لکیر دور تک بچھ گئی تھی لیکن اس دھند میں ابھی تک سروج دیوی کے چہرے کو میں اندر تک محسوس کر سکتا تھا۔

''میں اپنا جسم اپنی روح یہیں چھوڑے جا رہی ہوں، تمہارے پاس.....''

کہانی ختم ہو چکی تھی لیکن شاید کہانی کا ایک بے جان حصہ ابھی باقی تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب اقوام متحدہ میں پاکستان نے کشمیر کے سیاسی بیانیے کو عالمی دنیا کے سامنے رکھا اور کشمیریوں کو ایک نئی امید اور حوصلہ ملا تھا۔ پاکستان و ہندوستان پر دہشت گردوں کو کشمیر بھیجنے کا دباؤ بڑھا رہا تھا اور بدلے میں ہندوستان اپنی پالیسی میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے ایک چھوٹا سا خط ہوم منسٹری کو بھیجا۔ میں نے صرف اتنا لکھا تھا۔

''عزت مآب! کشمیر کا ایک شہری ہونے کے ناطے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اکثر اخباروں میں پڑھتا ہوں، سنتا ہوں کہ آپ لوگ ہندوستان سے دہشت گردوں کو سونپنے کی مانگیں کرتے رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں، ہندوستان ایسا نہیں کرے گا۔ بدلے میں ہندوستان بھی اسی طرح کی کچھ مانگیں آپ کے سامنے رکھتا آیا ہے۔ یہ خط بے حد تکلیف بھرے الفاظ کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میری محبت سروج دیوی ولد نرائن داس، میر قاسم محلہ، دہلی ہندوستان میں ہے۔ آپ دہشت گرد مانگتے ہیں۔ وہ نہیں بھیجتے۔ کیا ایک بار میری بات پر غور کرتے ہوئے آپ ان سے ایک محبت کے لئے اپیل نہیں کر سکتے؟ صرف ایک بار..... شاید اس کے جواب میں وہ بھی ایسی ہی محبت آپ سے مانگ بیٹھیں۔ پھر ممکن ہے محبتوں کا یہ سلسلہ دور تک چل نکلے''۔

میں گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور ظاہر ہے اس وقت بھی میری آنکھوں میں سروج کی صورت جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ بہت اندھیرے کے باوجود میں ابھی اس لڑائی کو بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

❀❀❀

Pakistanipoint.com

ناقابلِ فراموش

وہ بڑے فخر سے کہتی ہے کہ میں ایک شہید کی بیوہ ہوں اور شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ پھر بھلا میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں۔

دھرتی گواہ رہنا

☆ سیدہ شاہدہ شاہ
0333-5882780
جہلم

ہاتھوں پر گرم دستانے پہنے شانے پر گن لٹکائے نائیک جاوید اختر دور وادی کشمیر کے سینہ تانے برف پوش سربفلک پہاڑوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جنوری کی خون جما دینے والی سردی اور اس پر طرہ یہ کہ برف پوش پہاڑوں کی طرف سے چلنے والی یخ بستہ ہوائیں جسم کو چھیدے جا رہی تھیں۔ نائیک جاوید اختر کے جسم پر مخصوص فوجی یونیفارم، جرسی، فوجی جیکٹ اور اوورکوٹ اگرچہ موسم کی یخ بستگی کا کافی حد مقابلہ کر رہا تھا مگر برفانی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوائیں اتنے دبیز اور گرم کپڑوں میں بھی درآ رہی تھیں۔ مگر پچیس سالہ نائیک جاوید اختر رگوں میں خون جما دینے والی سردی سے بے نیاز انتہائی مستعدی سے کشمیر کے بارڈر پر پہرہ دے رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ ابھی اس کی بیوی کے ہاتھوں کے حنائی رنگ پھیکے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ نائیک جاوید اختر کو فوری طور پر یونٹ میں رپورٹ کرنے کا کہا گیا اور رپورٹ کئے کے ٹھیک تیسرے دن ان کی یونٹ کو مخدوش حالات کے پیش نظر کشمیر کے بارڈر پر بھیج دیا گیا۔

رات کی تنہائیاں ہوں، آنکھوں سے نیند ہویدا ہو، آس پاس کوئی بھی نہ ہو اور پوری کائنات خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہو تو خیالات و تصورات کا ذہن کی سکرین پر ایک فلم کی طرح چلنا لازمی اور فطری امر ہو جاتا ہے۔ نائیک جاوید اختر بھی اپنے گاؤں، اپنے گھر سے کوسوں دور شانے پر سین گن اٹھائے اگرچہ وطن کی سرحدوں پر پہرہ دے رہا تھا اور بظاہر اس کی نظریں دور وادی کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر

دشمن کو کھوج رہی تھیں مگر اس کے ذہن میں یادوں کی بارات سجی ہوئی تھی۔

نائیک جاوید اختر جہلم شہر کے ایک دور افتادہ گاؤں سنگھوئی کا رہنے والا تھا۔ ضلع جہلم کے اس گاؤں کے زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش فوج کی ملازمت تھا۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ مارشل ایریا کہلاتا ہے۔ نائیک جاوید اختر کے والد اگرچہ وسیع و عریض زرعی اراضی کے مالک تھے تاہم انہوں نے بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح ذریعہ معاش سپہ گری کو ہی بنایا اور ایک طویل عرصہ عسکری خدمات انجام دینے کے بعد آنریری کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ نائیک جاوید اختر نے بھی ایف اے کے بعد فوج میں کمیشن کے لئے اپلائی کر دیا۔ تاہم وہ اپنے آخری عسکری ٹیسٹ آئی ایس ایس بی میں ناکام ہوگیا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور افواج پاکستان میں بحیثیت سپاہی شمولیت اختیار کر لی۔ ملک کی سالمیت سے محبت اسے ورثے میں ملی تھی۔ وطن سے محبت اس کی شریانوں میں دوڑتے ہوئے سرخ لہو کی طرح ٹپکی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود گاؤں میں ایک وسیع زرعی اراضی ہونے کے فوج کی ملازمت اختیار کرنے کو ترجیح دی۔

نائیک جاوید اختر کے عسکری اوصاف ٹریننگ میں ہی عیاں ہونے لگے۔ وہ ٹریننگ سینٹر کا مانا ہوا کھلاڑی اور ایک بہترین نشانہ باز بھی تھا۔ ہر قسم کے ہتھیار چلانے کے فن کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہدف پر نشانہ بھی اس خوبصورتی اور درستگی سے لگاتا کہ اپنے ٹریننگ دینے والے اساتذہ کو بھی حیران کر دیتا۔

ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد جب وہ یونٹ میں پوسٹ ہوا تو اس کے جوہر اور بھی کھل کر سامنے آنے لگے۔ اپنی عسکری زندگی کے اس مختصر سے دور میں ہی وہ کئی بار ماہر نشانچی کے اعزازات جیت چکا تھا۔ اپنی انہی صلاحیتوں کی بدولت وہ اپنے بالا آفیسران کی نظر میں انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔

جب وہ نائیک بنا تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ چنانچہ خاندان میں ایک اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کر دی گئی۔ سات بہن بھائیوں میں اس کا نمبر تیسرا تھا۔ شادی بیاہ میں تو جی بھر کر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ خصوصاً گاؤں کی شادیوں میں تو لوگ ہفتوں پہلے دنیا جہاں کی خوشیاں منانے کے لئے طرح طرح کی رسومات و رواج تخلیق کر لیتے ہیں بہانے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ مایوں، مہندی، ڈھولک کی تھاپ پر دولہا دلہن کے گھر آنا جانا اور رات گئے تک لڑکیوں کا ڈھولک کی تھاپ پر شادی بیاہ کے رومان انگیز بابل کا آنگن چھوڑ کر پیا دیس سدھارنے والی دلہن کے ماں باپ اور بہن بھائیوں، عزیز و اقارب اور برادری کے لوگوں نے یہی سب کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ مگر انہی دنوں ملکی حالات اچانک خراب ہو گئے۔ سرحدوں پر جنگ کے مہیب بادل چھانے لگے۔ فضاؤں میں گولہ بارود اور لہو کی بو گھلنے لگی۔ ان حالات میں ایک عسکری فرد کو چھٹی نہیں ملا کرتی بلکہ اسے حکم ملا کرتا ہے تاکہ مختصر سے وقت کے نوٹس پر وہ محاذ جنگ کی طرف کوچ کر سکے۔

نائیک جاوید اختر بھی ایک فوجی تھا۔ اس کے دل میں اگرچہ شادی کے بے پناہ ارمان تھے مگر وطن کی سرحدوں پر جنگ کے مہیب بادلوں کو منڈلاتے دیکھ کر اس نے گھر والوں کو شادی کی تاریخ مقرر کرنے سے منع کر دیا لیکن تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ یوں بھی گاؤں میں شادیوں کا یوں ملتوی ہونا اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس کے والد ذاتی طور پر یونٹ کمانڈر سے ملے۔ اس خاندان کی عسکری خدمات اور نائیک جاوید کی اچھی رپورٹ کے باعث اس وعدے

PakistaniPoint.com

پر ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی کہ اس دوران ان کی یونٹ کو Move کرنے کا حکم ملا تو نائیک جاوید کو فوری طور پر یونٹ رپورٹ کرنا ہوگی۔

جس دن نائیک جاوید گھر پہنچا تو اسی روز شادی کی رسومات شروع ہوگئیں۔ مخدوش حالات کے پیشِ نظر شادی کی تاریخ تین دن بعد کی مقرر کی گئی۔ تمام تیاریاں پہلے ہی مکمل تھیں چنانچہ تین دن بعد نائیک جاوید اختر اور شازیہ پروین کی شادی ہوگئی۔ دوسرے روز دعوتِ ولیمہ تھی جب پوسٹ مین نے اسے ٹیلیگرام دیا جس میں اسے اگلے روز فوری طور پر واپس یونٹ رپورٹ کرنے کا کہا تھا۔ یوں اپنی نویلی دلہن کے حنائی ہاتھوں کی مہک، ماں باپ، بہن بھائیوں کی خوشیاں اور شادی بیاہ کے بعد کی تمام رسومات ادھوری چھوڑ کر اگلے روز ہی اپنی یونٹ میں حاضر ہوگیا اور حاضری کے تیسرے دن ہی انہیں کشمیر کے محاذ کی طرف پیش قدمی کا حکم مل گیا۔

نائیک جاوید اختر کے ذہن میں تصورات و خیالات کی ایک فلم چل رہی تھی۔ تصور میں وہ اپنے آپ کو حجلہ عروسی میں دیکھ رہا تھا۔ جہاں سرخ عروسی لباس میں سمٹی سمٹائی شازیہ پروین شرم و حیا کے بوجھ تلے پلکوں کی جھالر آنکھوں پر گرائے بیٹھی تھی اور وہ اس کے حنائی اور نرم و نازک ہاتھ تھامے اس سے زندگی بھر کے عہد و پیمان باندھ رہا تھا۔ اچانک ایک کھٹکے سے نائیک جاوید اختر کے رومان پرور خیالات و تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے پوزیشن لیتے ہوئے اس طرف نظریں جما دیں۔ جس طرف کھٹکا ہوا تھا بمشکل ایک منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ اس کی آنکھوں نے دور دشمن کے ایک دستے کو حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس کی عسکری ٹریننگ نے اسے خطرے کا ادراک کرا دیا۔ اس نے فوری طور پر قریبی مورچے میں اپنے کمانڈر کو اطلاع کی اور تیزی سے اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ کر اپنے کمانڈر کی ہدایات کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی نظریں بدستور دشمن پر جمی ہوئی تھیں اور سٹین گن شانے سے اتر کر ہاتھوں میں فائر کی پوزیشن میں آ گئی تھی تاکہ خطرے کی صورت میں فوری طور پر کارروائی کی جا سکے۔

نائیک جاوید کی اطلاع پر کمانڈر نے فوری طور پر ہیڈ کوارٹر سے ہدایات لیں اور انتہائی مختصر وقت میں اپنے دستے کو اس طرح ترتیب دیا کہ دشمن کے حملے کو نہ صرف روکا جا سکے بلکہ فوری طور پر اسے کچلا بھی جا سکے۔ یہ پاک فوج کا انتہائی تربیت یافتہ لڑاکا دستہ تھا۔ جو موسم سرما کی کپکپا دینے والی اور ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتہائی مختصر وقت میں دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہوگیا تھا کہ ان کے عزائم اور حوصلے کشمیر کے سر بفلک پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند و بالا تھے۔

دستے کا نوجوان کمانڈر کیپٹن عباس علی اپنے شکار پر گھات لگائے ہوئے چیتے کی طرح دشمن پر نظریں جمائے ہوئے بے چینی سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اپنے دستے کی یوں ترتیب دی تھی کہ دشمن کو اس کی کم نفری کا احساس نہ ہو سکے۔ مگر وہ سب جانتے تھے کہ سرحدوں سے میلوں دور ان کے دیس کے باسی محض ان کے آسرے اور اللہ کے آسرے پر بند کمروں میں گرم گرم لحافوں میں دبکے سکھ چین اور آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ سرحدوں کے رکھوالے موسموں کی سختیوں سے بے نیاز پتھریلے اور سنگلاخ پہاڑوں پر کھلے آسمان تلے اپنے گھر والوں، اپنے پیاروں سے کوسوں دور ان کی حفاظت کے لئے جاگ رہے ہیں اور چاق و چوبند ہیں۔

جب دشمن کیپٹن عباس علی کی گھات میں آ گیا تو

اس نوجوان کمانڈر نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دشمن پر مشین گن کا برسٹ مار کر گویا حملے کا سگنل دے دیا۔ کشمیر کی وادی اس دستے کے اللہ اکبر کے جوابی نعرے سے گونج اٹھی۔ ساتھ ہی پوری فضا آتش و آہن سے گونج اٹھی۔ دشمن شاید اس توقع پر رات کے ان سنسان لمحوں میں حملہ آور ہوا تھا کہ اس شدید سردی میں پاکستانی فوج اتنی چوکس نہیں ہوگی۔ اس لئے وہ آسانی سے سرحد عبور کر کے پاکستان کی اہم دفاعی چوکیوں پر قبضہ کر لے گا۔ مگر پاکستانی فوج کے اس مختصر سے دستے نے ان کی عددی قوت اور بہترین ہتھیاروں کے غرور کو آن واحد میں خاک میں ملا دیا۔ پوری وادی ہلکے اور بھاری ہتھیاروں کے فائر کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ زخمیوں کی چیخوں اور آتش و آہن نے فضا کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ پاکستانی دستہ جگہیں بدل بدل کر انتہائی تیزی اور پھرتی سے فائرنگ کر رہا تھا تاکہ دشمن کو ان کی کم نفری ہونے کا احساس نہ ہو سکے۔ اس کوشش میں وہ زخمی اور شہید ہو رہے تھے۔ نائیک جاوید اختر کو تین گولیاں لگی تھیں۔ مگر وہ انتہائی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ خود نوجوان کیپٹن عباس علی شدید زخمی ہو چکا تھا مگر وہ آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کے ساتھی بھی انتہائی بہادری سے دشمن کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہے تھے۔ عین اسی لمحے کہ جب دشمن اپنی عددی نفری اور کارگر ہتھیاروں کی بدولت غلبہ پانا چاہتا تھا کہ ہیڈ کوارٹر سے مدد آن پہنچی۔ فضا ایک بار پھر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ کیپٹن عباس علی شاید اسی مدد کا منتظر تھا۔ اس نے سسکرا کر کشمیر کے سر بفلک اور سینہ تانے ہوئے پہاڑوں کی طرف دیکھا۔ انگلیوں سے ہوائی بوسہ اچھالا اور زخموں سے چُور چُور ارضِ وطن کا یہ بانکا سجیلا نوجوان کیپٹن عباس علی راہِ حق کا وہ مسافر بن گیا جن کی منزلیں

کہکشاؤں کے اس پار نیلے جاودانی آسمان سے پرے ہوا کرتی ہیں۔

نائیک جاوید اختر کا جسم زخموں سے چُور ہو چکا تھا، اس کے جسم سے تازہ تازہ ابلتا ہوا لہو کشمیر کی دھرتی کو گل رنگ کر رہا تھا۔ اس کے پاس ایمونیشن بہت کم مقدار میں رہ گیا تھا۔ مارے نقاہت کے آنکھیں بند ہوئے جا رہی تھیں مگر پوری قوتِ ارادی سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں سے تازہ کمک دیکھ لی تھی۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بھی سنے تھے۔ اس کے لئے یہ احساس انتہائی جانفزا ثابت ہوا تھا کہ اس دیس کے رکھوالے دشمن کو کچلنے آن پہنچے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی دم توڑتی ہوئی ہمت کو پوری قوت سے یکجا کیا۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور بچی کھچی گولیوں کا پورا برسٹ دشمن کی طرف کر کے چلایا۔ وہ ایک ماہر نشانچی تھا، زندگی بھر بہترین نشانچی کے اعزازات جیتتا رہا۔ اس آخری وقت میں بھی یہ اعزاز برقرار رہا۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے فائر کی گئی کوئی بھی گولی ضائع نہ ہوئی اور اپنے سامنے آئے ہوئے عدو کے جسموں میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ بعض کے جسم میں تو دو دو تین تین گولیاں بھی لگیں۔

اس کے ساتھ ہی ہمت دم توڑ گئی اور وہ بے سدھ ہو کر اپنے گھر سے سینکڑوں میل دور کشمیر کے پتھریلے اور برف پوش پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک پتھریلی چٹان پر چت لیٹ گیا۔

''میری دھرتی، میری سرزمین!'' اس نے ڈوبتی ہوئی سانسوں اور بجھی ہوئی آنکھوں سے بمشکل بولتے ہوئے کہا۔ ''تُو گواہ رہنا کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تیری حرمت کے لئے اپنے لہو سے سرزمین پر وہ چراغ روشن کئے ہیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت بجھا نہ پائے گی''۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں، اس آخری وقت میں اس نے رات کے اندھیرے میں ہی اپنے گھر کی طرف رخ کر کے اپنے ماں باپ، اپنی نویلی دلہن کو سلام کیا اور پھر کلمہ شہادت پڑھ کر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

علی الصبح جب کشمیر کے سر بفلک برف پوش اور سینہ تانے ہوئے پہاڑوں سے سورج نے جھانکا تو کشمیر کے بارڈر پر پاکستانی پوسٹ پر سبز ہلالی پرچم پوری شان و شوکت سے لہرا رہا تھا۔ جبکہ نیچے وادی کشمیر میں چٹانوں پر، مرغزاروں پر، دشمن کی اَن گنت لاشیں دشمن کی شکست فاش کی گواہی دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں شہدائے وطن کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی موت کی اذیت یا خوف نہ تھا بلکہ ایک سکون ایک تبسم تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد وہ تھک ہار کر آرام کر رہے ہوں۔ خود نائیک جاوید اختر کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا، جسم کا سارا لہو جسم سے نکل کر ان سنگلاخ چٹانوں کو رنگین بنا چکا تھا جہاں وہ لڑ رہا تھا مگر اس کا چہرہ معجزاتی طور پر بالکل محفوظ تھا۔ اس جوان چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ اور ہونٹوں پر جاودانی تبسم تھا۔

نائیک جاوید اختر کے والدین بوڑھے ہو چکے ہیں مگر آج بھی بیٹے کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ شازیہ پروین نے خاندان والوں کے زور دینے کے باوجود ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ بڑے فخر سے کہتی ہے کہ میں ایک شہید کی بیوہ ہوں اور شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ پھر بھلا میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔

Pakistanipoint.com

جرم و سزا

ریٹائرڈ انسپکٹر چوہدری سجاول گھمن کی ڈائری سے انتخاب

انتقام، سائیں اور منہ بولی بہن

سائیں نے ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ میری کوئی بہن نہیں، میں آپ کو اپنی بہن بنانا چاہتا ہوں لیکن آپ مالک، میں نوکر۔ شاید آپ کو یہ بات پسند نہ آئے۔

☆ ریاض بٹ 0313-8807945 حسن ابدال

Pakistanipoint.com

ماہِ دسمبر شروع ہو چکا تھا۔ سردی اپنے پنجے ماحول میں گاڑھ چکی تھی۔ رات ہونے والی بارش نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔ موسم جیسا بھی ہو جرم تو ہوتے رہتے ہیں۔ انسان اپنے کسی جذبے کی تسکین کے لئے گل کھلاتا رہتا ہے اور جب یہ گل کھل جاتا ہے تو پھر پولیس کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ عموماً رات کے اندھیرے میں کئے ہوئے جرم دن کی روشنی میں تھانے تک آئے ہیں۔

اس دن میں ابھی تھانے میں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک متوسط طبقے کا بندہ آیا۔ وہ یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ رات کوئی اس کا مشکی گھوڑا کھول کر لے گیا ہے۔ یہ کوئی اتنی اہم واردات نہیں تھی کہ میں اسی وقت اس کے ساتھ اٹھ کر دوڑا چلا جاتا۔

وہ ایک گورے رنگ کا گول مٹول بندہ تھا، عمر چالیس سال کے قریب ہوگی۔ اس نے اپنا نام جہانگیر بتایا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اس کا گھوڑا نہیں بیٹا گم ہو گیا ہو۔ میں نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہا کہ وہ بتائے کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔

''تھانے دار صاحب! آج کل کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے''۔ اس نے بتایا۔ ''میں نے صحن میں بنا ایک کمرہ گھوڑے کو دے دیا ہے اور اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے ایک بندہ رکھا ہوا ہے''۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے اس خاموشی میں نقب لگاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا وہ بندہ گھوڑے کے ساتھ ہی سوتا ہے۔ میرا مطلب ہے وہ بھی اسی کمرے میں سوتا ہے جہاں گھوڑے کو باندھا جاتا تھا؟''

''جی نہیں تھانے دار صاحب!'' اس نے کہا۔ ''دراصل صحن میں دو کمرے ہیں جن کے درمیان ایک دروازہ ہے۔ مبین عرف سائیں ملحقہ کمرے میں سوتا تھا''۔

''اس وقت سائیں کہاں ہے؟''

''تھانیدار صاحب! مجھے زیادہ تشویش اس لئے ہے کہ گھوڑے کے ساتھ سائیں بھی غائب ہے''۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''صبح میں حسب معمول جب جاگ کر گھوڑے والے کمرے میں گیا۔ تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی''۔ جہانگیر نے کہا۔ ''کیونکہ گھوڑا غائب تھا اور اس کی کی ہوئی لید یہ گواہی دے رہی تھی کہ اس کو تقریباً تین گھنٹے پہلے لے جایا گیا ہے۔ جب میں نے دوسرے کمرے میں جا کر دیکھا تو سائیں کو بھی غائب پا کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے''۔

اس سے اور بھی باتیں ہوئی تھیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ گھوڑے کے ساتھ ساتھ ایک بندہ بھی غائب تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ مجھے خود ہی چلنا چاہئے۔ ورنہ اگر صرف گھوڑے کا مسئلہ ہوتا تو میں کسی ہیڈ کانسٹیبل کو ایک سپاہی دے کر بھیج دیتا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیسے آیا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے سکوٹر پر آیا ہے۔

قارئین! یہ اس دور کی کہانی ہے جب ویسپا سکوٹر عام تھے۔ موٹر سائیکلیں اتنی عام نہیں تھیں۔ میں نے اس سے اس کا پتہ پوچھ کر اسے رخصت کر دیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور سرکاری گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ ہماری منزل گاؤں کوتوال والا تھی۔ یہ کافی بڑا گاؤں تھا۔ دو سو کے قریب گھر ہوں گے۔ ان میں تقریباً آدھے پکے اور آدھے کچے تھے۔

جہانگیر کا گھر تقریباً سات مرلے پر بنا ہوا ایک پکا گھر تھا۔ صحن میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ 12x14 فٹ کے ایک کمرے کو درمیان میں دیوار

Pakistanipoint.com

بنا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دیوار میں بنے ہوئے دروازے سے اُدھر سے اِدھر آیا جا سکتا تھا۔ کمروں کا فرش اینٹوں سے بنایا گیا تھا، اس لئے وہاں کسی قسم کے کھرے ملنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔

جہاں گھوڑے کو باندھا جاتا تھا وہاں ایک کھرلی بنی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے تازہ گھاس کے علاوہ ایک بڑے سے طباق میں دودھ ملے چنے بھی نظر آئے۔ لگتا تھا گھوڑے کی بڑی ٹہل سیوا ہوتی تھی اور گھوڑا جہانگیر کا چہیتا تھا۔ ویسے یہ بات تو جہانگیر کے چہرے کے تاثرات نے مجھے اچھی طرح بتا دی تھی۔ بہرحال مجھے وہاں کوئی سراغ نہ ملا۔ دوسرے کمرے میں ایک بان کی بنی ہوئی چارپائی کے علاوہ کھانے پینے کے برتن اور ایک پرانی لکڑی کی میز تھی۔ کونے میں ایک جستی صندوق تھا جو تالے سے بے نیاز تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صندوق بالکل خالی تھا۔

اس وقت میرے ساتھ جہانگیر بھی تھا۔ سپاہی صحن میں گھوم پھر کر کوئی سراغ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جہانگیر کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ثبت ہو کر رہ گئے ہیں۔

''صندوق تو بالکل خالی ہے''۔ میں نے اس کی حیرت میں ڈوبی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب! میں خود حیران ہوں کہ یہ صندوق خالی کیوں ہے؟'' اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''اس میں سائیں کے کپڑے اور کچھ اشیاء تھیں اور ابن صفی کے آٹھ دس ناول تھے''۔ جہانگیر نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

''تو سائیں ابن صفی کے ناول پڑھتا تھا؟''

''جی ہاں جناب! وہ تو ان کا دیوانہ تھا''۔ چند لمحے جہانگیر نے خاموشی میں گزار دیئے پھر گویا ہوا۔ ''تھانے دار صاحب! میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے''۔

''دیکھو جہانگیر بھائی! تمہارے دل میں جو بات بھی ہے وہ مجھے بتا دو''۔

''مجھے شک ہے کہ چوہدری امانت علی کے بیٹے سلامت علی نے سائیں سے مل کر گھوڑے کو چوری کروایا ہے اور اس شک کو یہ بات بھی ہوا دے رہی ہے کہ سائیں اپنا سب کچھ لے گیا ہے''۔

''اس شک پر غور تو کیا جا سکتا ہے لیکن.....'' میں نے چند لمحے توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری امانت علی یا اس کے بیٹے کی تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟''

''دراصل سلامت علی کو یہ گھوڑا پسند آ گیا تھا''۔ جہانگیر نے کہا۔ ''اس نے مجھے اس گھوڑے کو خریدنے کے لئے دس ہزار کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے یہ رقم ٹھکرا دی تھی''۔

''اوہ..... یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ اس سے تم کم از کم دس گھوڑے خرید سکتے تھے''۔ (یہ اُس دور کی بات ہے جب ہزار روپے میں گھوڑا مل جاتا تھا۔ آج کل تو گھدا بھی تیس چالیس ہزار روپے میں ملتا ہے)

''لیکن جناب! بلبل کو تو نہیں''۔ اس نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

''بلبل شاید اس گھوڑے کا نام ہے؟''

''جی ہاں، جناب! یہ گھوڑا ابھی بچہ ہی تھا کہ میرے دوست امجد علی نے مجھے تحفتاً دیا تھا۔ یہ گھوڑا مجھے اپنے بیٹے مجاہد کی طرح عزیز تھا''۔

''سائیں کب سے یہاں ملازم تھا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''سائیں دس سال سے میرے پاس تھا۔ پہلے یہ گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ جب بلبل میرے پاس آیا تو میں نے اسے اس کی دیکھ بھال پر لگا دیا تھا''۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ سائیں نے گھوڑے کو پالا تھا۔ ظاہر ہے وہ سائیں کے ساتھ مانوس ہو گیا تھا۔

جہانگیر نے سائیں کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا جس کا ذکر مناسب وقت پر آئے گا۔ یہاں صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ سائیں کا گھر دس میل دور ایک قصبے میں تھا۔ وہ پندرہ بیس دن بعد دو تین دنوں کے لئے گھر کا چکر لگا لیتا تھا۔ میں نے جہانگیر سے کہا کہ وہ یہ پتہ کروائے کہ اس کا نوکر گھر گیا ہے یا نہیں اور خود سپاہیوں کو لے کر تھانے میں آ گیا۔

سپاہیوں نے مجھے یہ رپورٹ دی تھی کہ گھوڑے کو باقاعدہ پلاننگ اور بندوبست کے ساتھ لے جایا گیا ہے اور زیادہ امکان یہی ہے کہ اسے کسی ٹرک وغیرہ میں ڈال کر لے جایا گیا ہے۔ کیونکہ پکی سڑک تک کسی ٹرک یا بڑی گاڑی کے ٹائروں کے نشان پائے گئے تھے۔

شام کو جہانگیر تھانے میں آیا اور بتایا کہ سائیں گھر نہیں گیا۔ میرے علم میں صرف ایک مشتبہ بندہ لایا گیا تھا اور وہ تھا سلامت علی، چوہدری امانت کا بیٹا۔ میں نے اسے ہی ٹٹولنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کہیں بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ ویسے بھی اس وقت شام کے سائے گہرے ہو کر رات کی تاریکی میں مدغم ہو گئے تھے۔

اگلی صبح تھانے میں آ کر میں نے ایک سپاہی کو بھیج کر اسے بلا لیا۔ سلامت علی سانولے رنگ کا ایک چوبیس سالہ جوان تھا۔ ماتھا تنگ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ نشے کا عادی لگتا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ چکا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے تمہیں جو عزت دی ہے امید ہے وہ برقرار رکھو گے۔

''میں سمجھا نہیں تھانیدار صاحب! آپ نے بلایا، میں حاضر ہو گیا''۔

''مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہیں گھوڑے بہت پسند ہیں۔ خاص کر مشکی گھوڑے''۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے''۔ وہ ہنس پڑا۔

مجھے اس کی ہنسی بے موقع لگی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا جو تمہاری بتیسی نکل آئی ہے''۔

''جناب! معافی چاہتا ہوں۔ لگتا ہے جہانگیر نے گھوڑے کی گمشدگی کا ملبہ میرے اوپر ڈال دیا ہے''۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ وہ باخبر لگتا تھا۔

میں نے اسے آزمانے کی خاطر کہا۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے کہ جہانگیر کا گھوڑا چوری یا گم ہو گیا ہے''۔

''جناب! ہم بھی گاؤں میں ہی رہتے ہیں، ایسی خبریں چھپی تو نہیں رہتیں''۔

''اگر میں یہ کہوں کہ گھوڑا تم نے چوری کروایا ہے تو تم اپنی صفائی میں کیا کہو گے؟''

''جناب! میں نے گھوڑا چوری نہیں کروایا۔ یہ سب جہانگیر کا کیا دھرا لگتا ہے؟''

''وہ کیسے؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''جناب! بات ایسی ہے کہ شاید آپ یقین نہ کریں''۔

''تم اس بات کو چھوڑو کہ مجھے یقین آتا ہے یا نہیں، پوری بات بتاؤ''۔

''کیا آپ کو پتہ ہے کہ جہانگیر کام کیا کرتا ہے؟''

''میری معلومات کے مطابق وہ مویشیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے''۔

''تو جناب! اس سلسلے میں وہ اکثر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اس کی بیوی جمیلہ نے اپنے نوکر سائیں کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے۔ آگے آپ خود سمجھدار

میں بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا لیکن بغیر ثبوت
ں یقین نہیں کر سکتا تھا۔
''اس بات کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟''
''یہ بات مجھے افضل نے بتائی تھی''۔
''اور یہ افضل کون ہے؟''
''افضل بھی مویشیوں کی خرید و فروخت کرتا ہے
انگیر کا پڑوسی ہے''۔
''دیکھو، اگر یہ بات جھوٹ نکلی تو میں تمہاری
ادھیڑ دوں گا''۔ میں نے اسے دھمکایا۔
''اس کی نوبت نہیں آئے گی تھانے دار
ب!'' وہ یقین سے بولا۔
اس نے اس بات کا بھی اقرار کر لیا کہ اس نے
کو خریدنے کے لئے جہانگیر کو دس ہزار کی آفر کی تھی
سودا نہ بننے پر اس نے یہ خیال دماغ سے نکال دیا
ن میں اس بات کو دماغ سے نہیں نکال سکتا تھا کہ
نے حقیقت کی تہہ تک پہنچا ہے۔ میں نے اسے اس
ر کے ساتھ رخصت کر دیا تھا کہ وہ تھانے میں
ئے بغیر کہیں نہ جائے۔
اب میں نے ثبوت حاصل کرنا تھا۔ سلامت علی
بڑی بات کہہ گیا تھا۔ میں نے بڑے طریقے سلیقے
جمیلہ کو ٹٹولنا تھا لیکن پہلے افضل سے تصدیق ضروری
۔ لگتا یہی تھا کہ اس کیس نے مجھے کافی چکر دینے

جب میں نے سپاہی بھیج کر افضل کو بلانا چاہا تو پتہ
لا کہ افضل ساہیوال گیا ہوا ہے۔ پہلے ساہیوال کا نام
ری ہوا کرتا تھا۔ اس وقت منٹگمری بسکٹ مشہور ہوا
تے تھے۔ اب یہ شہر زیادہ دودھ دینے والی بھینسوں
وجہ سے مشہور ہے۔
سپاہی یہ معلومات بھی لے کر آیا تھا کہ افضل
مویشیوں کے ایک سوداگر (احسان علی) کے پاس ملازم ہے۔ سپاہی احسان علی سے بھی مل آیا تھا کیونکہ اس کو اپنا کام پتہ تھا۔ مطلب ہے اس کو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سپاہی سے پوچھا۔
''فیض محمد تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ احسان علی سے مل لینا چاہئے؟''
''سر! افضل کے گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنے پڑوسیوں سے یہ کہا تھا کہ وہ تین دن بعد واپس آ جائے گا۔ آج چوتھا دن ہے''۔
''اوہ..... تو یہ بات ہے''۔ میں نے چند لمحے سپاہی فیض محمد کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''اس سلسلے میں احسان کیا کہتا ہے؟''
''مجھے تو سر! دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ احسان علی نے یہ کہا تھا کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ ایک دو دن میں آ جائے گا لیکن اس کا لہجہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ اندر خانے کہانی کچھ اور ہے''۔
جیسا کہ پہلے بھی کسی کہانی میں فیض محمد کے متعلق ذکر آ چکا ہے کہ وہ لمبا تڑنگا بڑے بڑے ہاتھوں والا جوان تھا۔ معمولی نوعیت کے مجرم اس کو دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ بلکہ ان کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ فیض محمد بلا کا ذہین بھی تھا اور مشکل کیس حل کرنے کی جستجو اور شوق اسے پولیس کے محکمے میں لے آیا تھا۔
''تم افضل کے پڑوسیوں سے کہہ آئے تھے کہ جونہی افضل آئے اسے تھانے بھیج دیا جائے''۔
''جی ہاں، سر! وہ جہانگیر کا پڑوسی ہے، میں اسے کہہ آیا ہوں''۔
''کیا وہ شادی شدہ نہیں ہے؟''
''اس کی شادی ہوئی تھی۔ سر! لیکن دو ماہ پہلے اس نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ بیوی اس کے ساتھ

ایک سال اور دس ماہ رہی تھی"۔ فیض محمد کی معلومات قابل ستائش تھیں۔ بات سے بات نکل رہی تھی، تفتیش کے در کھل رہے تھے۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ، ایک دن اور افضل کا انتظار کر لیتے ہیں"۔ فیض محمد مجھے سلوٹ کر کے چلا گیا۔ افضل آج کل اکیلا رہ رہا تھا۔

جب اگلے دن شام تک افضل نہ آیا تو میں نے احسان علی کو بلا لیا۔ وہ گندمی رنگت کا ایک درمیانے قد کا فربہی مائل بندہ تھا۔ اس نے اعلیٰ کوالٹی کے گرم کپڑوں کے اوپر واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں باٹا کے مکیشن تھے۔ اس کے ماتھے کی بناوٹ اسے ایک سخت گیر بندہ ظاہر کر رہی تھی۔

"کیسے حال چال ہیں احسان علی؟" جب وہ میرے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تھانے دار صاحب! اگر آپ مجھے ابھی نہ بھی بلاتے تو میں صبح خود ہی تھانے میں آ جاتا"۔

"کیوں..... خیر تو ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کا بھیجا ہوا سپاہی کل میرے پاس آیا تھا۔ وہ میرے نوکر افضل کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اب تو مجھے بھی اس کے متعلق تشویش ہو گئی ہے؟"

"یہ تو مجھے پتہ چل چکا ہے کہ وہ پیسے دینے ساہیوال گیا ہوا ہے۔ وہ وہاں کس بندے کے پاس گیا تھا؟" میں نے اپنے رولر کو دائیں طرف سے اٹھا کر بائیں طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دیکھا کہ میرے رولر کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے تھے۔ پھر وہ پُرسکون ہو گیا تھا۔ یہ تو ایک نفسیاتی حربہ تھا۔

"تھانے دار صاحب!" اس نے چور نگاہوں سے رولر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ وہاں ملک زمرد کے پاس گیا تھا۔ اس سے میں نے کچھ بھینسیں خریدی تھیں۔ ان کے پیسے دینے تھے، تقریباً دس ہزار روپیہ تھا"۔

"یہ تو بہت بڑی رقم ہے..... کیا پہلے بھی افضل اتنی رقم لے کر جاتا رہا ہے؟" میں نے اندر کی کہانی نکالنے کے لئے جان بوجھ کر یہ سوال کیا۔

"جناب! افضل اس سے پہلے بیس بائیس ہزار روپے تک بھی لے کر جاتا رہا ہے"۔

"یعنی افضل ایک ایماندار شخص ہے"۔

"بس، جناب! انسان فرشتہ نہیں بن سکتا۔ اگر اس میں ایک کمزوری نہ ہوتی"۔ وہ روانی میں کہہ تو گیا لیکن یہاں تک کہہ کر وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کسی چلتی گاڑی کو اچانک بریک لگ گئے ہوں۔ پھر وہ اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے وہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی کیفیت میں گرفتار ہو گیا ہو۔

"جو بات تمہاری زبان پر آ گئی ہے، اسے اگل دو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے"۔ میں نے رولر کو دوبارہ دائیں طرف رکھتے ہوئے کہا۔ اس بار واضح طور پر اس کے چہرے پر خوفزدگی کے آثار نظر آئے دو نفسیاتی جھٹکوں نے اس کا دماغ میرے قبضے میں کر دیا تھا۔

"اب تو ساری بات بتانی ہی پڑے گی، جی!" وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔

پھر اس نے جو بات سنائی۔ وہ میں مختصراً اپنے الفاظ میں آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔

افضل اس کے پاس عرصہ پانچ سال سے ملازم تھا۔ اسے افضل پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا اور افضل نے اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ احسان نے دو سال پہلے ایک بیوہ (جس کا خاوند ایک ٹریفک حادثے

بلاک ہو گیا تھا، سے افضل کی شادی کروا دی تھی۔
ں بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بچہ ہو بہو اپنی ماں
کا پی تھا لیکن افضل کہتا تھا کہ یہ اس کا بچہ نہیں ہے۔
کی آپس میں کھٹ پٹ رہنے لگی۔ آخر افضل نے
بیوی شگفتہ کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد عورت
ت سے افضل کا اعتبار اٹھ گیا لیکن مزے کی بات یہ
کہ وہ ساہیوال میں کسی عورت کی زلف کا وہ اسیر ہو
ا تھا۔

یہ بات احسان نے بتائی تھی۔ اس کی تصدیق
ف افضل کر سکتا تھا۔ ویسے مجھے یہ سب کچھ ہضم نہیں
رہا تھا لیکن افضل تھا کہاں؟ بچہ افضل نے شگفتہ کو
ے دیا تھا۔

بقول احسان علی افضل دوہری شخصیت کا مالک
۔ ایک طرف وہ عورت کو بے وفا سمجھتا تھا، دوسری
ف ایک عورت ہی کی زلفوں میں پناہ ڈھونڈنے جاتا
۔ عجیب گورکھ دھندہ تھا۔ فی الحال میرے پاس احسان
کو تھانے میں روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لئے
ں نے اسے رخصت کر دیا۔ اسے بھی پابند کر دیا کہ وہ
نے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائے۔ ابھی میں کسی نتیجے
نہیں پہنچ سکا تھا۔

میں نے اے ایس آئی شکیل کو بلا کر سارے
الات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ پچھلے کچھ دنوں
سے اپنے بیمار والد کو دیکھنے گیا ہوا تھا اور آج صبح ہی آیا
۔ میری ساری باتیں سن کی وہ پہلے تو حسب معمول
وچ کی گہرائیوں میں چلا گیا پھر بولا۔

''سر! معاملہ جتنا سیدھا نظر آ رہا ہے، اتنا سیدھا
ں ہے۔ یہ تو ریشم کی ایسی ڈوریوں کی طرح ہے جو
پس میں الجھی ہوئی ہیں''۔ میں نے مسکرا کر اس کی
رف دیکھا، پھر کہا۔

''بات تو کچھ ایسی ہی ہے کسی طرح افضل
ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو اس کیس کا کوئی منہ سر واضح
ہو سکتا ہے۔ ایک بات اور بھی ہے جس کے لئے میں
نے تمہیں بلایا ہے۔

''جی، سر! آپ حکم کریں''۔

''مجھے اس تھانے میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں
ہوا ہے۔ تم تو کافی عرصے سے اس تھانے میں ڈیوٹی
سرانجام دے رہے ہو۔ میں نے چوہدری امانت علی کے
بیٹے سلامت علی کو بلایا تھا لیکن چوہدری امانت علی کی
طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ کیونکہ روایتی
چوہدری حضرات ایسے معاملات میں تھانے دار کی جان
کو آ جاتے ہیں''۔

''سر! دراصل چوہدری امانت علی ذرا اور ٹائپ کا
چوہدری ہے۔ وہ کاموں مزارعوں اور گاؤں کے لوگوں کو
حقیر نہیں سمجھتا۔ جہاں تک چھوٹے چوہدری سلامت علی
کا معاملہ ہے وہ من موجی بندہ ہے، وہ امانت علی کے
ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ چوہدری امانت علی اس کی وجہ سے
خود پریشان ہے''۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔ کیا سلامت علی حویلی
میں نہیں رہتا؟'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''وہ گاؤں سے باہر قبرستان کے پاس جو ان کا
مالٹوں اور آموں کا باغ ہے، وہاں رہتا ہے لیکن حویلی
میں آتا رہتا ہے''۔

قارئین! آپ نے بھی اکثر پھل دار باغوں میں
بنے ہوئے کمرے دیکھے ہوں گے۔ میرا ذہن بڑی دور
تک سوچ رہا تھا لیکن کان اے ایس آئی شکیل کی باتوں
کی طرف لگے ہوئے تھے جو کہہ رہا تھا۔

''چوہدری معقول آدمی ہے، وہ پہلے بھی ایک
کیس کے سلسلے میں ہماری مدد کر چکا ہے۔ میرا خیال
ہے اسے ٹٹولتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، تم کانسٹیبل اشرف علی کو کہو کہ وہ

Pakistanipoint.com

میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرے''۔

چوہدری کی حویلی کافی وسیع تھی۔ گیٹ پر چوکیدار بیٹھا ہوا تھا اور گیٹ پر ٹیلیفون لگا ہوا تھا۔ بہرحال دس منٹ بعد ہی میں چوہدری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کانسٹیبل کو میں نے گیٹ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔

چوہدری امانت علی ایک اونچے لانبے قد کا پینتالیس پچاس سالہ بندہ تھا۔ رنگ گندمی، آنکھیں بادامی رنگ کی تھیں۔ بڑے ٹہکے والا بندہ تھا۔

''تھانیدار صاحب! جس طرح اس باری تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، اسی طرح ہوتا ہے''۔ اس نے بات کا آغاز کیا۔ ''میں کافی عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے ملاقات کروں لیکن بس سوچ کے ہی رہ جاتا تھا''۔ وہ بولا تو اس کی شخصیت واضح ہوگئی۔

''مجھے اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں بہت سے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے چوہدری صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ان دنوں ایک گورکھ دھندے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں''۔

پھر میں نے سارے حالات کھول کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ میری ساری باتیں سن کر وہ سوچ کی گہرائی میں چلا گیا۔ اس کے ماتھے پر سلوٹوں کا ایک جال سا بن گیا۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔

''تھانیدار صاحب! میں اس سارے معاملے کی چھان بین کرواؤں گا''۔ آخر اس نے کہا۔ ''اگر میرا بیٹا سلامت علی کسی طرح ملوث ہوا تو میں قانون کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں سختی سے کاربند ہوں''۔

اس دوران نوکر کچھ لوازمات رکھ کر چلا گیا تھا۔ جس میں گاجر کا حلوہ، کشمیری چائے اور دوسرے خشک میوہ جات تھے۔ بہرحال میں چوہدری امانت علی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔

ایک بات کا ذکر کرنا پہلے میں بھول گیا تھا، اب کر دیتا ہوں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل جاوید کو افضل کے بارے میں معلومات لینے کے لئے ساہیوال بھیجا ہوا تھا۔ میں شگفتہ سے بھی ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن اس اللہ کی بندی کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ افضل کے گھر سے نکل کر وہ اپنے ماموں کے گھر بھی نہیں پہنچی تھی۔ کیونکہ اس کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ دو بہنیں تھیں جو اپنے جھمیلوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ اس کا پہلا خاوند شادی کے دو ماہ بعد ہی ایک ٹریفک حادثے میں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ عدت کی مدت اس نے اپنے ماموں کے گھر پوری کی تھی۔ بہرحال اس کہانی کی تین کڑیاں منظر سے غائب تھیں۔ شگفتہ، افضل اور سائیں۔ میرے ذہن میں یہ بات بار بار آ رہی تھی کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ضرور ہے۔

اگلے دن ہیڈ کانسٹیبل جاوید واپس آ گیا۔ وہ بڑی سنسنی خیز خبریں لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ افضل ملک زمرد تک نہیں پہنچا تھا۔ میرے حکم کے مطابق جاوید نے روٹین سے ہٹ کر کام کیا تھا۔ وہ سفید کپڑوں میں ملک زمرد سے ملا تھا اور اپنے آپ کو اس کا قریبی دوست ظاہر کیا تھا۔ جب ملک زمرد نے افضل کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تو جاوید نے رازدارانہ لہجے میں اس سے کہا کہ مجھے افضل نے بتایا تھا کہ وہ یہاں ایک عورت کے چکر میں آتا ہے جو اسے اچھی لگتی ہے۔ جاوید نے اپنی طرف سے یہاں تک کہہ دیا کہ افضل نے اس عورت کی خاطر اپنی بیوی پر جھوٹا الزام لگا کر طلاق دے دی ہے۔

ملک زمرد نے بتایا کہ وہ کسی ایسی عورت کو نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسا ہی معاملہ ہو اور عورت کے رشتے داروں کو پتہ چل گیا ہو۔ اس کے بعد ملک زمرد تو

خاموش ہو گیا تھا لیکن جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ جاوید سمجھ گیا تھا۔ میں نے رپورٹ سن کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دی کہ اس نے بڑے اچھے طریقے سے کام کیا ہے۔ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا اور بولا۔

''ساہیوال میں میرا کزن عمران رہتا ہے، وہ بھی پولیس میں ہے۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ افضل کی کھوج لگائے، سر!'' وہ ہنس کر بولا تھا۔ ''عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ بہرحال مجھے امید ہے جلد یا بدیر وہ کوئی حوصلہ افزا رپورٹ دے گا''۔

میں نے اس کو رخصت کر کے اپنی مخبر چاچی خورشید کو پیغام بھیجا کہ وہ شام کے بعد مجھے ملے۔ اس وقت ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ جیسا کہ شروع میں ذکر آ چکا ہے کہ وہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ ساڑھے چھ بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا تھا۔ چادر میں منہ سر لپیٹ کر وہ آ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جہانگیر کی بیوی جمیلہ کے متعلق کچھ جانتی ہے؟ اس نے اپنے پان سے رنگے ہوئے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''جناب! وہ اسم بامسمّیٰ ہے''۔

''میں نے تمہیں اس کے حسن کا قصیدہ پڑھنے کے لئے نہیں بلایا''۔ میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔ میرے تیور دیکھ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔

''یہ بات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ عورت خوبصورت ہو تو ہوس کے پجاری ایسی عورت کو دانہ ضرور ڈالتے ہیں۔ میں نے تو اس کی ایسی ویسی کوئی بات نہیں سنی لیکن ایک بات ضرور سنی ہے کہ اس کا شوہر جہانگیر اسے گھر کی مرغی دال برابر سمجھتا ہے''۔

''کیا وہ خود دوسروں کی مرغیوں کو دانہ ڈالتا پھرتا ہے؟'' میں نے اس بار ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں''۔ اس نے کہا۔ ''البتہ جہانگیر اپنے گھوڑے سے بہت پیار کرتا تھا''۔

''اوہ..... اس کا مطلب ہے تمہیں اس کے گھوڑے بلبل کی گمشدگی کا پتہ ہے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اسے کون لے گیا ہے؟''

''سائیں بھی تو غائب ہے''۔ وہ بولی۔

''تمہارا مطلب ہے سائیں اسے لے گیا ہے''۔

''میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی''۔ اس نے کہا۔ ''ویسے تو چوہدری سلامت بھی جہانگیر کے گھوڑے کے پیچھے پڑا ہوا تھا''۔

''خیر، تم اس بات کی ٹوہ لگاؤ کہ کہیں جمیلہ نے سائیں سے دل تو نہیں لگا لیا تھا۔ جب شوہر بیوی کی پروا نہ کرے تو ایسے گل کھلتے رہتے ہیں''۔

اس کو رخصت کرنے کے بعد میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ کسی کو مجرم ثابت کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ثبوت کے بغیر استغاثہ کی عمارت کو عدالت میں وکیل اپنی جرح کے ہتھوڑے سے زمین بوس کر دیتے ہیں اور اکثر مجرم بھی اپنے وکیل کے کہنے پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ میں نے تو پولیس کے تشدد کی وجہ سے اقرار جرم کیا تھا ورنہ میں تو معصوم ہوں۔ استغاثہ کی بنیادیں ٹھوس ثبوت اور ناقابل تردید شہادتوں پر کھڑی ہوں تو فکر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔

ابھی چاچی خورشید نے کوئی رپورٹ نہیں دی تھی کہ ایک ایسی بات ہو گئی جس کی توقع مجھے بالکل نہیں تھی۔ اگلی صبح ایک مزارع یہ اطلاع لے کر تھانے میں آیا کہ چھوٹا چوہدری اپنے باغ والے کمرے میں مردہ حالت میں پڑا ہے۔ اسے واپس بھیج کر میں نے ضروری تیاری کی اور ایک کانسٹیبل اور دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور باغ میں پہنچ گیا۔ وہاں چوہدری امانت علی بھی موجود تھا۔ میں جونہی گاڑی سے اترا وہ میری جانب آیا۔ اس کا چہرہ غم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کرب کے

Pakistanipoint.com

آثار تھے۔

''یہ کیا ہو گیا تھانیدار صاحب؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''حوصلہ رکھیں چوہدری صاحب!'' اتنی بات کہہ کر میں کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ کمرہ بالکل باغ کے درمیان بنا ہوا تھا۔ کمرہ بنانے میں اینٹوں کا استعمال ہوا تھا۔ یہ کمرہ خاصا بڑا تھا، 14x18 فٹ ہو گا۔ کمرے کے کونے میں ایک سیڑھی اور کچھ لکڑی کی پٹیاں رکھی ہوئی تھیں جو یقیناً مالٹے پیک کرنے کے لئے تھیں۔

کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی کے اوپر سلامت علی کی آڑھی ترچھی لاش پڑی ہوئی تھی اور چارپائی پر پڑا ہوا بستر اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ چوہدری یہاں تڑپتا رہا ہے۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے اس کے گلے کا بغور معائنہ کیا لیکن مجھے وہاں بھی ایسے نشان نظر نہیں آئے۔ جو یہ ثابت کرتے کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ میں نے لاش کے پاس جھک کر غور سے دیکھا تو مجھے شک نہیں، یقین ہو گیا کہ مقتول کی موت زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں نے کمرے میں چل پھر کر کوئی سراغ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ البتہ بستر پر مجھے تین چار لمبے لمبے بال نظر آئے۔ سپاہیوں کو میں نے باہر ہی چھوڑا تھا جبکہ کانسٹیبل اشرف میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بال محفوظ کر لے۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ امانت علی اور باغ میں کام کرنے والے دو نوکر کمرے سے باہر تھے۔ اس کے علاوہ گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی باغ میں تھے۔ بال مجھے الجھن میں ڈال رہے تھے۔ اگر یہ بال کسی عورت کے تھے تو وہاں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی ہونے چاہئیں تھے لیکن وہ نہیں تھے۔ ویسے میرا تجربہ کہتا تھا کہ بال کسی جوان سال عورت کے ہیں۔ آج کل تو لڑکوں میں لمبے بال رکھنے کا رواج کافی زور پکڑ گیا ہے مگر جس دور کی میں کہانیاں سناتا ہوں اس دور میں خال خال ہی کوئی بڑے بالوں والا لڑکا نظر آتا تھا۔ بہرحال یہ بال لاش کے ساتھ جانے تھے۔ میں نے ضروری کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لئے کانسٹیبل کی نگرانی میں ڈسٹرکٹ ہسپتال بھجوا دی اور کمرے کو سیل کروا دیا۔

اس وقت باغ میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ میں نے سپاہیوں کو گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا اور خود اس طرف بڑھ گیا جہاں باغ میں چار پانچ چارپائیاں اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چوہدری مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چوہدری صاحب! بیٹھ جائیں''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں بعد میں آؤں گا..... مجھے وہ دو نوکر چاہئیں جو یہاں باغ میں رہتے اور کام کرتے ہیں''۔

''جیرا فاور ٹنڈا اُدھر ٹیوب ویل والے کمرے میں ہیں۔ وہ رہتے بھی وہیں ہیں۔ آپ وہاں جا کر تسلی سے ان سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے خود ہی انہیں کہا ہے کہ وہ فی الحال اُدھر بیٹھیں''۔

''میں انہیں تھانے لے جانا چاہتا ہوں''۔ میں نے چوہدری سے کہا۔

چوہدری نے چند لمحے سوچا، پھر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ایک سانولے سے اکہرے بدن کے بندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''فیروز! جاؤ، ٹیوب والے کمرے سے جیرے اور ٹنڈے کو بلا کر لے آؤ''۔

''وہ جی چوہدری جی!'' کہتے ہوئے چلا گیا۔

بہرحال چند ہی لمحوں بعد دو ہٹے کٹے بندے میرے سامنے تھے۔ ایک کا رنگ ذرا صاف تھا جبکہ دوسرے کا رنگ سانولا تھا اور اس کے منہ پر چیچک کے

داغ تھے۔ دونوں شکل سے اچھے بندے نہیں لگتے تھے۔ بہرحال ایسے بندے چھوٹے چوہدری سلامت علی جیسی فطرت کے بندوں کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ چوہدری نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب تم دونوں کو تھانے لے جانا چاہتے ہیں۔ وہاں تم نے ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے''۔

میں نے دیکھا کہ دونوں کے چہرے ایک دم زرد ہو گئے ہیں اور خوف کے آثار ان کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان کو ذبح کرنے کے لئے لے جا رہا ہوں۔ قصہ مختصر ہم انہیں لے کر تھانے میں آ گئے۔ اس وقت دن کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ میں نے انہیں سپاہیوں کے حوالے کیا اور خود اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سپاہی شرافت علی کو کہہ آیا تھا کہ وہ پانچ منٹ بعد میرے کمرے میں آئے۔ شرافت علی ٹھیک پانچ منٹ بعد میرے کمرے میں آ گیا۔

''شرافت علی!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو نئے پروہنے آئے ہیں ان کو ایک چکر ٹرائل روم کا لگوا کر میرے پاس لے کر آؤ..... ہاں تم بھی کمرے میں موجود رہنا''۔

وہ چلا گیا، مجھے توقع تھی کہ دونوں ڈشکرے ''پالش'' ہو کر آئیں گے۔ دس منٹ بعد میں ان دونوں کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے انہیں کچا چبا جاؤں گا۔

''تھانیدار صاحب! ہم نے کچھ نہیں کیا۔ صرف نمک حلال کیا ہے''۔ دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

''بہت خوب..... اپنے مالک کو مار کر..... گویا تم نے نمک حلال کیا ہے''۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟'' دونوں یوں اچھل کر بولے جیسے میں نے ان کے پاؤں

میں کوئی سانپ چھوڑ دیا ہو۔

''شرافت علی ان کو لے جاؤ اور الٹا لٹکا کر حربہ نمبر 2 استعمال کرو''۔ میں نے میز پر پڑی ہوئی فائل اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب!'' جیرا بولا۔ ''ہم نے چھوٹے چوہدری صاحب کو نہیں مارا۔ آپ ہمارے حال پر رحم کریں''۔

''اوئے لومڑ کی اولاد تم لوگ سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ.....'' سپاہی نے دونوں کی گردن پر ایک ایک ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ اس کو باہر بھیجیں، ہم سب کچھ آپ کو بتا دیتے ہیں''۔

''تو شروع ہو جاؤ''۔ میں نے سپاہی کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے ان سے کہا۔ انہوں نے جو باتیں مجھے بتائیں وہ مختصراً میں اپنے الفاظ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔

دونوں چھوٹے چوہدری کے خاص بندے تھے۔ ان کے ذمے باغ کے معاملات سے زیادہ چھوٹے چوہدری سلامت علی کے کام تھے۔ چوہدری کے پاس باغ میں تاش اور شطرنج کی محفل جمتی رہتی تھی۔ پینے پلانے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہاں احسان علی بھی آتا رہتا تھا۔ بقول دونوں کے باغ میں کبھی کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ ایک دن جہانگیر کا نوکر سائیں باغ میں آیا۔ وہ کچھ مالٹے لینے آیا تھا، سلامت علی نے جیرے اور ٹنڈے کو کہا کہ ٹیوب ویل کے سامنے جو درخت ہیں ان سے مالٹے توڑ کر ایک پیٹی میں پیک کر کے سائیں کو دے دو اور سلامت علی نے سائیں کی نظر بچا کر یہ اشارہ بھی کر دیا کہ پیسے نہیں لینے ہیں۔ کچھ دیر بعد سائیں مالٹوں کی پیٹی اٹھا کر سلامت علی کے پاس آ گیا۔

''چوہدری جی! یہ لیں پیسے، بی بی جی نے دیئے ہیں''۔

''او چھوڑو سائیں جی! ہم نے بہت پیسے دیکھے ہیں۔ اپنی بی بی جی سے کہنا تحفے کے پیسے لینا کمینوں کا کام ہوتا ہے''۔

سائیں اس وقت خاموشی سے مالٹے لے کر چلا گیا لیکن آدھے گھنٹے بعد ہی مالٹوں کی پیٹی واپس لے آیا۔ اس وقت چوہدری سلامت علی کے پاس احسان علی بھی بیٹھا ہوا تھا۔

''بی بی جی کہہ رہی ہیں اپنے مالٹے اپنے پاس رکھو''۔ سائیں نے پیٹی رکھتے ہوئے سلامت علی سے کہا۔ ''یہ تحفہ اپنی کسی ہوتی سوتی کو دینا''۔

''سائیں!'' اچانک سلامت علی کھڑا ہو گیا اور کف اڑاتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے تمہاری بی بی کو عزت راس نہیں آئی''۔

اس سے پہلے کہ سلامت علی کچھ اور بھی کہتا احسان علی نے اسے ٹھاتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو یار! یہ غریب نوکر ہے، اس کا کام تو مالکوں کا حکم ماننا ہے''۔ پھر احسان علی نے سائیں سے کہا۔ ''تم جاؤ''۔

سائیں نے چند لمحے دونوں کی طرف دیکھا پھر چپ چاپ چلا گیا۔ جیرے اور ٹنڈے نے مجھے سنایا تھا کہ اس وقت وہ دونوں بھی وہاں موجود تھے۔ سائیں کے جانے کے بعد احسان علی نے ان سے بھی کہا تھا کہ تم بھی جاؤ اور دیکھنا یہ بات کسی کو پتہ نہ چلے۔ بقول ان کے چوہدری اس طرح خاموش ہو گیا تھا جیسے وہ بجلی سے چلنے والا کوئی روبوٹ ہو، جس کی بجلی احسان علی نے کاٹ دی ہو۔ انہوں نے اس بات کا اقرار بھی کر لیا کہ سلامت کے کہنے پر انہوں نے گھوڑا چوری کر کے دس میل دور سلامت علی کے ایک دوست کے پاس پہنچا دیا تھا۔ سائیں کو مارنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس

Pakistanipoint.com

نے نمک حلال کرتے ہوئے مزاحمت شروع کر دی تھی۔ ٹنڈے کے پاس سائیلنسر لگا ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کی دو گولیاں سائیں کے سینے میں اتار دی تھیں۔ بعد میں تمام نشان مٹا دیئے تھے اور سائیں کا سامان بھی جستی صندوق سے نکال کر لے آئے تھے۔ جب ڈرتے ڈرتے سائیں کے قتل کے متعلق انہوں نے سلامت علی کو بتایا تھا تو سلامت علی نے کہا تھا کہ سارا کام حسب منشا ہوا ہے۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ سائیں رکاوٹ بنے گا۔ میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ میں نے سپاہی کو باہر بھیج دیا اور دونوں کو کہا بیٹھ جاؤ۔ وہ رونے لگ گئے تھے۔

''چپ کرو اوئے، اب رونے دھونے کا کیا فائدہ۔ یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا''۔

''بس جی، یہ بڑے لوگ اپنی انا کی شطرنج پر ہم جیسے مہروں کو پٹوا دیتے ہیں''۔

''اور اس بات کو تم لوگ نمک حلال کرنا کہہ رہے تھے''۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

انہوں نے سر جھکا لیا۔ میری اس بات کا ظاہر ہے ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں تو یہ سوچ کر ان کو تھانے لے آیا تھا کہ وہ چوہدری سلامت علی کے قتل کے متعلق کچھ بتائیں گے لیکن اس معاملے میں انہوں نے مجھے کوری تختی دکھا دی تھی لیکن انہوں نے گھوڑے اور سائیں کی گمشدگی کا بھید کھول دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی کہی ہوئی ایک بات غور طلب تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ پچھلی شام مقتول نے ان سے کہا تھا کہ آج رات انہوں نے صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ٹیوب ویل والے کمرے سے باہر نہیں آنا تھا۔

میں نے انہیں حوالات میں بھیج کر کانسٹیبل اشرف اور سپاہی فیض محمد کو بلا کر حکم دیا کہ وہ احسان علی کو بلا کر لے آئیں۔ اگر وہ انکار یا آئیں بائیں کرے تو گرفتار کر کے لے آئیں۔

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ گھر میں مل جائے گا لیکن جب کسی کام نے ہونا ہوتا ہے تو راستہ خود بخود بن جاتا ہے۔ احسان علی دو دن سے بیمار تھا۔ اس کے گھر والے اسے ہسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کانسٹیبل اور سپاہی پہنچ گئے۔ کانسٹیبل نے سپاہی کو میرے پاس بھیج دیا اور احسان علی کے گھر والوں سے کہا کہ احسان ابھی ادھر ہی رہے گا۔ میں سپاہی کے ساتھ احسان کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ہائے ہائے کر رہا تھا، چہرہ زرد اور گال کافی حد تک اندر تک دھنس چکے تھے۔

''کیا ہوا احسان علی؟''

''بس..... ج..... ای..... پیٹ میں درد ہے''۔

مجھے شک گزرا کہ کہیں اس نے کچھ کھا تو نہیں لیا۔ میرے دل میں اس کے خلاف شکوک بھی تھے۔

''احسان علی! لگتا ہے تم نے زہر کھا لیا ہے''۔ میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

''نہیں، تھانے دار صاحب! مجھے کافی عرصے سے معدے کا السر ہے''۔

میں نے اس سے بحث کرنے کی بجائے اس کے گھر والوں سے کہا۔ یہ اب ڈسٹرکٹ ہسپتال جائے گا، اب یہ پولیس کسٹڈی میں ہے۔

''یہ کیا اندھیر نگری ہے۔ اس نے ایسا کون سا جرم کر دیا ہے؟'' احسان علی کی بیوی نے دہائی دینے والے انداز میں کہا۔ یہ ایک قبول صورت تیس سالہ خاتون تھی۔

''بی بی! یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ اس کا جگری یار قتل ہو گیا ہے۔ اس لئے احسان علی سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں''۔

''دیکھ لیا، آپ نے اس چوہدری سلامت علی سے یاری کا انجام''۔ بیوی نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کو لاکھ بار منع کیا تھا کہ اس بُرے

آدمی کی یاری چھوڑ دیں"۔

"بتول بیگم! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے"۔

ایک بھاری جسم کے مرد نے تیز آواز میں کہا۔

بعد میں مجھے یہ پتہ چلا کہ یہ احسان علی کا بڑا بھائی ہے۔ احسان علی دو دن ہسپتال میں رہا۔ تیسرے دن اس کی طبیعت سنبھل گئی اور ہم اسے لے کر تھانے میں آ گئے۔ شراب اور الٹ پلٹ کھانوں سے احسان علی کے معدے میں السر ہو گیا تھا۔ بہرحال اب اس میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ مزاحمت کر سکتا، اس نے بیان دے دیا۔ اس کے بیان سے ایک ایسی کہانی سامنے آئی جو خودغرضی، انا پرستی اور اونٹ کی طرح بدلہ لینے والے عناصر کا مجموعہ تھی۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ احسان علی اور جہانگیر مویشیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔ ایک بار دونوں کا آمنا سامنا بلکہ ٹاکرہ ساہیوال میں ہو گیا۔ جہانگیر نے احسان علی کا ایک سودا خراب کر دیا اور تھوڑے زیادہ پیسے دے کر مال خرید لیا۔ ایسا تو کاروبار میں ہوتا رہتا ہے لیکن احسان علی نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا اور جہانگیر کو نیچا دکھانے کے لئے بے چین رہنے لگا۔ اسے یہ بات پتہ تھی کہ جہانگیر کی بلبل (مشکی گھوڑے) میں جان ہے۔ احسان علی نے چوہدری سلامت علی کو ایک بار اپنی جان پر کھیل کر ڈاکوؤں سے بچایا تھا۔ چوہدری، احسان علی کا احسان مند تھا اور اس کے لئے موم کی ناک تھا۔

اس نے چوہدری سے کہا کہ کسی طرح جہانگیر کو گھوڑے سے محروم کر دیا جائے تو مزہ آ جائے۔ سلامت علی کی عقل پر پتھر پڑ گئے کہ اس نے گھوڑے کے لئے جہانگیر کو دس ہزار کی آفر کر دی اور یہ بات ریکارڈ پر آ گئی۔ جہانگیر کے انکار سے سلامت علی کو اپنی انا خطرے میں نظر آئی۔ پہلے دونوں نے مل کر جہانگیر کی بیوی جمیلہ کو ورغلانے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جہانگیر کو نیچا دکھایا جا سکے لیکن اس سلسلے میں ان کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔ مالٹوں والا واقعہ آپ پڑھ چکے ہیں۔

جب ذہن میں انتقام سما جائے تو عقل رخصت ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شیطانی منصوبے گھر بنا لیتے ہیں۔ سلامت علی (مقتول) نے جس طرح گھوڑے کو چوری کروایا وہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ جب سائیں بھی راستے سے ہٹ گیا تو دونوں کے ذہنوں نے ایک کہانی گھڑ لی۔ سلامت علی ایک حماقت کر چکا تھا اور اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ گھوڑے کی چوری کا سارا ملبہ اس پر گرے گا۔ چنانچہ اس نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جمیلہ کے چونکہ اپنے نوکر سائیں کے ساتھ تعلقات تھے، اس لئے جہانگیر نے سائیں کو راستے سے ہٹانے کے لئے خود ہی گھوڑے کی چوری کا ڈرامہ کیا ہے لیکن یہ ساری بات مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کہانی میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں تھا کہ جہانگیر کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی تھی کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے۔ میں نے جہانگیر کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ سلامت علی میرے بلانے پر آ کر کیا بکواس کر گیا ہے۔ یہ حساس معاملہ تھا اور اس میں ایک عورت کی عزت اور مستقبل کا سوالت ھا۔ اس لئے مکمل تفتیش سے پہلے میں کوئی بات افشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چوہدری کے قتل کا معمہ ہنوز باقی تھا۔ اسے کون اور کس طرح قتل کر گیا تھا۔ احسان علی نے قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی اپنی سی کوشش کی تھی کہ وہ اس بات سے لاعلم ہے کہ کون چوہدری کو اس کی جوہ میں گھس کر قتل کر گیا ہے۔ میں ابھی یقین کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیوں کہ ابھی افضل اور شگفتہ بھی منظر سے غائب تھے۔ بقول سلامت علی کے افضل نے اسے ■

ت بتائی تھی کہ سائیں اور جمیلہ میں ناجائز تعلقات یں۔ اس خیال سے مجھے جھرجھری سی آ گئی کہ ہوسکتا ہے افضل کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا ہو۔ جب باقی کہانی جھوٹی تھی تو یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ افضل کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا ہو۔

اس کیس میں ابھی بہت سے الجھاوے تھے۔ حسان علی کو میں نے حوالات میں بند کروا دیا اور ہیڈ کانسٹیبل جاوید کو بلا کہا کہ جاوید تم ایک بار پھر ساہیوال جاؤ اور اپنے کزن سے مل کر افضل کا سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ اب معاملہ جلدی کا متقاضی ہے۔ ابھی میں نے یہاں تک ہی بات کی تھی کہ میری میز پر رکھے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف ہیڈ کانسٹیبل جاوید کا رشتہ دار عمران بول رہا تھا جو پولیس میں تھا۔

''سر! آپ کے لئے ایک خوشخبری ہے''۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ''ہم نے دونوں پنچھیوں کو پکڑ لیا ہے''۔

''دونوں پنچھی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی ہاں، افضل اور اس کی محبوبہ جس سے ملنے افضل یہاں آتا تھا''۔

''اوہ..... یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی تم نے، کہاں ہیں وہ دونوں؟''

''سر! آپ نے میری عزت کرنی ہے''۔ عمران نے کہا۔ ''ہمارے تھانیدار صاحب کو یہ بات پتہ نہ چلے کہ یہ کام میں نے اپنے طور پر کیا ہے کیونکہ اگر دونوں ایک دفعہ ہماری حوالات میں پہنچ جاتے تو.....''

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا ہے''۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی دونوں فی الحال کسی جرم میں ملوث نہیں ہیں۔ جاوید اس وقت میرے پاس ہی کھڑا ہے۔ یہ لو اس سے بات کرو''۔

میں نے ریسیور جاوید کی طرف بڑھا دیا۔

دو تین منٹ جاوید بات چیت کرتا رہا پھر ریسیور کریڈل کرتے ہوئے بولا۔

''سر! لگتا ہے اس کیس کے حل ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ عمران کہتا ہے کہ دونوں بہت خوفزدہ ہیں۔ میں رات کی تاریکی میں انہیں وہاں سے نکال کر لے آؤں؟''

''ٹھیک ہے تم اپنی وردی اور شناخت ایک بیگ میں ڈالو اور سادہ کپڑوں میں وہاں جا کر دونوں کو لے آؤ''۔ میں نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ یاد رہے کہ وردی اور شناخت والا بیگ تمہارے پاس ہونا چاہئے۔ اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے''۔

''بالکل ٹھیک ہے سر!'' وہ مجھے سلیوٹ کر کے چلا گیا۔

مجھے احسان علی پر غصہ آنے لگا۔ کئی باتیں اس نے ابھی چھپائی ہوئی تھیں۔ فی الحال میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے مزید ثبوتوں کی ضرورت تھی۔ اگلے دن پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق چوہدری سلامت علی زہریلی شراب پینے کی وجہ سے مرا تھا اور موت کا وقت رات بارہ بجے سے دو بجے کے درمیان لکھا تھا۔

لاش کے ساتھ بال بھی واپس آ گئے تھے۔ ان کی رپورٹ علیحدہ سے منسلک تھی۔

رپورٹ کے مطابق یہ بال ایک ایسی عورت کے تھے جو اپنے بالوں میں جمیاں (کڑوا) تیل لگانے کی عادی ہے۔

مجھے ایک شک اور بھی تھا جس کو رفع کرنے کے لئے میں نے مخبر چاچی خورشید کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ اس نے اگلے دن بارہ بجے تک مجھے رپورٹ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں چھوٹے چوہدری

PakistanPoint.com

کے قاتل تک پہنچ گیا ہوں۔ چاچی خورشید کے آنے سے پہلے ہیڈ کانسٹیبل جاوید آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ شگفتہ کو میرے پاس بھیج دے اور افضل کو ابھی اپنی بیرک میں بٹھاؤ۔

شگفتہ لانبے قد کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ آنکھیں نیم خوابیدہ سی تھیں جیسے وہ ابھی سو کر اٹھی ہو۔ اس کی گود میں ایک خوبصورت بچہ سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اس وقت وہ مجھے ایک ایسی ہرنی نظر آئی جو درندوں سے بچ کر کسی محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہو۔

''شگفتہ! اس سے پہلے کہ تمہارا بچہ جاگ جائے تم مجھے سچی بات بتا دو''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ویسے تمہیں یہ بچہ اپنے خاوند کو دے آنا چاہئے تھا''۔

''تھانیدار صاحب! مجھے اب کوئی بات چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں''۔ وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''آپ تھانیدار ہیں، آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر بہت کچھ جان لیتے ہیں میرا مطلب ہے مجرموں کو چہرے سے پہچان لیتے ہیں۔ میرا پہلا خاوند مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ فوت ہو گیا تو احسان نے مجھے کہا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ میں نے اسے کہا کہ میں سوکن بن کر کسی عورت کی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ اگر تم غیر شادی شدہ ہوتے تو دوسری بات تھی۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، احسان نے میرا رشتہ افضل سے کر دیا۔ میں بہت خوش تھی۔ اس دوران گاہے گاہے احسان ہمارے گھر آتا رہا اور مجھے شیشے میں اتارتا رہا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اسے ٹالتی رہی۔ جب یہ بچہ پیدا ہوا تو افضل کا رویہ میرے ساتھ بدل گیا۔ میں عورت ہوں اور آپ کو پتہ ہے کہ قدرت نے عورت کو یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ مرد کی ہر قسم کی نظریں پہچان لیتی ہے۔ مجھے افضل کی نظروں میں اپنے لئے شک کا کالا ناگ پھنکارتا نظر آنے لگا۔ میں نے ایک دن رو رو کر اسے یہ بتا دیا کہ احسان علی کیسا بندہ ہے؟ میں نے یہ بھی کہا کہ میں قرآن پاک اٹھا کر لے آتی ہوں۔ میں نے اپنے خاوند کی آنکھوں میں بے بسی اور ندامت کے آنسو دیکھے۔ وہ بولا۔ شگفتہ ہم بڑے گناہگار بندے ہیں۔ اللہ ہمیں معاف کرے۔ احسان علی کا میرے اوپر ایک ایسا احسان ہے جو مجھے اس کے سامنے نظر اٹھانے نہیں دیتا۔ خیر میں تمہیں ساہیوال اپنی ایک دور پار کی رشتے دار کے پاس لے جاتا ہوں، تم وہاں رہو، میں تمہیں وہاں ملنے آ جایا کروں گا۔ ابھی یہاں حالات موافق نہیں ہیں۔ یہ ہے ساری بات جو میں نے مختصراً آپ کو بتا دی ہے۔ میں اس بچے کی قسم کھاتی ہوں کہ میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا''۔

''بی بی! باقی باتیں میں تمہارے خاوند سے پوچھ لوں گا''۔ میں نے اس سے کہا اور پوچھا۔ ''کیا تمہارے علم میں یہ بات ہے کہ چھوٹا چوہدری سلامت علی قتل ہو گیا ہے؟''

''نہیں''۔ اس نے حیرانی سے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ سلامت علی کو کیسے قتل کیا گیا ہے اور کہاں لیکن دانستہ بالوں کے متعلق نہیں بتایا۔ ویسے میں نے اس کے بالوں کو بغور دیکھا تھا وہ بھورے رنگ کے تھے اور میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ یہ قدرتی ہیں۔ بہرحال میں نے اسے بھیج کر اس کے خاوند کو بلا لیا۔ افضل کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ ہلکے سانولے رنگ کا ایک قبول صورت بندہ تھا۔ وہ شگفتہ سے سات آٹھ سال بڑا ہو گا۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

''افضل بھائی! اب تم بے فکر ہو جاؤ''۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''ہر قسم کا خوف اپنے دل سے نکال دو۔ چوہدری سلامت علی قتل

ہو چکا ہے اور اس کا جگری یار احسان ہمارے شکنجے میں ہے''۔

''اوہ..... چوہدری کو کس نے اور کب قتل کیا ہے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں اسے کس نے قتل کیا ہو گا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں''۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''البتہ میرے سر کے اوپر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔ اب میں بلاخوف وخطر اپنی بات آپ کو سنا سکتا ہوں''۔

اس نے جو کہانی سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔

افضل ساہیوال میں رہتا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک بہن تھی جو شادی کے ایک ماہ بعد مر گئی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اسے دور پار کی ایک خالہ نے اپنے پاس رکھ لیا لیکن ایک دن وہ اپنی خالہ کو یہ کہہ کر نکل آیا کہ وہ لاہور کام کی تلاش میں جا رہا ہے۔ حالانکہ اس نے افضل کو یہ کہا تھا کہ تمہارے ماں باپ جو مکان چھوڑ کر گئے ہیں۔ اس کا کرایہ آ رہا ہے۔ اس سے ہم دونوں کی گزر اوقات آسانی سے ہو رہی ہے لیکن افضل کے دل میں لاہور جانے کا سودا سما گیا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ لاہور غریب پرور شہر ہے۔ وہاں کام مل جاتا ہے۔ وہ نکل آیا۔ یہاں کی رونق نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ بازار حسن کے پاس ایک ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ اس وقت وہ نادانی کی عمر میں تھا۔ یعنی اٹھارہ سال کے قریب ہو گا۔ ہوٹل کے مالک نے اسے ہوٹل میں ہی ایک کمرہ دے دیا تھا۔ وہاں کا بیرا قدیر اس کا دوست بن گیا۔ اس کا بھی آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ افضل اپنے کرایہ داروں کو کہہ آیا تھا کہ وہ کرایہ خالہ کو دے دیا کریں۔ دراصل وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی خشک زندگی سے بے زار ہو گیا تھا۔ حالانکہ خالہ نے اسے کہا تھا کہ وہ اس کا گھر بسا دیتی ہے۔ اس سے اس کی بوڑھی ہڈیوں کو بھی آرام مل جائے گا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔

قدیر کبھی کبھی بازار حسن میں جاتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ افضل کو بھی ساتھ لے گیا۔ پھر کیا تھا چل سو چل۔ احسان علی اس ہوٹل میں کبھی کبھی ٹھہرتا رہتا تھا۔ ان دنوں اسے ایک ملازم کی تلاش تھی۔ ایسا ملازم جس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ جب باتوں باتوں میں احسان علی نے افضل سے یہ معلوم کر لیا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو اس نے افضل کو شیشے میں اتارنے کے لئے کہا۔

دیکھو، افضل! تم فضول اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ میں تمہیں رہائش بھی دوں گا اور اچھی ملازمت بھی۔ یہاں تم ہوٹل کے گندے برتن دھوتے ہو، گندا فرش دھوتے ہو، مختصراً احسان علی نے اسے شیشے میں اتار لیا۔

افضل نے یہ بات مجھے خاص طور پر سنائی تھی کہ قدیر کے ساتھ بازار حسن میں جاتے ہوئے اسے نہ صرف ڈر لگتا تھا بلکہ اس کا ضمیر اسے ملامت بھی کرتا تھا۔ اس لئے اب وہ اس ماحول سے بھی نکلنا چاہتا تھا۔ جب یہ بات احسان علی نے ہوٹل کے مالک کو بتائی تو وہ بولا۔

''احسان صاحب! یہ ممکن نہیں ہے اس نے مجھ سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا ہوا ہے، وہ کون دے گا؟''

''میں دے دیتا ہوں''۔ احسان نے کہا۔ ''بس آپ اسے چھوڑ دیں''۔

اس طرح افضل احسان علی کے ساتھ آ گیا۔

''افضل میں نے تمہاری کہانی سن لی اور اس پر یقین بھی کر لیا''۔ میں نے اس کی ساری بات سن کر کہا۔

Pakistanipoint.com

''لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کی میں وضاحت چاہتا ہوں''۔

''جی فرمایئے؟'' وہ بولا۔

''کیا تم نے چوہدری سلامت علی کو کہا تھا کہ جہانگیر (تمہارے پڑوسی) کی بیوی نے اپنے نوکر سائیں کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہیں''۔

''تھانیدار صاحب! میں نے اپنے خدا کو جان دینی ہے۔ میں نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں دیکھی تھی۔ البتہ احسان علی نے مجھے کہا تھا کہ میں جہانگیر سے یہ بات کہوں کہ میں نے ایک رات جب تم گھر میں نہیں تھے۔ سائیں کو تمہاری بیوی کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ یقین کریں میں نے جواب دیا تھا کہ میری جان لے لو، میں یہ بات نہیں کہوں گا''۔

''پھر..... تمہیں کیا جواب ملا تھا؟''

''احسان علی ہنس پڑا تھا اور کہا تھا۔ تمہاری مرضی لیکن یقین کریں مجھے اس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات نظر آئے تھے۔ جیسے وہ میرے جواب سے اندر ہی اندر کھول رہا ہو۔ ایک دن جب احسان علی باغ میں گیا ہوا تھا۔ میں اسے بلانے گیا تو باغ والا کمرہ اندر سے بند تھا اور ابھی میں دروازہ کھٹکھٹانے ہی لگا تھا کہ اندر سے احسان علی کی آواز آئی وہ کہہ رہا تھا۔ اس افضل کے بچے کو اب مزہ چکھانا پڑے گا۔ میں اندر باہر سے کانپ گیا۔ میں نے فوری دستک دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور باغ کا ایک چکر لگا کر، آ کر دستک دی۔ دروازہ احسان علی نے کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ تم کب آئے؟

''میں ابھی آیا ہوں جی، آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں''۔

''ٹھیک ہے۔ جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں''۔

اب میں بات کو ذرا مختصر کروں گا۔ مجھے اپنی بیوی اور اپنے لئے یہاں خطرہ نظر آیا۔ مجھے اپنی بیوی پر شک ہو گیا تھا۔ کیونکہ مجھے ایک نامعلوم بندے کا رقعہ ملا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ اپنی بیوی پر نظر رکھو۔ بہرحال جب میری بیوی نے احسان علی کے متعلق بتایا۔ تو میں ساری بات سمجھ گیا میں نے بیوی کو یہاں سے لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور اسے خالہ کے پاس ساہیوال لے گیا۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے احسان کو یہ بتایا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ مجھے ساہیوال میں ایک عورت پسند آ گئی ہے۔ یہ بات میں نے اپنی بیوی کو بہتری کے لئے کہی تھی۔

وہ خاموش ہو گیا۔ اب کہنے سننے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اگر یہاں رہنا چاہے تو بے خوف و خطر رہے لیکن اس نے اپنا ایڈریس دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تھانیدار صاحب! اب ہم ساہیوال میں ہی رہیں گے۔ یہاں سے اب خوف آتا ہے۔ اگر آپ کو میری کسی معاملے میں ضرورت ہوئی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ صرف تھانے میں فون کر دیجئے گا''۔

اب ان کے لئے خطرے والی کوئی بات نہیں تھی، اس لئے میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ میں احسان علی کے لئے اسے گمشدہ ہی رہنے دینا چاہتا تھا۔ اسی میں اس کی بہتری تھی۔

اب مجھے اپنی مخبر چاچی (جگت) خورشید کی رپورٹ کا انتظار تھا جو رپورٹ وہ پہلے دے گئی تھی وہ بھی میرے ذہن کے کمپیوٹر میں قید تھی۔ ویسے یہاں میں آپ کو سچی بات بتا دیتا ہوں کہ مجھے افضل اور شگفتہ پر شک تھا لیکن انہوں نے میرا شک رفع کر دیا تھا۔

چوہدری سلامت علی کا قاتل کون تھا؟ یہ سوال بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔ میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھا

کہ اے ایس آئی شکیل آ گیا۔

''سر! میں ابھی چوہدری امانت علی کے پاس سے ہو کر آ رہا ہوں''۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں نے ہی اسے چوہدری امانت علی کے پاس بھیجا تھا۔ جب سے اس کا بیٹا قتل ہوا تھا وہ بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔

''پھر چوہدری سے کیا باتیں ہوئیں؟''

''سر! لگتا ہے امانت علی اندر باہر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ جب جوان اولاد وہ چاہے جیسی بھی ہو، اس طرح بے بسی کی موت مر جائے تو والدین پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے امانت علی نے خود ہی اپنے بیٹے کو مروا دیا ہو لیکن.....''

''ایک منٹ''۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ شک یا خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟''

''دراصل ایک دفعہ ایک عورت نے بڑے چوہدری کو شکایت کی تھی کہ سلامت علی اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے (میں نے دانستہ نام چھپا لیا ہے)''۔

''اوہ.....تو یہ بات ہے''۔

''جی ہاں''۔ اے ایس آئی بولا۔ ''بڑے چوہدری نے سلامت علی کو بڑا بے عزت کیا تھا اور جہاں تک کہہ دیا تھا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم بڑے ہو کر ایسے نکلو گے تو میں بچپن میں ہی تمہارا گلا گھونٹ دیتا اور ہاں سر چوہدری امانت علی نے ایک بات اور بھی کی ہے وہ کہہ رہا تھا۔ گھوڑا جہانگیر کو واپس کر دیں''۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ گھوڑا ہم نے برآمد کروا لیا تھا لیکن گھوڑا ابھی جہانگیر کو مل نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی کیس عدالت میں جانا تھا۔ اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ باقی تو ساری گرہیں کھل گئی تھیں لیکن قاتل نہیں مل رہا تھا۔

اگلے دن مخبر چاچی خورشید نے مجھے حوصلہ افزا رپورٹ دی جو بالوں کے متعلق تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل توقیر خان اور سپاہی شرافت کو حکم دیا کہ وہ جا کر اسے لے آئیں۔

ایک گھنٹے بعد وہ میرے سامنے تھی۔ اس نے مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کیا اور قتل کا اقرار کر لیا۔ قارئین! پہلے میں قاتل کے چہرے سے نقاب اٹھا دوں۔ یہ جہانگیر کی بیوی جمیلہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے جو کہانی سنائی اس میں کافی باتیں آپ پڑھ چکے ہیں۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بی بی! یہاں تک تو میں سمجھ گیا ہوں کہ چوہدری سلامت علی تمہارے پیچھے پڑا ہوا تھا اور تم نے اس کی شکایت بڑے چوہدری امانت علی سے بھی کی تھی لیکن تمہارے ذہن میں اسے (سلامت علی) کو قتل کرنے کا خیال کیوں آیا؟''

''تھانیدار صاحب، رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے۔ منہ بولے رشتے بعض اوقات خون کے رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ سائیں نے ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ میری کوئی بہن نہیں، میں آپ کو اپنی بہن بنانا چاہتا ہوں لیکن آپ مالک، میں نوکر۔ شاید آپ کو یہ بات پسند نہ آئے''۔

میں نے اسے کہا۔ میں اس بات کی قائل نہیں، اصل چیز انسان کا اخلاق ہوتا ہے۔ آج سے تم میری بھائی اور میں تمہاری بہن۔

میں نے دیکھا کہ سائیں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ ہر جذبے کی زبان آنسو ہوتے ہیں۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے آپ کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ میں اس رشتے کی لاج رکھوں گا۔ میں نے اسے کہا تھا میں بھی تمہیں بہن بن کر دکھاؤں گی۔

جب گھوڑے کے ساتھ سائیں بھی غائب ہو گیا تو مجھے یقین کی حد تک شک ہوا کہ چوہدری سلامت علی نے وار کر دیا ہے۔ پھر اس نے مالٹوں والی بات سناتے ہوئے کہا۔ سائیں نے مجھے مالٹوں کا ٹوکرا اس کے منہ پر مار کر واپس آنے کے بعد کہا تھا کہ اگر سلامت علی زیادہ بکواس کرتا تو میں اس کا حشر نشر کر دیتا۔

میں نے اسے کہا تھا کہ کتا جب بھونک رہا ہو تو اسے زہر دینا چاہئے، اس کے گلے نہیں پڑنا چاہئے۔ میں نے کافی دن سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ مجھے سلامت علی کو ٹٹولنا چاہئے۔ یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ تو میرے کسی اشارے کا منتظر تھا۔ میں نے اسے پیغام بھجوایا کہ میں اسے رات کے اندھیرے میں ملنا چاہتی ہوں۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے واپس پیغام بھجوایا کہ آج رات ہی آ جاؤ، لائن کلیئر ملے گی۔ اس رات میرا خاوند گھر میں نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ آج رات ہی یہ معمہ حل کر لیا جائے۔ یہ تو آپ کو پتہ ہی ہو گا کہ چوہدریوں کا باغ ہمارے گھر کے قریب ہی ہے۔ میرا چوہدری کو اتنی عزت دینے کا کوئی اور ارادہ نہیں تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں اندر کی بات نکالنا چاہتی تھی۔ زہر کی پڑیا بھی میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بہرحال میں نے چوہدری سے کہا۔ دیکھو، میرا خاوند میری بالکل پروا نہیں کرتا، اسی لئے میں تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کا گھوڑا چوری ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ اپنے گھوڑے کی پروا اور ٹہل سیوا کرتا تھا۔ میں نے میز پر پڑی شراب کی بوتل سے ایک پیگ تیار کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ وہ بے وقوف میرے جھانسے میں آ گیا تھا اور حوا کی بیٹی اور انگور کی بیٹی سے بیک وقت لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اسے شیشے میں اتار کر ساری باتیں معلوم کر لیں۔ میرا شک ٹھیک نکلا تھا۔ اس نے گھوڑے کو چوری کروا کے سائیں کو مروا دیا تھا۔

آہ میرا بھائی۔ وہ سسک پڑی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنی حالت کو سنبھال لیا اور جوش سے بولی۔ وہ بہک چکا تھا، میں نے زہر کی پڑیا اگلے پیگ میں ڈال کر پیگ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ تم بہت اچھے ہو..... تم یہ پیگ ختم کرو۔ میں ابھی واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔ میں جان بوجھ کر دیر لگا کر آئی اور جب واپس آئی تو وہ بستر پر اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔ میرے خیال میں زہر نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دو ٹکڑے پیگ (وہ بھی خالص شراب کے) اس کے معدے میں اتر چکے تھے۔ میں نے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا، ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ تھانے دار صاحب! مجھے اپنے کئے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے''۔ چند لمحے اس نے دور خلا میں گھورا پھر بولی۔

''جونہی آپ کے بھیجے ہوئے اہلکار مجھے تھانے میں لے جانے کے لئے ہمارے گھر آئے، میں نے انہیں کہا کہ وہ تھوڑا انتظار کریں، میں ابھی ان کے ساتھ چلتی ہوں۔ میں صرف اپنے خاوند کو سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ میرا خاوند بھی باہر آیا ہوا ہے۔ آپ نے اسے پریشان نہیں کرنا۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے معافی مانگ لی ہے اور کہا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ تجھ جیسی بیوی قسمت والوں کو ملتی ہے..... اب دل و جان سے تمہارا بن کر رہوں گا لیکن میں نے اسے کہا ہے کہ، اب دیر ہو چکی ہے۔ تھانیدار صاحب! آپ ہی بتائیں کیا میں نے غلط کہا ہے؟''

اس کی آنکھوں میں جو سوال تھا۔ اس کا جواب نہ آج میرے پاس ہے اور نہ اس وقت تھا۔ قارئین! کیا آپ کے پاس کوئی جواب ہے؟

ایک تاثر ایک کہانی

شمسل چچا! دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کی زندگی میں خونِ آلود دن نہ آئے ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔

گئے دنوں کا سراغ

☆ منزہ نصیر

PakistanPoint.com

''ناستا استافون ...... رونیبی''۔ (اگلا سٹیشن ...... رونیبی)

ٹرین کے مائیک سے آواز ابھری۔ گو کہ زبان اجنبی تھی مگر فوزیہ عبدالرحمٰن نے جان لیا کہ منزل قریب ہے اور ایک طویل سفر کا اختتام ہوا چاہتا ہے۔ وہ جو سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے تھکی سی اونگھ رہی تھیں ایک دم ہوشیار ہو کر بیٹھ گئیں اور ٹرین کے شیشوں کے اس پار باہر کے مناظر کو دیکھنے لگیں۔ ریلوے لائن کے متوازی چلتی چوڑی سرمئی سڑک کے ساتھ ساتھ بلند و بالا پیڑ، اجلی ہریالی اوڑھے ایستادہ تھے جن کے عکس ساتھ ساتھ بہتی چھوٹی سی ندی کے پانیوں میں تصویر ہوئے جاتے تھے۔ یہ منظر اندر ہی اندر فوزیہ عبدالرحمٰن کے سینے کی گہرائی میں میٹھی سی بھرتا تھا۔

ٹرین رفتار کم کرتے کرتے ایک ہلکے سے جھٹکے سے رک گئی تھی۔ فوزیہ نے شال اچھی طرح لپیٹ لی، دستی سامان کندھے پر لٹکایا اور بھاری ٹرالی بیگ کھینچتے

ہوئے ٹرین سے باہر آ گئیں۔

صاف ستھرے پلیٹ فارم کے اس پار جہاں کوئی سوکھا تنکا یا آوارہ اڑتا ہوا کاغذ تک دکھائی نہ دیتا تھا، قدرے ڈھلوان سڑک کی اترائی میں وہ دونوں ایک بچہ گاڑی سنبھالتے ہوئے تیزی سے اترے چلے آتے تھے۔ فوزیہ عبدالرحمٰن نے لمحے کے ہزارویں حصے میں ان کو پہچان لیا۔ گویا کوئی برقی لہریں تھیں جو ان کے لوں لوں سے پھوٹی تھیں اور سڑک کی ڈھلوان اترتے نفوس سے جا ٹکرائی تھیں۔ وہ اپنا ٹرالی بیگ کھینچتے ہوئے تیزی سے ان کی جانب بڑھنے لگیں۔ پلیٹ فارم کے متوازی چلتی سڑک پار کر کے وہ بھاگتے ہوئے آ کر ان سے لپٹ گئے۔

''السلام علیکم اماں!'' ان کی سانسیں بے تحاشا پھولی ہوئی تھیں۔

''وعلیکم السلام!'' فوزیہ کی آواز پُرجوش خوشی سے لرزتی تھی۔ انہوں نے دونوں کو بانہوں کے حلقے میں لے کر باری باری پیار کیا پھر جھک کر بچہ گاڑی سے کمبل میں لپٹی گوری گوری گلابی سی حریم کو اٹھا کر بے تحاشا چومنے لگیں۔

''اللہ ... کتنی خوشی ہو رہی ہے اماں آپ کو یہاں دیکھ کر''۔ ان کی بیٹی ہانیہ خوشی سے سرشار ہوئی جاتی تھی۔ ''دیکھا ارسلان! میں نہ کہتی تھی کہ ہمیں کوئی مسئلہ ہو اور اماں موجود نہ ہوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھنا اب سب ٹھیک ہو جائے گا''۔ وہ ناز بھرے انداز میں ان کے شانے تھام کر جھولتی فخریہ انداز میں اپنے شوہر سے مخاطب تھی۔

''گھر تو پہنچ لینے دو آنٹی کو، اتنا تھک کر آئی ہیں اور تم ہو کہ ان کے کندھوں پر سوار ہوئی جاتی ہو''۔ ارسلان نے محبت بھرے انداز میں ڈانٹتے ہوئے دستی سامان کندھے پر ڈالا اور ٹرالی بیگ کھینچتے ہوئے گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

''ارسلان بیٹا! آپ کیسے ہیں؟''

''جی بالکل ٹھیک ہوں۔ آنٹی! آپ کہئے سفر کیسا رہا؟''

''سفر تو بے حد تھکا دینے والا تھا۔ سات گھنٹے جہاز اور تین گھنٹے ٹرین کا سفر بہرحال تھکا دیتا ہے اور ہاں، کل آپ کی مام آئی تھیں۔ یہ بیگ ان تحائف سے بھرا ہے جو انہوں نے تمہارے، ہانیہ اور اس ننھی سی گڑیا کے لئے بھجوائے ہیں''۔ انہوں نے محبت پاش نظروں سے بچہ گاڑی میں سوئی ہوئی حریم کو دیکھتے ہوئے ارسلان کے شانے سے لٹکے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا ہوا اماں! آپ آ گئیں۔ ورنہ یہ آپ کی گڑیا ہماری پڑھائی کا کباڑا کرنے جا رہی تھی۔ جب سے یہ صاحبہ تشریف لائی ہیں ہم میں سے ایک یونیورسٹی جاتا ہے اور ایک گھر پر ہوتا ہے۔ اب آپ تین ماہ ہمارے ساتھ رہیں گی اور ہم اپنا ماسٹرز مکمل کریں گے''۔ ہانیہ پھولی سانسوں کے ساتھ بے تحاشا بولے چلی جاتی تھی۔

شمالی سویڈن کا چھوٹا سا نیم پہاڑی سطح کا خوبصورت شہر رونیجی ناقابلِ یقین حد تک پُرسکون تھا۔ کراچی جیسے گنجان آبادی والے ہنگامہ پرور شہر میں مصروف زندگی گزارنے والی فوزیہ عبدالرحمٰن کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے فیکٹری میں کھٹا کھٹ چلتی مشینوں کی بجلی اچانک منقطع ہو جائے اور بندہ یکدم چھا جانے والی خاموشی میں مبہوت کھڑا رہ جائے۔ وہ ایک مصروف طرزِ زندگی کی عادی تھیں۔ کراچی میں تین سو بچوں پر مشتمل اپنا سکول چلا رہی تھیں۔ ہر روز صبح ہارن بجاتی بسوں، دھواں چھوڑتی گاڑیوں، شور مچاتے رکشوں اور ہر قاعدے قانون سے آزاد موٹر سائیکل سواروں کے بیچ سے گزر کر جگہ جگہ ٹریفک جام کا سامنا کرتے ہوئے دو

Pakistanipoint.com

گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد سکول پہنچنا۔ پھر دن بھر انتظامی امور سے الجھنا، ٹیچرز اور والدین کے ساتھ میٹنگز، مالی معاملات کی دیکھ بھال، سٹاف کی باہمی آویزش اور چپقلش کو چابکدستی سے ہینڈل کرنا، یہ سب دماغ کی چھاچھ بنا دینے کو کافی ہوتا۔ شام کو واپسی پر بھی یہی شور دھواں اور ٹریفک کا اژدہام ساتھ ساتھ چلے۔

یہاں کرنے کو کچھ خاص نہ تھا۔ دنیا کی شکل پچھلے چند سالوں میں جس تیزی سے بدلی تھی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے فاصلوں کو جس ڈھب سے سمیٹا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنا سکول چار ہزار میل دور سے بھی چلا رہی تھیں۔ روزانہ سٹاف کے ساتھ سکائپ پر میٹنگ ہو جاتی۔ وہ ضروری ہدایات جاری کرتیں۔ ارسلان اور ہانیہ کے یونیورسٹی جانے کے بعد اپارٹمنٹ کی معمولی صفائی کرتیں، کھانا بناتیں اور حریم کے معمول کے کام نمٹاتیں۔ دن بھر حرکت میں رہنے والی فوزیہ کے لئے یہ کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ اس خاموشی اور تنہائی نے ان کو دوبارہ اسی کیفیت میں لا پھینکا جس سے فرار کے لئے انہوں نے بے تحاشا مصروفیت کا حصار اپنے گرد قائم کیا تھا۔ شہر کی مرکزی شاہراہ کے ساتھ چلتی ندی کے پانیوں میں منعکس ہوتی ہریالی سینے میں مٹھی سی بھرتی تو وہ بھولے بسرے خوابیدہ مناظر میں ابھرنے ڈوبنے لگتیں۔ گنگناتی ندیوں کی ہریالی سرزمین، ایک خوفزدہ رات میں انگلیوں پر حرفِ عبادت گنتی بیبیاں، غضبناک چہرے، ہنگامہ، خون، چیخیں اور سب ختم۔ وہ چکراتے سر کو تھام کر رہ جاتیں۔ یہ کیا ہے میرے مالک؟ اگر یہ خواب ہے تو بھول کیوں نہیں جاتا اور اگر حقیقت ہے تو کھل کیوں نہیں جاتی؟

یہ حقیقت ان پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ بخار کی کیفیت میں دیکھے گئے خواب ایسے ان مناظر سے ماضی کا کوئی گوشہ ضرور جڑا ہے۔ وہ آغا جی اور بی جان کی لاڈلی بیٹی تھیں مگر یہ سچ ان سے کبھی نہ چھپایا گیا کہ وہ لے پالک تھیں۔ آغا جی اور بی جان جب اپنے ہاں پیدا ہونے والے مردہ بچوں کے لاشے دفنا دفنا کر تھک گئے تو ایک ادارے سے تین سالہ بچی کو گود لے کر اپنے بچوں کی محبتیں اس پر نچھاور کرنے لگے۔ محبتوں کی بارش میں بھیگتی فوزیہ ''کیسہ جاناں میں کون؟'' کی کیفیت سے کبھی نکل ہی نہ پائیں۔ شاید یہ المیہ تمام شناخت گم کردہ لوگوں پر گزرتا ہے۔ وہ آئینے میں گھنٹوں خود کو دیکھتی رہتیں اور اپنے خد و خال میں جانے کیا تلاش کرتیں؟ سیاہ بال اور گندم گوں رنگت تو اسی سرزمین کے باسیوں جیسے تھے مگر خواب منظروں میں دیکھی گئی دھرتی کے خد و خال مختلف تھے۔ رونیں جیسے خاموش شہر میں جہاں شاید ہی کبھی انہوں نے دو گاڑیوں کو آگے پیچھے جاتے دیکھا ہو۔ ان کا جی چاہتا کہ پیڑوں سے اپنا پتہ پوچھیں۔ خوب زور زور سے چلائیں کہ کیا تم مجھے جانتے ہو؟ کیا تمہیں میرا پتہ معلوم ہے؟ کیسہ جاناں میں کون؟ کیسہ جاناں میں کون؟ دماغ کے گنبد بے در میں یہ صدا یوں گونجتی جیسے خالی کمرے کے پکے فرش پر پیتل کا برتن گر کر دور تک لڑھکتا چلا جائے۔

سرکوئے ناشناساں دن سے رات کرتے کرتے بات کرنے کو بھی کوئی مل ہی گیا۔ یہ گراؤنڈ فلور پر رہنے والی بڑھیا اگنس تھی جس کو وہ اکثر کمپاؤنڈ میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا کرتیں۔ ایک بوڑھا مرد اس کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ ہوتا۔ پیاری رنگ کی سکوٹی پر ایک نوجوان لڑکی روز شام کو اس سے ملنے آتی۔ آج کل بوڑھا دکھائی نہ دیتا تھا، انہوں نے ہانیہ سے ذکر کیا۔

''یہ اگنس کا شوہر کہیں گیا ہوا ہے، آج کل؟''

''ارے میری بھولی اماں!'' ہانیہ حسبِ عادت

ان کے کندھے سے جھول گئی۔ ''وہ دوست ہے اس کا۔ شوہر نام کی مخلوق یہاں کم کم ہی پائی جاتی ہے۔ اور ہاں، بابے سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کل یونیورسٹی سے واپسی کے راستے میں، وہ بتا رہا تھا کہ آج کل ذرا زیادہ پینے لگا ہے تو اگنس نے اس کو آنے سے منع کر رکھا ہے۔ اس کی بیٹی ایملی جو سکوٹی پر آتی ہے وہ برا مانتی ہے''۔ ہانیہ نے تفصیل بتائی۔

اگلے روز ہانیہ نے یونیورسٹی جانے سے پہلے ایک فہرست ان کو تھما دی۔ ''اماں ذرا 'ولیز' (Willys) تک جائیے گا۔ یہ ساری چیزیں لے کر آنا ہے۔ گروسری تقریباً ختم ہے۔ ویسے بھی اب آپ شہر کے راستوں سے تو آشنا ہو ہی گئی ہیں''۔

''تمہارا شہر ہے ہی کتنا۔ تین منٹ کی پیدل مسافت پر ریلوے سٹیشن ہے۔ دس منٹ میں یونیورسٹی اور سات منٹ چہل قدمی میں سنٹرم (شہر کے مرکزی سکوائر) پہنچا جا سکتا ہے''۔

''درست کہا اماں!'' ہانیہ مسکرانے لگی۔

''اگر گاڑی ہو تو دس منٹ کی ڈرائیو میں شہر ختم ہو جاتا ہے اور فی الحال آپ کا طالب علم داماد اور بیٹی گاڑی افورڈ نہیں کر سکتے''۔

ارسلان اور ہانیہ کے جانے کے بعد انہوں نے معمول کے کام نمٹائے حریم کو اچھی طرح لپیٹ کر گود میں اٹھایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے لابی میں رکھی پرام میں لٹا دیا۔ پرام دھکیلتے ہوئے باہر نکلنے کو تھیں کہ اگنس بھی ایک پہیوں والا فولڈنگ تھیلا لئے آتی دکھائی دی۔

''ہائے! میں اگنس ہوں''۔ اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔

''میں فوزیہ ہوں''۔ انہوں نے اگنس کا جھریوں بھرا سفید ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''تم شاید ہانیہ کی ماں ہو؟''

''جی بالکل، آپ نے ٹھیک پہچانا''۔

''کہیں جا رہی ہو؟''

''ہاں، ولیز تک''۔

''میں بھی ادھر ہی جا رہی ہوں، کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں؟''

''ضرور، مجھے خوشی ہوگی''۔

یہاں کے لوگ جلد بے تکلف ہونے والے نہ تھے مگر اگنس کا رویہ حیرت انگیز حد تک دوستانہ تھا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئیں۔ اگنس نے ذرا جھک کر حریم کو پہنائے گئے ہاتھ سے بنے سویٹر کو چھوا۔

''یہ تم نے بنایا ہے؟'' تنہائی کی ماری بوڑھی عورت باتیں کرنے کے موڈ میں معلوم ہوتی تھی۔

''نہیں اس کی گرینی نے''۔

''تو کیا تم اس کی گرینی نہیں ہو؟''

''یہ ارسلان کی مام نے بنایا ہے۔ وہ بھی تو اس کی گرینی ہے''۔

''ہاں، یہ تو ہے''۔

گروسری سے فارغ ہو کر نکلیں تو کئی چھوٹے بڑے شاپنگ بیگ حریم کی پرام کے ساتھ لٹک رہے تھے۔ اگنس ان سے پہلے فارغ ہو کر بھرے ہوئے تھیلے کے ساتھ خارجی راستے پر کھڑی مل گئی۔

''اگر تمہیں کہیں اور نہیں جانا تو کچھ دیر کے لئے کہیں بیٹھتے ہیں۔ آج کا دھوپ بھرا روشن دن لطف اندوز ہونے کے لئے ہے''۔ وہ دونوں سنٹرم میں لگے فوارے کے قریب لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گئیں۔

''اگنس! تم اتنی اچھی انگریزی کیسے بول لیتی ہو؟'' انہوں نے اپنی حیرت اور تجسس کو زبان دی کیونکہ یہاں کے لوگ فرانسیسیوں اور جرمنوں کی طرح انگریزی سے نفرت تو نہ کرتے تھے مگر اچھی انگریزی

Pakistanipoint.com

بولنے والے بھی کم کم ہی تھے۔

"میرا بڑا لڑکا ہے نا مارٹن، اس کا باپ انگریز تھا، ہم دونوں چار سال تک ساتھ رہے۔ مارٹن ایک سال کا تھا تو اس کے باپ کو انگلستان کی یاد ستانے لگی اور وہ مجھے چھوڑ کر دفعان ہو گیا"۔ اگنس کے لہجے میں نفرت در آئی۔

"مارٹن کہاں ہے آج کل؟" انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا (کہیں ایسا نہ ہو کہ مارٹن بھی اس کو چھوڑ کر جا چکا ہو اور میرے پوچھنے پر مشتعل ہو کر اس کو بھی غائبانہ لعنت ملامت کرنے لگے) مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

"وہ شاک ہوم میں ہے۔ اکثر ملنے آتا ہے۔ بہت اچھا بچہ ہے"۔ اس کے چہرے کی جھریوں سے مامتا جھانکنے لگی۔

اکتوبر کی شروعات تھی اور موسم میں ٹھنڈک کی شدت بڑھ رہی تھی۔ اجلی چاندی سی دھوپ بھرے شفاف آسمان والے دن کم ہوتے جاتے اور اونچے پیڑوں کو کمر سے دہرا کرنے والی تیز سرد ہواؤں اور بادلوں بھرے آسمان والے نیم تاریک دنوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک دھوپ بھرے خوش گوار دن میں سنٹرل میں اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اگنس سے پوچھا تھا۔

"اِگنس! کیا یہ شہر صدیوں سے ایسا ہی پُرسکون ہے؟"

اگنس ہنسی اور دیر تک ہنستی رہی۔

"تم غالباً سکنڈے نیویا کی تاریخ سے واقف نہیں ہو ورنہ تمہیں رونیبی بلڈ باتھ کے بارے میں ضرور علم ہوتا"۔

"رونیبی بلڈ باتھ...... غسل خون؟ نہیں اگنس میں نہیں جانتی۔ پلیز مجھے اس بارے میں بتاؤ"۔

"وہ سامنے دیکھو ذرا"۔ فوزیہ نے اس کی نظروں

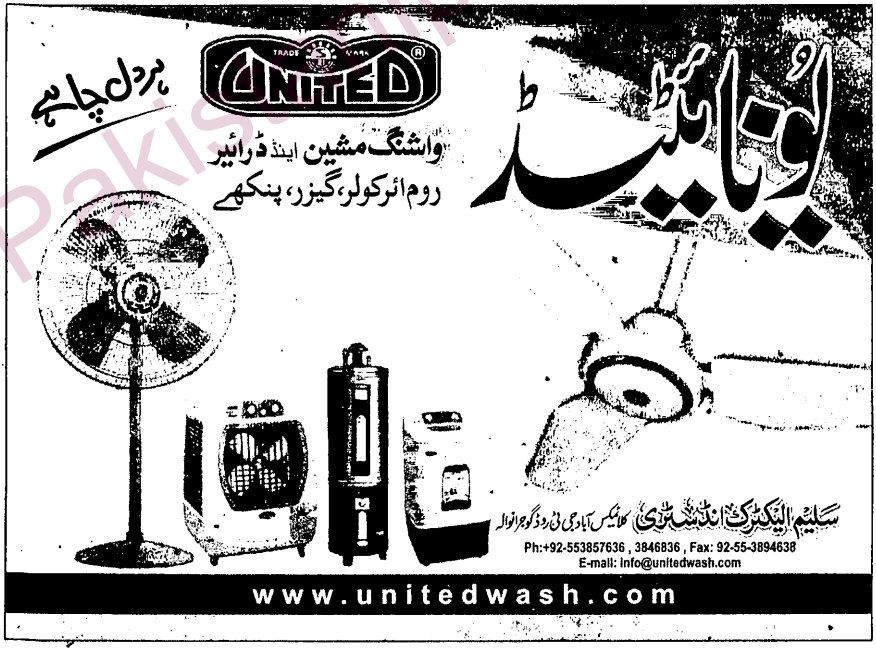

کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے بینک کی عمارت کے عقب میں واقعہ پہاڑی پر ایک سفید مینار راج ہنس کی مغرور گردن سا بلند ہوتا تھا۔

''یہ چرچ آف ہولی کراس ہے۔ سولہویں صدی کے اواخر میں جب یہ علاقہ ڈنمارک کا حصہ تھا یہاں سات سالہ طویل جنگ لڑی گئی تھی۔ سویڈش فوجوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ چرچ آف ہولی کراس میں پناہ لینے والے سینکڑوں لوگ بھی قتل کر دیئے گئے۔ چرچ کا ایک چوبی دروازہ جس پر کلہاڑوں کے نشانات ہیں، ابھی بھی یہاں محفوظ ہے۔ کیا تم دیکھنا چاہو گی فوزیہ؟''

''نہیں نہیں، میں نہیں دیکھنا چاہتی''۔ وہ خوفزدہ سی ہو کر بولیں۔ خواب منظر پھر سے ذہن کے پردے پر جھلملانے لگے تھے۔

''غلط کہتے ہیں لوگ کہ زیادہ خون ریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے۔ کیا یہ خوں ریزی مذہب کے نام پر ہوئی تھی؟'' انہوں نے تلخ ہو کر سوچا۔

''کیا لاکھوں افراد کو لقمہ اجل بنانے والی دو عالمی جنگیں مذہب کے نام پر لڑی گئی تھیں؟ کیا وسطی ایشیا سے آنے والے فاتحین مذہب کے نام پر برصغیر کو روندتے رہے؟ کیا یہ انسانی خون کا رنگ ہے جو رونیمی کے لالہ و گل میں نمایاں ہے؟ کیا تعمیر و ترقی کی جڑیں تباہی اور خوں ریزی سے پھوٹتی ہیں؟ جاپان کے ایٹم بموں سے جھلسے وجود سے ایک نیا جاپان جنم لیتا ہے اور صنعتی میدان میں بڑے بڑوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور انگلستان دو بڑی جنگوں میں بھوک ننگ اور جانوں کا زیاں سہنے کے بعد چند سالوں میں پہلے سے بہتر رنگ روپ پا لیتے ہیں۔

اگر ایسا ہے تو یہ کلیہ میرے وطن کی سرزمین پر لاگو کیوں نہ ہوا؟

1947ء کی خون آشام ہجرت سے لے کر لمحہ موجود تک کتنا خون دھرتی میں جذب ہو چکا ہے مگر وطن کے عارض بے رنگ گلنار نہ ہوئے۔

خیالوں کا ایک ریلا سا چلا آتا تھا جس میں وہ ابھرتی ڈوبتی تھیں۔

☆❀☆

ڈھلوان سڑک پر حریم کی پرام کو لشتم پشتم سنبھالتے ہوئے وہ خود کو کوس رہی تھیں۔ خواہ مخواہ سیدھا راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ لیا۔ اب بھگتو بی بی! انہوں نے خود کو ملامت کی۔ ایک جگہ جہاں سڑک نسبتاً ڈھلوان تھی، پرام نے رفتار پکڑ لی اور سنبھالتے سنبھالتے بھی آگے جاتے شخص کی ٹانگوں سے جا ٹکرائی۔ وہ لڑکھڑایا اور ریلنگ کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔

''اوہ..... معاف کیجئے گا، آپ ٹھیک تو ہیں، چوٹ تو نہیں آئی؟''

وہ جھریوں بھری گہری سانولی رنگت والا آدمی تھا، اس کی سفید بھوئیں موٹی موٹی آنکھوں پر جھک آئی تھیں۔ فوزیہ کو کوئی جواب دینے کے بجائے ایک ٹک دیکھے جاتا تھا۔

''ہائے اللہ کہیں سٹروک ہی نہ کر دیں بڑے میاں''۔ فوزیہ نے گھبرا کر سوچا۔ ''دیکھیں اگر آپ کو تکلیف ہے تو میں ایمبولینس کال کروں؟'' وہ پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

''آپ فکر نہ کریں لیڈی! میں بالکل ٹھیک ہوں''۔ بوڑھے نے ان کے چہرے پر نظریں جمائے جواب دیا۔

''بہتر..... اپنا خیال رکھئے گا!'' فوزیہ نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ سڑک کے آخری موڑ پر بنے پارک کی طرف مڑتے ہوئے انہوں نے دیکھا۔

Pakistanipoint.com

وہ بوڑھا ابھی تک وہیں کھڑا ان کو دیکھے جا تا تھا۔ فوزیہ کو الجھن سی ہونے لگی۔

پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ کر انہوں نے حریم کو پرام سے اٹھا کر گود میں لیا اور بیگ سے فیڈر نکال کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ چند منٹ میں فیڈر خالی ہو گیا۔ فوزیہ نے حریم کو کندھے سے لگا کر تھپکا اور ڈکار دلا کر پرام میں لٹا دیا۔

''لیڈی! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں''۔

فوزیہ بری طرح چونک گئیں۔ وہی بوڑھا ان کی پشت سے ہوتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''جی بیٹھئے پلیز!'' وہ پھر سے پریشان ہوا ٹھیں مگر خود کو کمپوز کرتے ہوئے ایک طرف کھسک کر جگہ بنائی۔

''آپ غالباً پاکستانی ہیں۔ کیا آپ اپنا نام بتانا پسند کریں گی؟'' بوڑھے نے دو سوال اکٹھے ہی لڑھکا دیئے۔

''جی یقیناً میں پاکستانی ہوں اور میرا نام فوزیہ عبدالرحمٰن ہے''۔ انہوں نے نہایت رسان سے دونوں سوالوں کے جواب دیئے۔

''میں شمس الہدیٰ ..... بنگلہ دیش سے آیا ہوں۔ میرا بیٹا یہاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اس کو ملنے اکثر آتا رہتا ہوں''۔ اس کی آنکھیں پھر سے فوزیہ کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

''اوہ ..... آپ ڈاکٹر منان کے والد ہیں؟''

''جی ہاں مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''میرے بچے یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ ان سے ذکر سنا ہے''۔ بوڑھے کی موٹی موٹی آنکھیں گویا فوزیہ کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ آخر مسئلہ کیا ہے بابے کو؟ انہوں نے قدرے الجھ کر سوچا اور کچھ برہم سے انداز میں بولیں۔

''میرا خیال ہے میری شکل آپ کے کسی جاننے والے سے ملتی ہے؟''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ میں کیسے بھول سکتا ہوں، اپنے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست حسن احمد اور اس کی بیوی نصرت آرا کو''۔ بوڑھا جیسے کہیں کھویا ہوا بول رہا تھا۔ ''حسن احمد کی کشادہ پیشانی اور خمدار بال اور نصرت آرا کی صبیح رنگت اور تیکھی ناک کو آپ کے چہرے پر یکجا دیکھ کر میں مبہوت ہو گیا تھا۔ آپ نے شاید برا مانا، معافی چاہتا ہوں''۔ فوزیہ کا دل جیسے حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ روئیں روئیں سے بے چینی لہریں لینے لگی۔

''کون تھے وہ لوگ، مجھے ان کے بارے میں بتائیں؟'' وہ بے قراری سے گویا ہوئیں۔ گویا جیسے لمحے کے ہزارویں حصے میں سب کچھ جان لینا چاہتی ہوں۔

''حسن احمد میرا طالب علمی کے زمانے کا دوست تھا''۔ شمس الہدیٰ یوں خلاؤں میں دیکھتا ہوا بولتا تھا جیسے ماضی کو ڈھونڈتا ہو۔

''لاہور سے تعلق رکھنے والا خوش اخلاق خوش شکل اور ذہین نوجوان، جس کی دوستی پر کوئی بھی فخر کر سکتا تھا۔ ہم دونوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کیا۔ سول سروسز کے امتحان میں کامیابی کے بعد اس کی تعیناتی مغربی پاکستان ہو گئی تھی۔ یوں بھی اس کی فیملی لاہور میں تھی۔ وہ چلا گیا مگر دلوں کے فاصلے کم نہ ہو سکے۔ ایک سال بعد اس کی شادی ہوئی تو میں شرکت کے لئے لاہور گیا تھا''۔

فوزیہ کا وجود سراپا سماعت تھا۔

''اور پھر ستمبر 1970ء میں اس کی تعیناتی ڈھاکہ میں کر دی گئی۔ وہ نصرت آرا اور ننھی گڑیا کے ساتھ ڈھاکہ چلا آیا۔ گو کہ حالات اچھے نہ تھے مگر وہ

ہمیشہ کی طرح پُر امید اور پُر عزم تھا''۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا میرے دوست!'' وہ اکثر کہا کرتا۔ ''بجا کہ ہماری جنت میں سانپ گھس آئے ہیں لیکن ہم ان سانپوں کو چن چن کر نکال باہر کریں گے''۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ سانپوں نے وہ بہروپ بھرے تھے کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ اپنے پرائے، دوست دشمن کی پہچان ختم ہو گئی تھی۔ ایسے میں مَیں اس کی اور اس کے خاندان کی سلامتی کے لئے فکرمند تھا۔ مجھے اِدھر اُدھر سے اطلاعات مل رہی تھیں کہ ان کو زندہ نہ جانے دیا جائے گا''۔ شمس الہدیٰ نے گہری سانس لی اور چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' فوزیہ کو لمحوں کی خاموشی بھی کھل رہی تھی۔

''پھر جو ہوا کاش نہ ہوا ہوتا''۔ اس کی آواز لرزنے لگی۔ ''مجھے سرکاری کام سے دو دن کے لئے سلہٹ جانا پڑا۔ دشمن موقع کی تاک میں تھے۔ حسن احمد کے گھر پر حملہ ہوا اور اس کو بیوی، والدہ اور دو نوعمر ملازماؤں سمیت درندگی کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو کچھ نہ بچا تھا۔ بھوکی پیاسی خوف زدہ گڑیا ایک الماری کے پیچھے چھپی ہوئی مل گئی۔ خوف اور صدمے نے اس کو گنگ کر ڈالا تھا۔ وہ ہر دم مسکرانے والی ایک گڑیا تھی۔ جب کبھی میں اس کی پسند کا تحفہ نہ لے جاتا تو منہ پھلا کر کہتی۔ ''شمسل چاچا! گڑیا آپ سے ناراض ہے''۔ اب وہ بولتی ہی نہ تھی۔ خالی ویران آنکھوں سے ایک ٹک مجھے دیکھے جاتی تھی جیسے کہتی ہو۔ ''شمسل چاچا! گڑیا آپ سے ناراض ہے''۔ شمس الہدیٰ خاموش ہو کر پھر سے فضا میں گھورنے لگا گویا گئے لمحوں کو ڈھونڈتا ہو۔

''گڑیا کا کیا ہوا پھر؟'' فوزیہ نے تیز تیز چلتی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

''میاں بیوی اور چھ بچوں پر مشتمل ایک خاندان نیپال کے راستے کراچی جا رہا تھا۔ میں نے ان کو منت سماجت سے راضی کر لیا کہ گڑیا کو ساتھ لے جائیں اور لاہور میں اس کے عزیزوں کو تلاش کر کے ان کے حوالے کر دیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے گڑیا کے خاندان کا پتہ لگانے کی زحمت ہی نہ کی تھی اور اسے کراچی میں ہی لاوارث بچوں کے کسی ادارے کے حوالے کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہو گی۔ شاید وہ آپ جیسی ہو، آپ کی عمر کی ہو اور اب تک مجھ سے ناراض ہو''۔ شمس الہدیٰ اٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔

ہواؤں میں ایک دم تندی اور جما دینے والی ٹھنڈک در آئی تھی۔ گہرے بادلوں نے ماحول کو تاریک کر دیا تھا۔ سحر زدہ کیفیت میں بیٹھی ہوئی فوزیہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگیں۔ گئے دنوں کا سراغ لانے والا مانوس اجنبی سڑک پر شکستہ چال چلا جاتا تھا۔

''شمسل چچا! گڑیا آپ سے ناراض نہیں ہے''۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے زور سے بولیں۔

شمس الہدیٰ کے قدم تھم گئے۔ وہ انہی قدموں پر تیزی سے مڑا، فوزیہ بھاگتے ہوئے اس سے لپٹ گئیں۔

''شمسل چچا! دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کی زندگی میں خون آلود دن نہ آئے ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری شناخت کا معمہ حل کر دیا''۔ وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہے جا رہی تھیں اور بوڑھا شمس الہدیٰ ان کو سینے سے لگائے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا تھا۔

Pakistanipoint.com

ناقابلِ فراموش

یہ ایک معصوم بچی کا سچا واقعہ ہے۔ صرف کردار اور مقامات تبدیل کئے گئے ہیں۔

انڈمان

☆اختر شاہ عارف
0333-5882780
جہلم شہر

گاؤں میں فوجی گاڑی کے رکتے ہی ایک ہلچل سی مچ گئی۔ بچے اور بوڑھے جوق در جوق وہاں جمع ہونے لگے۔ گاؤں کی الہڑ اور معصوم دوشیزائیں کواڑوں کی اوٹ اور چھتوں کی منڈیر سے قوم کے محافظوں اور وطن کے نگہبانوں کو دیکھنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے جوان اپنے اپنے کام چھوڑ کر وہاں آ کھڑے ہوئے اور فوجی جوانوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگے جن کے تنومند جسموں کی پھرتی تیزی سے دھرتی کا سینہ چیر رہی تھی۔ بوڑھے لوگ حقے کی نے منہ میں دیئے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے مگر وہ فوجی گرد و پیش سے بے نیاز تیزی سے مورچے کھود رہے تھے۔ کیپٹن اصغر شاہ ایک جانب کھڑے اپنے جوانوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک مجمعے سے ایک سات سالہ بچی تیر کی طرح کیپٹن اصغر شاہ کی طرف لپکی۔

''ابو میرے اچھے ابو!'' یہ کہتے ہوئے بچی اُن کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ کیپٹن اصغر شاہ نے بھی چونک کر بچی کی طرف دیکھا جو اب ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

عین اسی وقت ایک بڑھیا لوگوں کا حلقہ چیرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی اور آنسو پونچھتے ہوئے بچی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میری لاڈلی! یہ تمہارے ابو نہیں ہیں''۔

''تو پھر بتایئے دادی اماں! میرے ابو کہاں ہیں، وہ میرے پاس کیوں نہیں آتے، وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر پیار کیوں نہیں کرتے؟ نہیں نہیں..... دادی اماں! آپ جھوٹ بولتی ہیں، یہی میرے ابو ہیں''۔ پھر وہ اصغر شاہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ ہی کہہ دیجئے

کہ آپ میرے ابو ہیں۔ دیکھئے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں''۔ یہ کہہ کر اس بچی نے کیپٹن اصغر شاہ کے سامنے اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ دیئے۔

کیپٹن اصغر شاہ نے بچی کی طرف دیکھا جو التجا بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کا دل تڑپ اٹھا۔ ان کے دل سے پیار اور شفقت کا سوتا پھوٹ پڑا۔ کچھ دیر کے لئے وہ بھول گئے کہ ان کی شناخت کیا ہے۔ انہوں نے دوبارہ بچی کی طرف محبت اور شفقت سے دیکھا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ ''ہاں میری بیٹی، میری لاڈلی! میں ہی تمہارا ابو ہوں''۔

گاؤں کے لوگ دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور بڑھیا جسے بچی نے دادی اماں کہہ کر مخاطب کیا تھا، ایک جانب کھڑی چادر کے پلو سے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں کو صاف کر رہی تھی۔

''آپ میرے ابو ہیں نا!'' اس بچی نے دوبارہ تصدیق کرنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں میری بچی! میں تمہارا ابو ہوں''۔ کیپٹن اسے سینے سے بھینچتے ہوئے بولے۔

''میرے ابو آ گئے، میرے ابو آ گئے، اب ہم ابو سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کریں گے''۔ وہ بچی فرطِ خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ''ابو اب تو آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے نا؟'' وہ بچی کیپٹن اصغر شاہ کا چہرہ اپنے ننھے منے ہاتھوں میں تھام کر ان کے داہنے رخسار پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

''نہیں بیٹے!'' کیپٹن اصغر شاہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''تو چلئے ابو گھر چلیں''۔ وہ بچی جس کا نام صاعقہ تھا، کیپٹن اصغر شاہ کے بازوؤں سے اترتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''چلئے دادی اماں! دیکھئے ابو کتنے عرصے بعد آئے ہیں''۔

کیپٹن اصغر شاہ ان فوجیوں میں سے تھے جن کے عزم سے دنیا کے نقشے بدلتے ہیں، جن کے خون سے قوموں کی تاریخیں جنم لیتی ہیں۔ ان کا اس طرح کسی اجنبی کے گھر چلے جانا خلافِ مصلحت تھا مگر کیپٹن اصغر شاہ تمام خدشات کو ذہن سے جھٹک کر معصوم صاعقہ کی خوشیوں کی خاطر ایک اجنبی اور ناواقف بڑھیا کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

''لیفٹیننٹ سبطین علی!'' وہ اپنے ایک ماتحت سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''میں کچھ دیر کے لئے جا رہا ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں کے کام کا جائزہ لیتے رہنا''۔ لیفٹیننٹ سبطین علی نے تعظیماً انہیں سلیوٹ کیا اور اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو گئے جو کیپٹن اصغر شاہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے کبھی کیپٹن کو خلافِ اصول کوئی عمل کرتے نہیں دیکھا تھا۔

کیپٹن اصغر شاہ کا پورا نام سیّد اصغر علی شاہ تھا۔ وہ ایک سفید پوش اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بھی سابقہ فوجی تھے۔ 1964ء میں جب ان کے والد اپنی فوجی ملازمت مکمل کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے تو انہیں ایک کثیر رقم ملی۔ دولت کی چمک تو ویسے بھی کافی دلفریب ہوتی ہے۔ اس لئے دور و نزدیک کے تمام رشتہ دار بھوکے گدھوں کی طرح ان کے گرد منڈلانے لگے۔ مصنوعی خلوص اور جھوٹی رشتے داری کی آڑ لے کر آہستہ آہستہ نزدیک سے نزدیک تر ہونے لگے۔ کیپٹن اصغر شاہ کے والد جن کا نام سیّد صفدر علی شاہ تھا۔ بچپن میں ہی والدین اور بہن بھائی فوت ہو جانے کے سبب شفقت و محبت کو ترس رہے تھے۔ انہوں نے جو اچانک رشتہ داروں کا بے پناہ خلوص دیکھا تو ان کی چالوں کو نہ سمجھ سکے۔ یہ جعلساز رشتے دار

Pakistanipoint.com

خلوص کی آڑ لے کر ان کی دولت کا استحصال کرنے لگے۔ جب رقم ختم ہوگئی تو یہ رشتے دار بھی دور ہٹ گئے۔

صفدر شاہ یہ برداشت نہ کر سکے۔ اپنے خلوص کی دھجیاں اُڑتے دیکھ کر ممکن تھا کہ وہ غصے میں کوئی انتقامی کارروائی کر بیٹھتے مگر ان کی بیگم فاخرہ سلطانہ نے انہیں حوصلہ دیا۔ فاخرہ سلطانہ ایک اعلیٰ راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ بڑی ہمت اور پامردی سے ہر مشکل کا مقابلہ کرنے لگیں۔ انہوں نے اولاد کی خاطر ہر دکھ اٹھایا اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ خود بھوکا رہ کر اپنے خون سے سینچے ہوئے ننھے منے پودوں کو پروان چڑھایا اور پھر یہ صبر آزما دور بیت گیا۔ ریاست بھمبر کے سابقہ وارث کی نور چشم یہ باہمت خاتون مصائب سے جیت گئی۔ وہ اور اس کے مجازی خدا اپنی اولاد کو جوان اور برسرروزگار دیکھ کر اپنے گزشتہ دنوں کے دکھ بھول گئے۔ دولت ایک دفعہ پھر ان کے گھر قدم جمانے لگی اور رشتے دار ایک دفعہ پھر ارد گرد منڈلانے لگے لیکن صفدر شاہ اپنے رشتہ داروں سے اس قدر دل برداشتہ تھے کہ انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے سید اصغر علی شاہ کا رشتہ لاہور کے ایک غیر لیکن معزز سادات خاندان میں کر دیا۔ جب ان کا بیٹا کمیشن لے کر کیپٹن بن گیا تو اس کی شادی بھی کر دی۔ ایک سال کے بعد سید اصغر علی شاہ ایک بیٹی کے باپ بن گئے۔ جس کا نام عالیہ رکھا گیا۔ یوں تو کیپٹن اصغر شاہ اپنی بیوی ریحانہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے مگر جب عالیہ پیدا ہوئی تو ان کی محبت دو چند ہوگئی۔ محبت اور پیار کا یہ ورثہ ننھی منی عالیہ کے سینے میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے والد کیپٹن اصغر شاہ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔

اس وقت بھی جب وہ صاعقہ اور بڑھیا کے ساتھ چل رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں اپنی بیٹی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

وہ ایک کشادہ سا مکان تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور صحن میں سفید چادر والے اجلے بستر پر کیپٹن اصغر شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ننھی صاعقہ ان کی آغوش میں بیٹھی ان کے کندھوں پر لگے سٹارز سے کھیل رہی تھی۔ قریب ہی ایک مونڈھا رکھا تھا جس پر بڑھیا بیٹھی ہوئی کیپٹن اصغر سے محو گفتگو تھی۔

''ہاں تو بیٹے!'' بڑھیا کیپٹن کے ہاتھ سے دودھ کا خالی گلاس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں معذرت خواہ ہوں کہ میری بچی کی خاطر تمہیں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔ دراصل بچی ہے نا، مجھ جیسی عمر رسیدہ ہوتی تو شاید یہ بھی غم کا زخم سینے میں چھپا کر زندگی کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے چپ چاپ ایک خاموش شمع کی مانند جلتی رہتی''۔

''ماں جی!'' کیپٹن اصغر شاہ بڑھیا سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''ماں! میں آپ کے لئے اجنبی ہوں اس لئے مجھے یہ کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے نجی حالات جاننے کی کوشش کروں۔ پھر بھی میں بحیثیت ایک انسان آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے ان دکھوں کے بارے میں بتائیں جو آپ کے سینے میں ناسور بن کر پل رہے ہیں۔ آپ اس تشنگی کو فاش کرنے کی کوشش کریں جو ننھی منی صاعقہ کی آنکھوں میں آنسو بن کر تیر رہی ہے۔ آپ غموں کے ان اندھیاروں کو اجاگر کرنے کی زحمت کریں جنہوں نے مجھ جیسے اجنبی کو یہاں تک پہنچایا ہے۔ آپ اپنے ان زخموں کو کرید کر اس فاسد لہو کو بہہ جانے دیجئے جو آپ کو گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے''۔

بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اپنی کہانی سنانے لگی۔ ''بیٹے! وہ سردیوں کی ایک سیاہ اور خوفناک رات

تھی۔ چیختی اور چنگھاڑتی ہوئی ہوا کسی بدروح کی مانند کسی انجانے غم پر نوحہ خواں تھی۔ بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک دل کو دہلائے دیتی تھی۔ ایسے خوفناک ماحول میں میرا بیٹا حسن اختر اپنے جسم پر وردی اور ہتھیار سجائے مجھ سے محاذِ جنگ پر جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ مجھے اس کے الفاظ آج بھی یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''اماں! مجھے اجازت دو۔ میرا وطن مجھے پکار رہا ہے۔ میرے وطن پر نازک وقت آ پہنچا ہے۔ قوم مجھے پکار رہی ہے۔ بہنوں کے آنچل مجھے بلا رہے ہیں، بچوں کی چیخیں، ضعیفوں کی آہیں اور سسکیاں مجھ سے اپنی حفاظت کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ماں تمہارا بیٹا قوم کی امانت ہے۔ اس کا لہو وطن کے لئے ہے۔ کیونکہ تمہارا بیٹا ایک فوجی ہے''۔ چہرے پر ایک پُروقار سا جلال تھا۔

''میرے لختِ جگر!'' میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ''جا میں نے تجھے خدا کے سپرد کیا۔ تُو وطن اور قوم کی امانت ہے۔ تیرا وجود اس ارضِ وطن کی حفاظت کے لئے ہے۔ جا دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو جا اور انہیں بتا دے کہ وطن کی محبت کے متوالوں کی مائیں انہیں جنم دیتے ہی حب وطن کی لوریاں سنایا کرتی ہیں۔ ان کی پرورش بندوقوں کے سائے میں ہوتی ہے لیکن خبردار! میدانِ جنگ میں صرف سینے پر ہی زخم کھانا۔ اگر تم نے پیٹھ دکھائی تو میں تمہیں کبھی بھی اپنا دودھ نہیں بخشوں گی''۔ مجھ سے ملنے کے بعد اس نے اپنی سوئی ہوئی بیٹی صاعقہ کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیتے ہوئے دوبارہ پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر قریب کھڑی ہوئی اپنی بیوی صبیحہ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لرز گیا۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھتے رہے پھر اچانک وہ تیزی سے پلٹا اور بھاگتا ہوا باہر کھڑی سرکاری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور کچھ دیر بعد جب میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو گاڑی رات کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔ دور اس کی عقبی روشنیاں اندھیرے میں جگنو کی مانند چمک رہی تھیں۔

دن گزرتے رہے۔ میں حسن اختر کی واپسی کی دعا مانگتی رہی۔ صاعقہ جو اپنے ابو سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی تھی، وہ بھی اپنی توتلی زبان میں حسن اختر کی واپسی اور حفاظت کی دعائیں مانگتی رہی لیکن یہ سب کچھ اکارت گیا۔ ایک دن صبح ہی صبح محاذ جنگ سے خبر ملی کہ میرا لاڈلا، صاعقہ کا پیارا ابو اور صبیحہ کا سہاگ وطن پر قربان ہو گیا۔ میں تو خیر کسی نہ کسی طرح یہ خبر برداشت کر گئی مگر صبیحہ برداشت نہ کر سکی اور صرف دو ہی دن کے بعد وہ اپنے سہاگ کے پاس چلی گئی۔

یہ دوسرا مہلک زخم تھا جو مجھے لگا تھا اور شاید میں اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکتی مگر مجھے اپنی پوتی صاعقہ کے لئے جینا پڑا جو آج بھی کسی باوردی فوجی کو دیکھ کر ابو ابو کہہ کر اس سے لپٹ جاتی ہے''۔

بوڑھی عورت اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئی تھی۔ کیپٹن اصغر شاہ کی آنکھوں سے آنسو گر کر صاعقہ کے بالوں کو بھگو رہے تھے جو ان کی آغوش میں ہی ایک پُرسکون اور میٹھی نیند سو رہی تھی۔

''ماں جی!'' کیپٹن اصغر شاہ بڑھیا سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''آپ اور صاعقہ کی طرح ہم بھی محبت اور پیار کے بھوکے ہیں۔ آج سے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد جب میں یہاں سے دوبارہ گزروں گا تو آپ تیار رہئے گا۔ میں آپ کو اپنے ساتھ گھر لے چلوں گا۔ یقین کریں میری امی آپ کو ایک بہن کی محبت، میرے ابو آپ کو ایک بھائی کی شفقت اور میری بیگم ریحانہ آپ

Pakistanipoint.com

کو ایک بہو کا پیار اور میں آپ کو ایک بیٹے کی فرمانبرداری دوں گا۔ ننھی صاعقہ عالیہ کے بعد میری دوسری بچی ہے۔ یہ بھی اپنے باپ کی محبت کی پیاس پوری کر لے گی۔ اچھا اب رات بیت چلی ہے، مجھے اجازت دیجئے اور ایک ہفتے کے بعد تیار رہئے گا''۔ یہ کہہ کر انہوں نے سوئی ہوئی صاعقہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ چاندنی میں اس کے چہرے پر ایک ابدی اور فرشتوں جیسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کیپٹن اصغر شاہ نے صاعقہ کے رخسار پر بوسہ دیا اور اسے چارپائی پر لٹا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ تقریباً تین بجے کا عمل ہو گا جب اچانک بادل گھر کر آئے۔ چاند بدلیوں کی آغوش میں چھپ گیا۔

اچانک بجلی چمکی اور سارا ماحول ایک لمحے کے لئے روشن ہو گیا۔ مسلح سپاہی نے جس کی نظریں عقاب کی طرح رات کے اندھیرے میں بھی چاروں طرف گردش کر رہی تھیں، ایک سائے کی جھلک دیکھی جو لاپروائی کے ساتھ کیمپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ سایہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا، تاہم پہرے دار نے سٹین گن شانے سے اتاری اور پھرتی سے سائے کی طرف تانتے ہوئے زور سے چیخا۔

''ہالٹ! کون ہو تم؟'' پہریدار کی آواز سنتے ہی سایہ تیزی سے بھاگ اٹھا۔ سپاہی دوبارہ گرجا۔ ''میں کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ شوٹ کر دوں گا''۔ سایہ اور تیزی سے بھاگنے لگا اور پھر اچانک سارا ماحول سٹین گن کے قہقہے سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی سائے کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ گونج اٹھی اور وہ سایہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ فائر کی آواز سنتے ہی کیپٹن اصغر شاہ دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے ساتھی بھی تھے۔ اس دوران سارا کیمپ سرچ لائٹس سے منور ہو گیا تھا۔ سب دوڑتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں زمین پر ایک ننھا منا سا سات سالہ جسم عالم نزع میں تھا۔

''صاعقہ!'' کیپٹن اصغر شاہ دیوانوں کی طرح آگے بڑھے۔

''اب..... بو!'' صاعقہ نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ گویا وہ ابھی ہمک کر گود میں آ بیٹھے گی۔

''میری بچی..... میری صاعقہ!'' کیپٹن اصغر شاہ نے دیوانہ وار صاعقہ کا معصوم سا جسم اٹھایا اور بے تابی سے اس کے رخسار چومنے لگے۔

''اب ..... بو'' صاعقہ مارے نقاہت کے ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ..... پہلے بھی..... ایک دفعہ مجھے سوتا چھوڑ..... گئے تھے..... اور..... اور..... مگر میں نے..... آپ کو..... ڈھونڈ لیا..... ابو..... اب..... بو..... اور.....'' یہ کہتے ہوئے صاعقہ نے کیپٹن اصغر شاہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں مگر دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ مر چکی تھی۔

بعد میں جب کیپٹن اصغر شاہ نے پہرے پر موجود جوان سے پوچھا کہ اس کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ وہ کسی چھوٹی بچی کو نشانہ بنا رہا ہے۔ تو اس جوان نے آنسو بھری آنکھیں پونچھتے ہوئے بتایا کہ گہرے اندھیرے میں اسے صرف سایہ ہی نظر آ رہا تھا اور رات کے اس پہر وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آرمی کیمپ میں کوئی بچی آ سکتی ہے۔

کیپٹن اصغر شاہ دونوں ہاتھوں پر معصوم لاش اٹھائے تھکے تھکے قدموں سے اپنے کیمپ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ صاعقہ کے چہرے پر ابدی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بے چاری کلی وقت سے پہلے مرجھا گئی تھی۔

Pakistanipoint.com

مہربان کیسے کیسے

شرافت ضیاء- اسلام آباد

محترم شرافت ضیاء کی منظومات تسلسل سے ''حکایت'' میں چھپ رہی ہیں۔ شگفتہ پیرائے میں لکھی گئی ان کی غزلوں، نظموں میں طنز کی نشتر زنی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر نظم بھی یہی تاثر اجاگر کر رہی ہے۔ (ادارہ)

ہمارے مہرباں دولت کے گو انبار رکھتے ہیں
سواری کے لئے ٹم ٹم نہ موٹر کار رکھتے ہیں

کتابِ زندگی ان کی کھلی ہے سامنے سب کے
مگر پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ پسِ دیوار رکھتے ہیں

خیالِ خاطرِ احباب رہتا ہے انہیں ہر دم
وہ اپنا دل شناسائے مزاجِ یار رکھتے ہیں

اگرچہ دیس کی مٹی سے بے حد پیار ہے ان کو
اثاثے اربوں کھربوں کے سمندر پار رکھتے ہیں

رقیبوں کو یہی غم ہے کہ ان جیسا زمانے میں
کوئی چلتا ہوا بزنس نہ کاروبار رکھتے ہیں

کہیں سے سنگِ پارس ہاتھ لگ جائے زہے قسمت
جسے پانے کو مدت سے دلِ بیمار رکھتے ہیں

ضیاؔء اہلِ دول سے تو وہی مسکین اچھے ہیں
جو نوٹوں کی بجائے جیب میں نسوار رکھتے ہیں

Pakistanipoint.com

مکافاتِ عمل

فتو غلامے کا بھانجا تمہاری بیٹی کو ورغلا چکا ہے اور کسی بھی دن وہ اس کو بھگا لے جائے گا..... چوہدری! تمہاری غیرت کہاں مرگئی ہے؟

بیوہ کی بددعا اور پھانسی کا پھندہ

(ماہِ دسمبر سے پیوستہ)

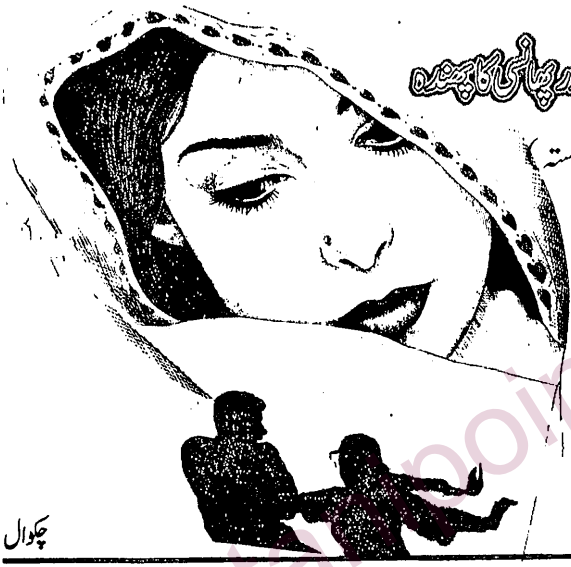

☆ حکیم مختار احمد ناز
چکوال

کسی کو قتل کر دینا تو شاید آسان ہے لیکن قتل کو چھپانا انتہائی مشکل ہے۔ کہتے ہیں لہو بولتا ہے چاہے برسوں بھی گزر جائیں آخر ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے۔ خواتین کے کانوں میں اگر کسی بات کی ذرہ بھر بھی بھنک پڑ جائے تو شام تک بات گھر سے نکل کر محلے میں اور پھر پورے گاؤں تک پھیل جاتی ہے۔

فتو کے قتل کے سلسلے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ فتو کے قتل کے کئی سال بعد ایک رات دونوں بھائی چوہدری کرم دین اور چوہدری نظام دین اپنی بیٹھک میں بیٹھے گپیں لگا رہے تھے کہ باتوں باتوں میں فتو کا ذکر آ گیا۔

''کیسے طریقے سے ٹھکانے لگوایا تھا کہ کئی سال گزر گئے ہیں کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا۔ اسے کہتے ہیں سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کیوں نظامو!'' کرم دین نے نظام کے شانے پر زوردار تھاپڑا مارتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

''وہ نیچ کمینہ حرام موت مرا''۔ نظام دین نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ذات کی کوڑھ کرلی اور شہتیروں کو چھے!''

کرم دین کی بیوی باہر صحن میں چمٹے سے چلم میں گڑوالے تمباکو پر آگ کے دہکتے کوئلے ڈال رہی تھی۔ اپنے خاوند کرم دین کی بات اس نے سن لی تھی۔ پھر بات نکلتے نکلتے ہر طرف پھیل گئی۔ چند روز تو چہ میگوئیاں رہیں پھر آہستہ آہستہ دب گئیں۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ فتو کا ننھیال میں آنا جانا

زیادہ تھا۔ اس کے دونوں ماموں اور نانا بھی اس کو بہت پیار محبت دیتے تھے۔ وہ بھی ان کو جی جان سے چاہتا تھا اور کئی کئی ہفتے ان کے پاس رہتا تھا اور ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ جب وہاں ہوتا تو نانا اور ماموں کو کھیتوں میں کھانا دینے وہ ہی جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اکثر کسان کھیتوں میں کھاتے تھے۔ اُس موجودہ دور میں کاشتکاری اور زمین داری کے کام بہت آسان ہو چکے۔ مشینوں کے آ جانے سے فصلیں چند دنوں میں گھر آ جاتی ہیں۔ اس دور میں لوگ سحری کو اٹھ جاتے تھے۔ بیلوں کو جوت کر دوپہر اور سہ پہر تک ہل چلاتے تھے۔ فتو کے ننھیال کی وراثتی زمین تو نہ تھی البتہ انہوں نے چند ایکڑ زمین خرید رکھی تھی۔ فتو کھانا کھیتوں میں لے کر جاتا تو اس کا ماموں اور نانا کھانا کھانے بیٹھنے سے پہلے اپنی اپنی ہل بیلوں کے پیچھے سے نکال کر فتو کو دیتے کہ جاؤ ان مویشیوں کو پانی پلا لاؤ۔ اتنے میں ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔

اس تالاب پر دور نزدیک سے کافی لوگ ڈھور ڈنگروں کو لے کر آتے تھے۔ خواتین بھی اپنے مردوں کو کھانا دے کر ڈھور ڈنگروں کو لے کر تالاب پر آ جاتی تھیں۔ ان میں نظام دین کی بیٹی بھی چچا اور باپ کو کھانا دے کر مویشیوں کو ہانکتی ہوئی تالاب پر آ جاتی۔ نام تو زرینہ تھا لیکن سب لاڈ پیار سے جینو بلاتے تھے۔ کرم دین بڑا تھا لیکن اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ کئی سال ہوئے شادی کو لیکن وہ اولاد کی نعمت سے مرحوم تھا۔ اس کی اولاد اب نظام دین کی بیٹی جینو اور دونوں بیٹے تھے۔ نظام دین اور اس کی بیوی والدین سے بڑھ کر انہیں چاہتے تھے اور وہ بھی ہر پل چچا چچی کا خیال رکھتے تھے۔ ان کو احساس ہی نہ ہونے دیتے کہ ان کی اولاد نہیں ہے۔ جینو کا بڑا بھائی دو سال قبل ہی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ ایک بھائی جینو سے تین سال چھوٹا تھا۔

کھیتوں میں والد اور چچا کو کھانا دینے عام طور پر جینو ہی جاتی تھی کیونکہ گھر کی خواتین کھانا پکا کر مویشیوں کے لئے چارے کے اہتمام میں لگ جاتی تھیں۔ ابا اور چچا کھانا کھاتے اور جینو مویشیوں کو پانی پلانے تالاب پر لے جاتی تھی۔

فتو نے سرِ راہ تو کئی بار جینو کو دیکھ رکھا تھا لیکن نظر بھر کر دیکھنے کا آج پہلا موقع تھا۔ پھر وہ دیکھتا ہی رہ گیا، اس کا حسین سراپا فتو کی آنکھوں سے ہوتا ہوا اس کے دل میں اتر گیا۔

فتو کے نظر بھر کر دیکھنے پر جینو نے قہر آلود نظر سے فتو کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی بیسیوں میں ایک تھا۔ اگر کسی کو کہا جاتا کہ بتاؤ فتو اور جینو میں سے زیادہ خوبصورت کون ہے تو شاید فیصلہ کرنے والا کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ کر پاتا۔ ابھی آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو جانچا جا رہا تھا کہ جینو کی جُتی ہوئی جوک (ایک لکڑی کی سیڑھی نما پنجالی میں دو جانوروں کو ہل چلانے کے لئے جوتا جاتا تھا) میں جینو کے ایک بیل کو کسی دوسرے کے بیل نے ٹکر دے ماری۔ ٹکر لگنے سے پنجالی ٹوٹ گئی اور جوتا ہوا بیل بھی باہر آ گیا اور دونوں نے لڑائی کے لئے سینگ جوڑ لئے اور ایک دوسرے کو پانی میں ہی دھکیلنے لگے۔ جینو والا بیل قدرے کمزور تھا۔ تھوڑی دیر زور آزمائی کرنے کے بعد بھاگ اٹھا۔ جینو بھی پیچھے دوڑ پڑی۔ وہ بیل فتو کے جانوروں میں آ گھسا فتو نے پھرتی سے اس کی رسی پکڑ لی جینو بھی قریب پہنچ گئی تھی۔ فتو رسّی اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جمائے ہوئے تھا۔ رسّی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے جینو کے نازک ہاتھ سے فتو کا ہاتھ مس ہوا تو فتو کے سر تا پاؤں میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہاتھ کا لمس فتو کا دل بھی ساتھ ہی لے گیا تھا۔ فتو رسّی پکڑاتے ہوئے کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن اس

کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ دوسری طرف بھی شاید یہی کیفیت تھی۔

مویشیوں کو واپس لا کر فتو نے گھر کی راہ لی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس پر جینو کا کوئی جادو چل گیا تھا یا کچھ اور..... چند لمحے وہ خوشی سے جھوم جاتا اور پھر کچھ دیر کے لئے وہ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا تھا۔ کھیتوں میں آتے جاتے دوسرے تیسرے روز ان کا آمنا سامنا ہو جاتا تھا لیکن مسکراہٹوں کے تبادلے کے سوا بات آگے نہ بڑھ سکی وجہ یہ تھی کہ گندم کی بجائی کا وقت قریب آ رہا تھا، کھیتوں میں ہر طرف کسان ہی کسان نظر آتے۔

ایک دن جب فتو دوپہر کا کھانا (بھتہ) دے کر واپس جانے لگا تو ماموں نے اسے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری ایک ممانی بیمار ہے اور دوسری کھانا تمہارے حوالے کر کے دوسرے گاؤں فوتگی پر چلی گئی ہے۔ تم تھوڑی تکلیف کرو اور جاتے ہوئے راستے میں اپنی جوار کی فصل ہے وہاں جوار کاٹ کر رکھ دینا ہم واپسی پر گدھیوں پر لاد کر گھر لے آئیں گے۔ فتو نے درانتی اٹھائی کھانے والے برتن ساتھ لئے اور اس جوار والے کھیت میں پہنچ گیا جو راستے میں تھا، اس کے اردگرد بھی دیگر لوگوں کی جوار، باجرے کی فصلیں تھیں۔ وہ جوار کاٹنے میں مشغول ہو گیا۔ اسی کھیت کی منڈیر پر جینو آ رہی تھی، اس نے شاید پہلے فتو کو اس طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ یہ چند منٹوں کی باضابطہ ملاقات تھی اسی ملاقات کے بعد ایک (مائی) گھروں میں کام کرنے والی کی واساطت سے آئندہ ملنے کا پروگرام طے ہوا۔ اب ان دونوں کے درمیان مائی نے پل کا کردار ادا کرنا تھا۔

پھر ایک رات جینو کی طرف سے ٹاہلی والے تھڑے پر ملاقات طے پائی۔ گاؤں کے اردگرد گاؤں سے ایک دو فرلانگ دور کچھ مشہور مقامات مختلف ناموں سے مخصوص ہوتے تھے جو اب بھی ہیں جیسے ''بابے والی بن''، ''نلی والا دربار''، ''نٹوں والا میرا'' وغیرہ وغیرہ یہ وہ جگہیں ہوتی ہیں جن کے اردگرد درخت اور جھاڑیاں وغیرہ زیادہ ہوتی ہے۔ چھپ کر ملنے اور پیار و محبت کے درختوں کو یہاں ہی پروان چڑھایا جاتا تھا یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام درخت پروان چڑھ جاتے۔ کئی ہوس کی بھینٹ چڑھ جاتے جس سے کوئی نئی کونپل پھوٹ پڑتی جو اکثر پھوٹتے ہی مسل دی جاتی، کچھ بدقسمت عاشقوں کا بڑی رازداری سے چیر پھاڑ کر ایندھن بنا دیا جاتا۔ جیسے کہ آگے چل کر فتو کو بنایا گیا۔ کچھ گیلی لکڑی کی طرح سلگتے اور دھواں دیتے اپنے انجام کو پہنچ جاتے کوئی خوش قسمت جوڑا ہوتا جو منزلِ مقصود تک پہنچ پاتا کیونکہ سماج معاشرہ اور ذات آڑے آ جاتی تھی۔

مقررہ وقت پر جینو وہاں پہنچ گئی۔ فتو وہاں پہلے سے موجود اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فتو اسے آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن جینو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''بیٹھ جاؤ فتح محمد! باتیں بہت ہیں وقت بہت کم ہے''۔ جینو نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی دو اور سہیلیوں کے ساتھ رفع حاجت کے کہہ کر گھر سے نکلی ہوں، وہ دونوں تھوڑی دور میرا انتظار کر رہی ہیں۔ فتو! بات یہ ہے کہ تم مجھے صرف اچھے ہی نہیں لگتے بلکہ بہت اچھے لگتے ہو۔ اگر سچ پوچھو تو تمہارے مقابلے کا کوئی جوان بھی اس گاؤں میں نہیں ہے لیکن تیرا میرا ملاپ بہت مشکل ہے''۔

''مجھے معلوم ہے تم چوہدریوں کی بیٹی ہو اور میں کمی کمین کی اولاد ہوں''۔ فتو نے کہا۔ ''لیکن ہم سب آدم کی اولاد ہیں۔ تمہارے والد کے پاس چند ایکڑ زمین ہے تو چوہدری بن گئے ہیں لیکن ذرا سوچو تو وہ بھی

صبح سے رات تک محنت کرتے ہیں اور ہم بھی جیسا تم لوگ کھاتے اور پہنتے ہو اس سے بہتر تو ہم لوگ کھاتے پہنتے ہیں''۔

''اوجھلیا! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو''۔ جینو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پکا یقین ہے کہ تم مجھے حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہو لیکن مجھے صرف اتنا بتا دو کیا تم کسی کو بھیج کر میرے والدین سے اپنے لئے رشتہ مانگ سکتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو سمجھ لو کہ تمہاری اور میری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے اپنے دلوں سے ایک دوسرے کو نکال دیں۔ اسی لئے میں نے تم سے ملاقات کی ہے''۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب چلتی ہوں، کافی دیر ہو گئی ہے۔ میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہیں۔ سہیلیوں نے مجھ سے بڑا پوچھا ہے کہ کس سے ملنا ہے لیکن میں نے ان کو تمہارا نہیں بتایا وہ میری رازدار ہیں اور میں ان کی رازدار ہوں۔ آخری بات کہہ کر جا رہی ہوں کہ اب وقت ہے ہم اپنی اپنی راہیں جدا کر لیں کیونکہ جتنی قربتیں بڑھتی جائیں گی اتنا ہی جدائی مشکل ہو جائے گی۔ کوشش کرنا کہ آئندہ میل ملاقات نہ ہی ہو تو بہتر ہے''۔ یہ کہہ کر جینو اٹھ کھڑی ہوئی۔

جینو کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جذبات کی بجائے عقل سے سوچتی ہے اور حقائق پر اس کی نظر ہے۔ اس کے مقابلے میں فتو جذباتی تھا اور دل سے سوچتا تھا۔

فتو بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جب جینو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی، فتو پھر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، جذباتی دنیا میں زلزلے برپا تھے۔ پیار کی ریشمی ڈوریاں الجھ گئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چارپائی پر پڑے اس سے نیند کوسوں دور تھی۔ ذہن میں ایک سوچ ابھرتی تو ساتھ ہی کوئی اور سوچ اس پر غالب آ جاتی۔ اس نے تو یہ سوچ کر جینو کو بلوایا تھا کہ اس سے کوئی قول و قرار لے گا۔ کوئی پیار محبت کی باتیں ہوں گی لیکن وہاں تو سب کچھ الٹ ہو گیا۔ جینو اسے چاہتی بھی ہے اور دور بھی ہو رہی ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''لیکن میں تو اسے حاصل کر کے ہی رہوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے''۔ اس نے دل میں ارادہ کر لیا۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

پہلے وہ نھیال میں چند دن رہ کر واپس گاؤں بھائی کے پاس جاتا لیکن اب تو اسے پندرہ دن سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اب وہ کچھ بجھا بجھا سا اور کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ اس نے مائی کے ذریعے کئی پیغام جینو کو بھجوائے کہ صرف ایک ملاقات کر لو چند ضروری باتیں کرنی ہیں لیکن واپسی پر یہی پیغام ملتا کہ میں تجھ سے پیار ضرور کرتی ہوں البتہ تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔ مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے، یہ ضروری نہیں کہ شادی ہو تو پیار ہوتا۔ دنیا کی کوئی طاقت میرے خاندان والوں کو تمہیں میرا رشتہ دینے پر قائل نہیں کر سکتی اور میں خاندان والوں کی مرضی کے بغیر تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔

مائی پیغام دے کر چلی گئی لیکن فتو بجھ سا گیا۔ اگلے دن اس کا بڑا بھائی پہنچ گیا اور فتو کو پیار بھرے انداز میں ڈانٹا کہ دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تم گھر نہیں آئے، میں پریشان ہو گیا۔ فتو بھائی کے ساتھ واپس گھر چلا گیا لیکن ایک ہی رات گھر رہا اور دوسرے دن واپس نھیال آ گیا۔ اب بھی فتو کھیتوں میں کھانا دینے جاتا تھا، جینو بھی کبھی کبھار والد اور چچا کو کھانا دینے جاتی لیکن جس راستے سے فتو آ رہا ہوتا یا جا رہا ہوتا وہ دوسری

PakSociety.com

طرف سے دور ہٹ کر گزر جاتی۔ وہ فتو کو چاہتی تو ضرور تھی لیکن اسے خاندان کی عزت زیادہ عزیز تھی۔ فتو بار بار پیغام بھیجتا لیکن وہ ٹال دیتی۔ آخر ایک دن اس نے مائی کے ذریعے پیغام بھجوایا۔ کہ آخری بار مجھ سے مل لو چند بہت ضروری باتیں کرنی ہیں اور اگلی جمعرات تک تم نہ ملی تو میں تمہارے گھر کے سامنے خود کو آگ لگا لوں گا۔ پھر لوگ تیرے باپ سے پوچھیں گے کہ اب بتاؤ کہاں گئی تمہاری چوہدراہٹ اور کہاں گئی تمہاری عزت؟ جینو کی طرف سے ملنے کا وعدہ کر لیا گیا اور جینو مقررہ جگہ پر پہنچ گئی۔

''اس دن میں نے تمہاری سنی تھیں آج تم میری سنو''۔ فتو نے بلا تمہید کہا۔ ''میں تمہیں پانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تیرے میرے درمیان صرف ذات پات کی رکاوٹ ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم کہیں دور جا کر شادی کر لیں گے۔ کچھ عرصہ بعد حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم ایک دفعہ ہاں کر دو تو پھر دیکھنا میں کیا کچھ کر سکتا ہوں''۔

''مجھے یقین ہے کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو''۔ جینو نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ تم میرے لئے سب کچھ کر سکتے ہو۔ میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ تم میں ہر وہ خوبی ہے جو ایک مرد میں ہونی چاہئے۔ یہ بھی میں تسلیم کرتی ہوں اور تمہیں بھی یقین کر لینا چاہئے کہ میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں لیکن ہمارا ماحول، ہمارا معاشرہ اس بات کو قطعی نہیں مانتا۔ میں چوہدری کی بیٹی ہوں، تم کمی کمین ہو۔ میں تو تمہیں خاوند کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن کیا میرے والدین میرا فیصلہ اور یہ معاشرہ ہمیں قبول کر لے گا؟ فتو غور سے سنو! یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ اگر چوہدریوں کا بیٹا کسی کی کمین (دستکار) کی بیٹی کو زبردستی اغوا کر لے یا راضی خوشی شادی کر لے کسی مجال ہے جو اُف تک بھی کہے۔ اس دن بھی تمہیں کہا تھا اب بھی کہہ رہی ہوں تم اپنی برادری سے دیکھ کر اچھا سا رشتہ کر لو۔ نہ خود عذاب میں پڑو، نہ مجھے آگ میں دھکیلو۔ تمہارا پیار زندگی بھر میرے دل میں رہے گا، مجھے معلوم ہے ایسا قدم اٹھانے سے مجھ سے میری زندگی چھن جائے گی اور تمہارا جو حال ہو گا وہ اللہ ہی جانتا ہے..... فتو یاد رکھنا! میں اپنے باپ کی پگ کو داغ کبھی نہیں لگنے دوں گی''۔

''یہی تمہارا آخری فیصلہ ہے تو پھر ٹھیک ہے''۔ یہ کہہ کر فتو اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہوا۔ ''میں دیکھ لوں گا کیا ہوتا ہے''۔ وہاں سے چلا آیا۔

اس کے بعد فتو زیادہ پریشان رہنے لگا۔ خیال میں تو اس کا کوئی ایسا رازدار دوست بھی نہ تھا جس سے وہ دل کی بات کہتا۔ اپنے گاؤں میں بھی اس کی دوستی چند لڑکوں سے تھی لیکن وہ ان سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسی طرح چند دن گزر گئے فتو کی ایک ماموں زاد بیٹی دوسرے گاؤں بیاہی ہوئی تھی، نسیم نام تھا۔ وہ بچپن سے ہی فتو کو بہت پیار کرتی تھی۔ فتو اسے باجی کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ بھی اس کو چھوٹے بھائیوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ دو تین روز سے وہ میکے آئی ہوئی تھی، وہ گزشتہ دو روز سے فتو کی چال ڈھال دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اتنا بولنے والا میرے دونوں بچوں سے لاڈ پیار کرنے والا فتو کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دے رہا ہے۔ شام کو فتو کھیتوں سے واپس آیا تو نسیم نے فتو کو بلایا اور الگ لے گئی۔

''میرا ویر! مجھے پریشان پریشان لگ رہا ہے، کیا بات ہے کسی نے کچھ کہا ہے؟'' نسیم نے پوچھا۔

فتو کچھ نہ بولا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ شاید ابھی رو پڑے گا۔ نسیم نے جب بار بار پوچھا تو فتو پھٹ پڑا اور اس نے دل کھول کر نسیم کے آگے رکھ

Pakistanipoint.com

دیا۔

''توبہ توبہ!'' نسیم نے سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگائے اور بولی۔''خبردار! اس کا خیال دل سے نکال دو وہ بڑے سخت لوگ ہیں، ہم تو ان کے سامنے گلیوں کے کتھ ہیں۔ میں اپنے ویر کی اس سے زیادہ حسین لڑکی سے شادی کراؤں گی''۔

''نہیں باجی! مجھے کوئی راستہ دکھا نہیں تو میں آخری حد تک چلا جاؤں گا''۔فتو نے جذباتی انداز میں کہا۔''اور ہاں باجی! تجھے اپنے بچوں کی قسم کہ تم یہ بات کسی سے بھی نہیں کرو گی''۔

نسیم نے اسے تسلی دی کہ یہ راز ہی رہے گا۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔ باقی مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو میں کوئی راستہ نکالتی ہوں۔ باقی اللہ کی مرضی جس طرح اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔

اپنے دل کی بات نسیم سے کہہ کر اس کے ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا سا ہوگیا تھا۔ دوسرے دن شام کو نسیم نے فتو کو پاس بٹھا لیا۔

''میرے سسرالی گاؤں سے چھ سات میل دور پہاڑی کے ساتھ مکھن شاہ کا ڈیرہ ہے''۔ وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگی۔''دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ بہت پہنچ والا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں ہر مراد پوری ہوتی ہے۔ میں بھی تیرے بھائی (اپنے خاوند) کے ساتھ گئی تھی۔ تیرے بھائی کا کاروبار بالکل مندا تھا، دو دفعہ وہ خود گیا تھا، تیسری بار پیر صاحب نے کہا کہ بیوی کو بھی ساتھ لانا کام کی بندش اسی کی وجہ سے ہے۔ اس نے وہاں پر کڑا ڈالا تھا، جلانے اور پینے کے لئے تعویذ بھی دیئے تھے۔ دیکھ لو تمہارے بھائی کا کام خوب چل رہا ہے۔ پہلی دفعہ مکھن لے کر جانا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بنگال سے کسی بزرگ نے انہیں یہاں بھیجا ہے کہ وہاں دور دور تک ان لوگوں کا کوئی پیر و مرشد نہیں ہے، وہ لوگ زیادہ تر تکالیف میں رہتے ہیں۔ بھائی! تم خود جا کر دیکھنا کہ انہوں نے کس طرح جنگل میں منگل بنا دیا ہے۔ جب وہ چند سال پہلے یہاں آئے تھے تو اس جنگل میں دن کو بھی لوگ آنے سے ڈرتے تھے۔ اب تو رات کو بھی وہاں میلہ لگا رہتا ہے۔ دور دراز سے آنے والے لوگ رات وہیں ٹک جاتے ہیں۔ آنے والی جمعرات کو میرے گھر آ جانا، اگر کہو گے تو میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ ان کو کہنا کہ ایسا تعویذ دو کہ جینو کے والدین مان جائیں''۔ فتو کو نسیم کا مشورہ پسند آ گیا۔

دوسرے دن نسیم واپس گھر چلی گئی۔ بدھ کے دن شام فتو نے ماموں کو بتایا کہ میں صبح گھر جا رہا ہوں، دو تین دن بعد واپس آ جاؤں گا اور جمعرات کے دن صبح سویرے سویرے فتو نسیم کے گاؤں پہنچ گیا۔ نسیم نے کھانا تیار کیا۔ کھانے کے بعد نسیم نے پوچھا کہ اگر تم کہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔ فتو نے اس کو منع کر دیا بلکہ کہا کہ بھائی یعنی اپنے خاوند کو بھی نہ بتانا۔

''میں اتنی جھلی نہیں ہوں کہ خاوند کو بتا دوں گی''۔ نسیم نے اسے تسلی دی۔''تم جاؤ اللہ بہتر کرے گا''۔

فتو ظہر کے وقت وہاں پہنچ گیا۔ پچیس تیس بندے وہاں موجود تھے۔ کچھ لوگ درختوں کے سائے میں بیٹھے تھے اور کچھ سرکنڈوں کے بنے جھونپڑوں میں بیٹھے تھے۔ بہت ہی دلکش اور پُرفضا مقام تھا۔ پیر نے بھی تاڑ کر ہی اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ کہتے ہیں نا کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ وہاں بھی شاید کچھ ایسی ہی سوچ تھی۔ گھنے درختوں کے جھنڈ ساتھ بہتی ہوئی خوبصورت ندی جس میں پہاڑی چشموں کا شفاف پانی کئی قسم کی معدنیات اور جڑی بوٹیوں سے گزر کر ندی میں گرتا تھا۔

فتو کو بتایا گیا کہ پیر صاحب اس کمرے میں

موجود ہیں۔ ایک ایک آدمی اندر جا رہا تھا اور فیض یاب ہو کر باہر آ رہا تھا۔ ایک ملنگ سبز جھولا پہنے اور پیروں ننگا ایک مٹی کے کوزے کو اٹھائے مٹی کی ناس (پیالا) میں لوگوں کو پانی پلا رہا تھا۔ چند ملنگ اور تھے جو اپنی اپنی ڈیوٹیاں دے رہے تھے۔ ایک لمبے انتظار کے بعد فتو کی باری آئی۔ ایک خوبصورت مسند پر گاؤ تکیہ کی ٹیک لگائے پینتیس چھتیس سال کا بارعب بندہ بیٹھا تھا۔ شکل وصورت سے وہ کافی حد تک خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ کمرہ کچا تھا لیکن انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ پیر صاحب کے چہرے پر گھنی داڑھی، گلے میں بہت سے مالائیں لمبی زلفیں رعب دار آواز، سامنے ایک پرات مکھن کی بھری ہوئی پڑی تھی۔ فتو نے بھی نسیم کا دیا ہوا مکھن پیر کے حضور پیش کیا۔

نام تو شاید پیر کا کوئی اور ہو گا ہو سکتا ہے کہ مکھن کا چڑھاوا چڑھنے کی وجہ سے وہ مکھن شاہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔ بہرحال پیر نے مکھن والا برتن پکڑا مکھن کو سونگھ کر ایک ملنگ کو دیا اور کہا یہ مکھن جنگل والے مؤکلوں کے برتن میں ڈال دو اور جوان سے پانچ آنے لے لو اور ان پانچ آنوں کا گڑ بھی لا کر اسی پرات میں ڈالنا ہے۔ فتو نے کمر سے بندھی گٹھی کھول کر پانچ آنے ملنگ کو پیش کر دیئے۔

''اب بتاؤ جوان تمہارا کیا معاملہ ہے؟'' پیر نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

''حضور! میں ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں''۔ فتو نے ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے کہا۔ ''میں ایک عام اور معمولی خاندان کا فرد ہوں جبکہ وہ ایک بڑے خاندان کی بیٹی ہے۔ وہ چاہتی تو ہے کہ مجھ سے شادی کر لے، میرے ساتھ پیار بھی کرتی ہے لیکن وہ اپنے باپ اور دیگر خاندان والوں سے ڈرتی ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ تعویذ عطا فرما دیں کہ اس کے والدین یہ رشتہ قبول کر

ISO 9001:2008
النور فینز
رجسٹرڈ
النور الیکٹرک انڈسٹریز B-75، سمال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات
053-3726024, 053-3726026, 0300-9702203
http://www.alnoorfans.com

لیں"۔

"اچھا لڑکی کا نام بتاؤ اور اس کی ماں کا نام بھی بتاؤ"۔

فتو نے لڑکی اور اس کی والدہ کا نام بتایا پیر نے اپنی لمبی تسبیح کے دانوں کو مخالف سمت پھیرنا شروع کر کیا۔ آنکھیں بند کرلیں کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں، تسبیح پر پھونکیں ماریں اور سرخ آنکھوں سے فتو کو گھورنے لگا۔

"ماں بیٹی کی حد تک تو معاملہ قدرے آسان ہے"۔ پیر نے اس سے کہا۔ "اب اس لڑکی کے والد کا نام اور والد کی ماں کا نام بتاؤ"۔

فتو نے والد کا نام تو بتا دیا لیکن اس کی والدہ کا نام اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس کا نام اس کے ذہن میں آ گیا۔ ابھی وہ زندہ تھی، زیادہ چل پھر تو نہیں سکتی تھی لیکن فتو نے اسے دیکھا ہوا تھا۔ جینو کے باپ کے ساتھ جب اس کی دادی کا نام آیا تو پیر صاحب نے حیرت سے فتو کی طرف دیکھا اور فوراً ہی پوچھا کہ لڑکی کا کوئی اور تایا چچا بھی ہے؟"

"جی ہے"۔

"اس کا نام کیا ہے؟" پیر نے پوچھا۔

"جی اس کا نام چوہدری نظام دین ہے"۔ یہ سنتے ہی جیسے پیر کو کرنٹ سا لگا ہو۔ پیر نے ایک لمبی آہ کھینچی۔

"جوان! تمہارا کام انتہائی مشکل ہے"۔ پیر نے فتو سے کہا۔ "مجھے اس کے لئے ایک لمبا چلہ کاٹنا پڑے گا اس پر تمہارا خرچہ بھی کافی ہو گا اور وقت بھی لگے گا"۔

"آپ وقت اور خرچہ کی فکر نہ کریں سرکار! بس کام ہونا چاہئے"۔ فتو نے کہا۔

"تو پھر میں تمہیں ایک وظیفہ بتاتا ہوں"۔ پیر مکھن شاہ نے کہا۔ "پندرہ دن یہ وظیفہ کر کے تم نے کسی میٹھی چیز پر دم کر کے لڑکی کو کھلانا ہے۔ وہ خود والد کو راضی کرنے کی کوشش کرے گی۔ چلہ میں کروں گا، ابھی تم سوا پانچ روپے مجھے دے جاؤ، پندرہ دن بعد دوبارہ آنا اور گیارہ روپے لے کر آنا"۔ (یاد رہے اس دور میں ایک روپے کی تیس سیر گندم ملتی تھی)

فتو کوئی اوٹ پٹانگ وظیفہ لے کر چلا آیا اور پیر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ بارہ تیرہ دن بعد وہ مائی سے ملا اور کہا کہ کسی طریقے سے یہ گڑ کی ڈھیلی جینو کو کھلا دو۔ اس نے چند سکے بھی بڑھیا کو دیئے۔ پندرہویں دن کے بعد مائی نے آ کر فتو کو بتایا کہ میں نے گڑ جینو کو کھلا دیا ہے (پتہ نہیں کھلایا تھا یا نہیں) وہاں سے فتو بھائی کے پاس آیا ایک رات وہاں گزاری اور بھائی کو کہا کہ مجھے دس روپے چاہئیں۔ کچھ روپے اس کے اپنے پاس تھے۔ بھائی سے رقم لے کر وہ سیدھا پیر کے پاس چلا گیا اور خوشی خوشی بتایا کہ میں نے گڑ لڑکی کو کھلا دیا ہے۔

"کیا تم نے گڑ اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ڈالا تھا؟" پیر نے پوچھا۔

"نہ جی نہ، وہ تو مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتی"۔ فتو نے کہا۔ "کہتی ہے کسی کو پتہ چل گیا تو پورے خاندان کی بے عزتی ہو گی"۔

"پھر تم نے میرا دیا ہوا وظیفہ ضائع کر دیا اور سارا عمل ہی بے کار ہو گیا ہے"۔ پیر نے کہا۔ "پندرہ دنوں کا وظیفہ تمہیں اور کرنا پڑے گا لیکن مٹھائی یا اور کوئی میٹھی چیز تم خود لڑکی کو کھلاؤ گے"۔ ہدیہ پیر نے وصول کر لیا اور پندرہ دن بعد آنے کا کہا اور سوا پانچ روپے ہدیہ ساتھ لانے کا کہا۔

اب فتو یہ سوچ رہا تھا کہ وظیفہ تو وہ کر لے گا لیکن

جینو نہ آئی تو پھر کیا ہوگا۔ اسی دوران وہ مائی سے ملا اور اس کی منت سماجت کی کہ کسی طرح ایک دفعہ جینو سے ملا دے''۔

''ہوش کر کا کا!'' مائی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں معلوم نہیں لیکن میں خبردار کر دوں کہ جینو کی ماں کو تمہاری ملاقاتوں کا پتہ چل گیا ہے۔ بیٹی کو سامنے بٹھا کر اس نے اپنا سر منہ پیٹ لیا تھا اور کہا کہ اگر تیرے بھائی، والد اور چچا کو پتہ چل گیا تو تمہیں زندہ درگور کر دیں گے اور تیرے عاشق کے ٹکڑے کر دیں گے..... اور مجھے بھی اتنا ہی قصوروار ٹھہرائیں گے کہ تم بھی بیٹی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ ماں نے بیٹی کو بہت ڈرایا ہوا ہے۔ بہرحال پھر بھی میں کوشش کروں گی''۔ فتو نے چند سکے مائی کے ہاتھ پر رکھے، مائی نے کسی طرح جینو کو رغلا کر مقررہ جگہ پر بھیج دیا۔

فتو نے اس ملاقات میں پھر اس سے مرنے جینے اور قول نبھانے کا کہا اور مٹھائی نکال کر اس کے سامنے رکھی کہ اور کہا کہ میں شہر گیا ہوا تھا تمہارے لئے یہ مٹھائی لایا ہوں ان میں سے ایک دانہ اٹھا کر اس نے جینو کے منہ کی طرف کیا اور کہا یہ میں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔

''ٹھیک ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہے''۔ جینو نے کہا۔ ''کیونکہ میری ماں کے کانوں میں یہ بھنک پڑ چکی ہے کہ میری تیری ملاقاتیں ہوتی ہیں اور آئندہ مجھے بلوانے کی کوشش نہ کرنا۔ اس میں تمہاری اور میری بھلائی ہے۔ فتو یاد رکھو، ہم دریا کے وہ دو کنارے ہیں جو کبھی بھی آپس میں مل نہیں سکتے۔ اس لئے تمہاری اپنی راہ اور میری اپنی''۔ یہ کہہ کر جینو اٹھ کر چل دی۔

پیر کے چوہدری کرم دین اور چوہدری نظام دین کے آپس میں اچھے خاصے مراسم تھے۔ برادری میں مین میخ کے کسی کے ساتھ جھگڑے کے چکر میں وہ پیر کے پاس آتے تھے اور پھر علیک سلیک اتنی بڑھ گئی کہ کئی دفعہ پیر ان کے گھر بھی جا چکا تھا۔ پیر کوئی قدم اٹھانے اور چوہدریوں کو آگاہ کرنے سے پہلے فتو کو مالی طور پر خوب لوٹنا چاہتا تھا۔ دو تین مہینے تک تو اس نے فتو سے خوب مال بٹورا۔ اب فتو بھی پیر سے مایوس ہو چکا تھا اور پیر مکھن شاہ بھی بھانپ گیا تھا کہ اب اس سے اور مال نکالنا مشکل ہو گیا ہے تو اس نے ایک دن ایک ملنگ کو بھیج کر چوہدری کرم دین کو بلوا لیا۔ ویسے مکھن شاہ چوہدریوں کا بھی خیرخواہ نہیں تھا۔ اس کی بلا سے کہ کسی کی بیٹی کس کے ساتھ تعلقات رکھ رہی ہے یا کس کا بیٹا کس کی بیٹی کو ورغلا رہا ہے، اسے تو بس مال سے غرض تھی جو وہ بنا رہا تھا۔

کرم دین دوسری صبح گھوڑی پر سوار ہوا پیر کو نذرانہ پیش کرنے کے لئے مکھن، ایک مرغا اور چند میٹھی روٹیاں جو رات کو ہی اس نے بیوی سے بنوا لی تھیں، لے کر چل پڑا۔

آج سے کچھ عرصہ قبل دیہاتی خواتین اور مرد بھی عام طور پر میٹھی روٹی کی منت مانتے تھے۔ آج بھی کبھار دیکھنے کو مل جاتی ہے لیکن بہت کم اس کے پکانے کا طریقہ کوئی اس طرح ہوتا ہے کہ گڑ کا شربت بنا کر اس میں دیسی گھی اور سونف پیس کر ملائی جاتی تھی اور پھر پکا کر روٹیوں کے ٹکڑے کر کے درباروں، مزاروں اور گھروں میں لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ کیا مزے دار ہوتی تھی۔

کرم دین منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل پڑا اور پیر کے قدموں میں ماتھا ٹیکا، نذرانہ پیش کیا۔ پیر نے میٹھی روٹیاں ایک ملنگ کو دیں کہ یہ لوگوں میں تقسیم کر دینا۔ پھر پیر نے کرم دین کو میٹھی لسی پلائی اور گھر کی خیر خیریت پوچھنے لگا۔

''چوہدری! تم کو کچھ خبر بھی ہے''۔ پیر نے بڑی

رازداری سے کرم دین کو اپنے قریب کر کے کہا۔ ''وہ کمی کمین کا پتر تمہارے ہاں کیا گل کھلا رہا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں مرشد! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' کرم دین نے کہا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اچھے خاصے جہاندیدہ انسان ہو''۔ پیر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''گاؤں کے بڑے زمین دار ہو لیکن گھر کے معاملات پر تمہاری توجہ نہیں ہے۔ فتو غلامے کا بھانجا تمہاری بیٹی کو ورغلا چکا ہے اور کسی بھی دن وہ اس کو بھگا لے جائے گا..... چوہدری! تمہاری غیرت کہاں مرگئی ہے؟ کوئی اور ہوتا تو شاید میں اس کو نہ بتاتا لیکن تمہارے خاندان کی عزت میری عزت ہے''۔

یہ سنتے ہی کرم دین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کچھ بھی تھا وہ ایک غیرت مند خاندان تھا۔ تھے تو وہ درمیانے درجے کے کاشتکار لیکن گاؤں میں ان کی ایک عزت وقار اور رکھ رکھاؤ تھا۔ کرم دین اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اس کو ایسا سبق سکھاؤں گا جو اس کی نسلیں یاد رکھیں گی''۔

''بیٹھ جاؤ کرم دین بیٹھ جاؤ!'' پیر نے کہا۔ ''یہ مسئلہ جوش سے نہیں ہوش سے حل کرنے والا ہے''۔ پیر صرف اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے چال چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''چوہدری! مل کر کوئی ایسا حل سوچتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تم اب گھر چلے جاؤ لیکن یاد رکھنا بیٹی سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا اور نہ ہی ان باتوں کا ذکر اپنی بیوی سے کرنا۔ بیٹی پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو بات دور تک چلی جائے گی۔ ویسے بھی بات ابھی اندر تک ہی محدود ہے تم اپنے گھر پر نظر رکھو اپنے مال کی حفاظت کرو پھر مل کر اس کتے کا بندوبست کر لیں گے۔ تم صرف بھائی سے مشورہ کرنا اور کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مشورہ کر کے دونوں بھائی میرے پاس آ جانا''۔

چوہدری گھر آ گیا۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا، بیوی نے کئی بار پوچھا کہ پیر صاحب نے کیوں بلوایا تھا لیکن اس نے حیلے بہانے سے بیوی کو ٹال دیا۔ شام کو دونوں بھائی مویشیوں کے لئے چارہ لینے کھیتوں میں چلے گئے۔ چارہ کاٹنے سے پہلے ہی کرم دین نے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور تمام کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔ نظام دین بھی یہ سن کر جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔

''چلو آج پہلے تو گھر سے ابتدا کرتے ہیں''۔ نظام دین نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ ''ذرا جینو کو تو سبق سکھائیں پھر اس مردود کو بھی دیکھ لیتے ہیں''۔

''نہیں نظام دین! پیر صاحب نے منع کر دیا ہے جینو سے کوئی بات نہیں کرنی''۔ کرم دین نے کہا۔ ''پہلے اس کا بندوبست کرتے ہیں پھر اشرف کو بلوا کر اسے کہتے ہیں کہ پندرہ بیس دنوں کے اندر بیٹے کو لائل پور (فیصل آباد) سے بلوا لے تاکہ جینو کو رخصت کریں۔ اسی طرح ہماری عزت محفوظ رہ سکتی ہے اور کل ہم دونوں پیر صاحب کے پاس جائیں گے۔ دیکھتے ہیں وہ کیا مشورہ دیتے ہیں''۔

جینو کا رشتہ پہلے ہی برادری میں طے تھا۔

''ٹھیک اگر تم اس طرح کرنا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے''۔ نظام دین نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

دوسری صبح وہ پیر کے ہاں پہنچ گئے۔ رش تو کافی تھا لیکن ایک ملنگ کی معرفت اندر اطلاع دی گئی تو پیر نے دونوں کو اندر بلوا لیا بیٹھتے ہی پیر نے پوچھا ہاں بھائی کیا سوچا ہے۔

''مرشد! پہلے اس کتے کا منہ بند ہو جائے''۔ کرم

دین نے کہا۔ ''تو جینو کو پندرہ بیس دن کے اندر اندر ہی اس کی شادی کر کے رخصت کر دیں گے۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ اس کا رشتہ ہم نے چوہدری اشرف کے بیٹے کو دیا ہوا ہے''۔

''تو پھر فتو سے کس طرح نبٹا جائے گا؟'' پیر نے پوچھا۔

''وہ زیادہ وقت ادھر ہی ننھیال میں گزارتا ہے۔ دو تین دن کے اندر اندر ہی اس کو ایسی پھینٹی لگائیں گے کہ پھر وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا''۔ نظام نے انتہائی غصہ بھرے انداز میں کہا۔

''ہاہاہا!'' پیر نے قہقہہ لگایا اور پھر غصہ بھرے انداز میں کہا۔ ''تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹی کی عزت اچھال کر پانچ سات سال کے لئے جیل چلے جاؤ گے''۔

''تو پھر سرکار! آپ ہی ہمیں کوئی رستہ دکھائیں''۔ کرم دین نے عرض کی۔

پیر نے اپنا آخری ترپ کا پتا پھینکا۔

''میں نے پہلے دن ہی کہا تھا کہ ایسا کام کرو کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی بچ جائے''۔

''تو پھر جلدی بتائیں سرکار!'' دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''اتنے اتاولے نہ بنو یہ کام بڑے صبر، سوچ اور تحمل مزاجی سے کئے جاتے ہیں''۔ پیر نے کہا۔ ''جلدی کرنا شیطانی عمل ہے (اور اس شیطانی عمل میں پیر آگے آگے تھا) تم لوگ مجھ پر اعتماد کرو اور اپنے گاؤں میں فتو کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھانا۔ اس کے ساتھ جو کارروائی بھی کرنی ہو گی اسی کے اپنے گاؤں میں کریں گے۔ میرے پاس ایسے ایسوں کو سیدھا کرنے کے بڑے نسخے ہیں''۔

''تو پھر سرکار! دیر کس بات کی آپ جلد یہ کام کروائیں''۔ نظام دین نے کہا۔

''کام تو چند دن میں ہو جائے گا لیکن کچھ رقم خرچ کرنی پڑے گی کیونکہ یہ کام تو کسی اور نے کرنا ہے جو اس کام کی پوری پوری اجرت لے گا''۔ پیر نے قدرے زور دے کر کہا۔

''ٹھیک سرکار جس طرح آپ حکم کریں گے''۔ کرم دین بولا۔

''تو پھر آج ہی شام تک رقم پہنچا دو''۔ پیر نے کہا۔ ''تاکہ ان بندوں کو دے کر کام مکمل کرا لوں''۔

''ٹھیک ہے سرکار! کتنی رقم چاہئے ہو گی؟''

''یہ رقم تمہارے خاندان کی عزت سے بڑھ کر نہیں ہو گی۔ گئی عزت تو لاکھوں میں واپس نہیں آتی''۔ پیر نے ان کو پکا کرنے کے لئے کہا۔

''حق فرمایا سرکار! آپ نے''۔ آپ بتائیں تو سہی''۔ نظام دین نے کہا۔

''میں دو بندوں کے ذمہ یہ کام لگاؤں گا''۔ پیر نے لوہا گرم دیکھ کر وار کیا۔ ''اور فی کس سات سات سو روپے ان کو ہر صورت دینا پڑیں گے''۔

چودہ سو کا سن کر دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اس دور میں چودہ سو روپے ایک بہت بڑی رقم تھی۔

''سرکار! یہ تو بہت بڑی رقم ہے''۔ بڑے بھائی نے کہا، چھوٹے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو پھر ٹھیک ہے، خود ہی کوئی بندوبست کر لو''۔ پیر نے خفگی سے کہا۔ ''میں نے تو اس کا کام تمام کرانا ہے اور تمہیں مکمل بچانا ہے۔ کسی کو قاتل کی خبر تک نہ ہو گی۔ تم نے صرف اس دن مجھے اطلاع کرنی ہے جس دن فتو اپنے گاؤں میں موجود ہو گا۔ اس کے بعد تم فارغ''۔

بہت ہی منت سماجت کے بعد معاملہ بارہ سو میں

طے پا گیا۔ چلتے وقت پیر نے کہا آٹھ سو روپے شام تک بھجوا دو، باقی کام ہونے کے بعد دے جانا۔ دونوں بھائی رخصت ہو گئے اور رقم اکٹھی کی جو نظام دین کرم دین اور ان کی بیویوں کے پاس ملا جلا کر نو سو تیس روپے بن گئے۔ گاؤں کے میراثی کو بلوایا اور اسے کپڑوں کا ایک جوڑا جس میں رقم رکھی گئی تھی اسی تھیلے میں ساتھ مکھن اور کچھ انڈے بھی رکھ دیئے گئے۔ میراثی کو گھوڑی دی گئی اور کہا کہ پیر صاحب کو کہنا کہ یہ کپڑے اور نذرانہ چوہدری کرم دین نے بھجوایا ہے قبول فرمائیں اور ہمارے لئے دعا فرمائیں اور اگر شام کو تمہیں دیر ہو گئی تو وہیں رات کو رک جانا۔

مغرب سے تھوڑی دیر بعد میراثی پیر کے آستانے پر پہنچ گیا۔ مریدین نے بتایا کہ اب پیر صاحب آرام فرمانے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے ہیں تو میراثی نے کہا کہ بتاؤ کہ فلاں گاؤں سے فلاں نے بھیجا ہے۔ ایک مرید نے پیر کو اطلاع دی تو پیر صاحب جوتوں کے بغیر ہی باہر تشریف لے آئے۔ نذرانہ وصول کیا اور میراثی کو کہا کہ اندھیرا ہو رہا ہے، رات ادھر ہی ٹھہر جاؤ، صبح چلے جانا۔ مریدوں کو حکم دیا کہ مہمان کی اچھی طرح خاطر مدارت کرو۔

پیر نے فتو کے گاؤں کا مکمل پتہ معلوم کر کے اپنے ایک راز دار ملنگ کو بھکاری کے روپ میں فتو کے گاؤں بھیج دیا کہ پوری معلومات لو کہ وہ سوتا کہاں ہے اور اس کے ساتھ رات کو اور کون کون سوتا ہے۔ پورا محلِ وقوع ذہن میں رکھ کر آ جاؤ۔

دوسرے دن ملنگ بھکاری مطلوبہ گاؤں پہنچ گیا۔ چند اردگرد گھروں میں صدا لگائی۔ خیرات وصول کی اور ساتھ معلومات بھی اپنے مخبرانہ انداز میں لیتا رہا اور پوری معلومات لے کر واپس چلا گیا۔ وہ کوئی پیشہ ور بھکاری تو تھا نہیں البتہ پیشہ ور وارداتیا ضرور تھا۔ دوسری صبح اس نے پیر کو فتو کے بارے میں بتانا چاہا۔

''مجھے تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے''۔ پیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے معلوم کر کے کیا کرنا ہے، کام تو تم نے کرنا ہے۔ اب اپنے یار مستو کو ساری بات بتا دو جب فتو کے اپنے گاؤں موجود ہونے کی اطلاع آئے گی تو مجھ سے اپنی اجرت لے لینا اور اپنا کام مکمل کر آنا''۔

چند دن بعد پیر کو اطلاع ملی کہ فتو آج اپنے گاؤں چلا گیا ہے تو پیر نے مطلوبہ مرید کو بلایا جو جگہ دیکھ آیا تھا۔ اسے دو سو روپے دیئے اور کہا کہ ایک سو روپیہ مستو کو دے دینا۔ کام مکمل ہونے کے بعد ایک ایک سو روپیہ تمہیں اور مل جائے گا اور ہاں تمہیں دس بیس روپے فالتو بھی ملیں گے۔ آج ہی رات یہ کام ہو جانا چاہئے۔

''فکر نہ کر مورکھا پہلے کدی تینوں مایوس کیتا اے؟'' مرید نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اصل میں پیر اور مستو سمیت یہ تینوں ہی وارداتیے تھے چونکہ پیر ان کا لیڈر تھا اس لئے وہ بیٹھے بٹھائے حکم چلاتا تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی دونوں مرید نکل پڑے اور اپنا کام مکمل کر کے جیسا کہ (بیوہ کی بددعا اور پھانسی کا پھندہ) میں تفصیل سے ذکر آ چکا ہے، واپس اپنے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ فتو کے قتل کے الزام میں کوئی اور پکڑا گیا لیکن چند ہفتے بعد ڈکیتی کی ایک واردات میں فتو کے قتل میں شامل دو مرید اور ساتھ ایک اور ملنگ تین افراد پکڑے گئے۔ دوسرے روز پیر مکھن شاہ کے ڈیرے پر چھاپہ پڑنا تھا اور اس کو گرفتار کر لیا جانا تھا لیکن وہ اپنا مال نقدی اور دیگر قیمتی سامان سمیٹ کر بھاگ گیا۔

❁❁❁

pakistanipoint.com

طنز و مزاح

کرے کوئی بھرے کوئی

شاعر صاحب تو مقتول ہو گئے مگر اپنے پیچھے عدلیہ کے لئے ایک سوال چھوڑ گئے۔

☆ محمد انور ادریس انور کھوٹ

موسم بے حد بے ایمان ہو رہا تھا۔ فضا میں رومان انگیز مہک رچی ہوئی تھی اور..... اور ہم ہیں دوستوں..... خیر چھوڑیں، ان فضولیات کو۔

عمرِ عزیز کے اس حصے میں دل کی بنجر سرزمین میں اب ہم خواہشات کی نرم کونپلیں کھلانے سے تو رہے۔

طائرِ خیال عزیزم سلطان کی جانب پرواز کر گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ سلطان آ جائے تو مل کر چائے پکوڑوں کی ضیافت ہو جائے۔ گزشتہ ملاقات پر میں نے اسے محض چائے پر ہی ٹرخا دیا تھا۔ شیطان کو یاد کیا اور شیطان حاضر والی بات ہو گئی۔ سلطان آ دھمکا۔

''یار! بڑی عمر ہے تمہاری''۔ میں نے خلافِ معمول خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں تمہارے بارے ہی سوچ رہا تھا''۔

''غلط..... بالکل غلط''۔ اس نے ہاتھ بلند کر کے میری بات کی تردید کی۔ ''تم انگریزوں کے اس محاورے بارے سوچ رہے ہو گے کہ شیطان بارے سوچو تو وہ آ جاتا ہے''۔

میں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''یہ..... یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''تم سے اچھی بات سوچنے کی توقع رکھنا حماقت ہے''۔ اس نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''ویسے یار! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے کیا؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا میری طبیعت کو؟''

''آج تم نے میری آمد پر حسبِ معمول ناک بھوں نہیں چڑھائی''۔

''آج میں تجھے چائے کے ساتھ پکوڑے بھی کھلاؤں گا''۔ میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہاری طبیعت واقعی خراب ہے''۔ وہ پُرتشویش انداز میں بڑبڑایا۔

''چھوڑو یار! ان فضول باتوں کو''۔ میں نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ ''سناؤ کیسے آنا ہوا، آج کس کا پوسٹ مارٹم کرنا ہے؟''

''یار! کل ایک شعر سنا تھا''۔ اس نے خلا میں گھورتے ہوئے اپنی آمد کا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''سوچ رہا ہوں یہ شاعر لوگ بھی عجیب ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ زندگی میں مرنے کی باتیں کرتے ہیں اور مر کر بھی باز نہیں آتے۔ مرنے کے بعد زندگی کی باتیں کرتے ہیں''۔

''وہ کیسے؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یار راجے!'' اس نے اپنے خیالات کو الفاظ کا روپ دیتے ہوئے کہا۔ ''شاعر کا تو مجھے پتہ نہیں البتہ شعر خوب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حقیقت سے بہت بعید ہے''۔

''پہلے شعر سناؤ پھر اس کی حقیقت یا افسانوی رنگ کا فیصلہ کریں گے''۔ میں نے اسے شعر کہنے پر اکسایا۔

''شعر کچھ یوں ہے''۔ وہ بولا۔

''دعویٰ کروں گا حشر کو موسیٰ پہ خون کا
کیوں اُس نے میرے یار کے خنجر کو دھار دی''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے الجھے ہوئے انداز میں اعتراض جڑ دیا۔ ''یہ خنجر کہاں سے آ گیا؟''

''نہیں سمجھے ناں، مجھے پتہ تھا کہ شعر تمہاری بالائی منزل سے بھی بہت اوپر سے گزر جائے گا''۔ اس نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''تو تم ہی سمجھا دو نا''۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''شاعر کہتا ہے کہ میں قیامت کے دن حضرت موسیٰ پر 302 کا پرچہ کٹواؤں گا''۔

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے''۔ اس نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ ''حضرت موسیٰ نے اللہ پاک کے دیدار کی خواہش کا اظہار کیا۔ اللہ پاک نے حضرت موسیٰ کو سمجھایا کہ اے موسیٰ تم میرا جلوہ برداشت نہ کر پاؤ گے۔ حضرت موسیٰ باز نہ آئے اور دیدار کا اصرار کرتے رہے۔ اللہ پاک نے ستر ہزار پردوں میں سے اپنا جلوہ گزار کر طور پہاڑ پر ڈالا۔ نور الٰہی کوہِ طور کو خاکستر کرتے ہوئے منعکس ہو کر حضرت موسیٰ کی آنکھ پر پڑا تو جناب موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ تم اندازہ کرو یہ جلوہ ستر ہزار پردوں اور کوہِ طور کو بائی پاس کر کے ڈائریکٹ حضرت موسیٰ کی آنکھ پر پڑتا تو حضرت موسیٰ کا کیا حشر ہوتا؟''

وہ چند لمحوں کے لئے رکا اور سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔

''شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب کہیں سے پھرتا پھراتا کوہِ طور کی جانب جا نکلا دیکھا تو پہاڑ جل کر سرمے کی مانند سیاہ ہو چکا تھا۔ میرے محبوب نے وہاں سے کچھ سُرمہ اٹھا کر اپنے آنچل یا ساڑھی کے پلو سے باندھ لیا اور گھر آ کر اسے گھول کر کے قابل استعمال بنا لیا۔ خود کو سجایا سنوارا (اس زمانے میں بیوٹی پارلر نہیں ہوا کرتے تھے) آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ آنکھ کی پچھلی جانب..... ایک لکیر سی بنا کر..... وہ اسے کیا کہتے ہیں نین کٹاری..... بنا کر اپنے میک اپ کو فائنل ٹچ دیا۔ وہ مذکورہ نین کٹاری کے مشابہ بن گئی اور میں اس خنجر سے گھائل ہو کر مقتول ہو گیا''۔

سلطان نے ایک چھوٹی سی بریک لی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''شاعر صاحب تو مقتول ہو گئے مگر اپنے پیچھے انتظامیہ/عدلیہ کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئے۔ اس وقت کی انتظامیہ تو ایف آئی آر درج کرنے سے قاصر رہی مگر شاعر صاحب کو کیسے قرار آتا۔ مرنے کے بعد بھی دھمکیاں دیتے رہے کہ میں ایسا کر دوں گا، ویسا کر دوں گا۔ حتیٰ کہ معاملہ اللہ پاک پر چھوڑ دیا کہ قیامت کے دن میں اپنے خونِ ناحق کی دیت/قصاص طلب کروں گا..... اب تم ہی بتاؤ''۔ سلطان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسے شاعروں کو بھلا بندہ کیا کہے؟''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو''۔ میں نے آہستگی سے اعتراف کیا۔ ''میرے ذہن میں بھی حضرت موسیٰ کے بارے ایک شعر کلبلا رہا ہے کیا تم سننا پسند کرو گے؟''

''ارشاد..... ارشاد''۔ اس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستورِ الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی''

''واہ..... واہ.....'' اس نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسا دیئے۔

''مگر شکر ہے قانونی پیچیدگیوں سے مبرا ہے''۔ اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

Pakistanipoint.com

کبیر دادا کی بیوی میری چھوٹی بہن ہے۔ اگر اس کے خلاف کسی کے گندے دماغ میں کوئی غلیظ خیال رینگا، یقین مانو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔ میں صرف متعلقہ شخص کو نہیں اس کے پورے خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گا مع دودھ پیتے بچوں کے۔

☆ ریاض عاقب کوہلر
(aqibkohlar@gmail.com)

کبیر دادا کی کوٹھی میں تمام گینگسٹرز اپنی بیگمات کے ساتھ جمع تھے۔ پاشا، تناوش کو بھی گھر سے لے آیا تھا۔ کبیر دادا کی موت کی خبر سننے کے بعد سے وہ گم صم تھی۔ خواتین نے تعزیت کے بہانے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی مگر کسی کی بات کا جواب دیے بغیر وہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔ فرحانہ بھی مغموم صورت لیے وہیں موجود تھی زندگی میں پہلی بار اسے تناوش سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر اس سے رہا نہ گیا تناوش کے قریب پہنچ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''فرحانہ باجی! یہ عورتیں پریشان کیوں نظر آ رہی ہیں؟'' اس کے معصومیت بھرے سوال پر فرحانہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

''وہ والی باجی کہہ رہی تھی کبیر حادثے میں فوت ہو گئے ہیں۔ ہونہہ، اتنی بھولی ہیں انھیں معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔'' تناوش نے ایس پی کی بیوی سلطانہ کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا۔

''وہ سچ کہہ رہی ہیں پگلی۔'' فرحانہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

تناوش اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنی لے میں شروع رہی۔ ''آج پورا دن ہم نے اکٹھے گزارا، شام کو امی جان کی طرف گئے تھے وہیں پر انھیں کال موصول ہوئی اور وہ تھوڑی دیر میں لوٹنے کا کہہ کر گئے تھے، ابھی تک نہیں لوٹے۔ آنے دو آج بالکل بھی بات نہیں کروں گی، دیکھنا کیسے منتیں کریں گے۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا۔'' فرحانہ سسکی۔

''اتنے مہمان جمع ہیں اب تو انھیں آ جانا چاہیے تھا۔'' فکر مندی سے کہتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔ ''باجی، یہ تمام ہماری شادی کی خوشی میں جمع ہوئے ہیں نا۔''

فرحانہ اس کی بات کا جواب نہیں دے سکی تھی۔ راحت خالہ کو پاشا نے چائے بنانے کا کہا۔ اسے باورچی خانے کی طرف بڑھتا دیکھ کر تناوش کہنے لگی۔

''راحت خالہ، سالن میں خود بناؤں گی، وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔ صبح ناشتے کے بعد سے انھوں نے کچھ نہیں کھایا۔''

پاشا اس کے قریب پہنچا۔ ''گڑیا، تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔''

تناوش نے پریشانی ظاہر کی۔ ''بھیا، وہ خفا ہو جائیں گے کہ مہمان بیٹھے ہیں اور میں سونے کو لیٹ گئی ہوں۔''

''میں انھیں سمجھا دوں گا۔'' پاشا اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے خواب گاہ میں لے گیا۔ اور اسے نیند

کی گولی کھلا کر باہر نکل آیا۔

نوشاد نے اخلاق حسین کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اگر یہ نام نہاد بھائی نہ ہوتا تو چھوکری ہاتھ میں تھی۔''

اخلاق نے کہا۔ ''تھوڑا انتظار کر لیتے ہیں کہ پاشا اس کے لیے کیا کرتا ہے، پھر کوئی منصوبہ بندی کر لیں گے۔ فی الحال تو ٹھنڈ رکھو غریب تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہے۔''

نوشاد منہ بنا کر رہ گیا تھا۔ تناوش کے حصول میں مسلسل کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آ رہی تھی۔ ان کی ساری چالیں اور جوڑ توڑ ناکام ہو رہے تھے۔

راحت خالہ سب کے لیے چائے لے آئی تھی۔ زیادہ تر نے چائے پینے میں دلچسپی نہ لی۔ تھوڑی دیر بعد پاشا تمام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں آرام کا مشورہ دے رہا تھا۔

☆☆☆

کبیر دادا کی لاش انھیں نہیں ملی تھی۔ گوشت کے چند لوتھڑوں اور کپڑے کی کچھ دھجیوں کو لکڑی کے تابوت میں بند کر کے دفنا دیا گیا تھا۔ تناوش کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ مجبوراً پاشا کو اسے ماں کے پاس بھیجنا پڑا۔ البتہ حفاظت کے لیے باقر اور رخسار کو بھی ساتھ بھیج دیا تھا۔

کبیر دادا کی موت کے تیسرے دن تمام گینگسٹرز کبیر دادا کے خفیہ ٹھکانے پر موجود تھے۔ سربراہی کی کرسی خالی پڑی تھی۔ اور کرسی کی پشت کو پکڑ کر پاشا تمام کی طرف متوجہ تھا۔

''بیٹھک کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کرسی کے لیے کسی ایک کا چناؤ کیا جائے۔ اس ضمن میں کاشف دادا کے علاوہ اگر کوئی بھی مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو سامنے آ جائے۔ تاکہ بیٹھک کے آغاز سے پہلے مقابلہ کر لیا جائے۔'' پاشا نے سوالیہ نظر دوڑائی مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔

''کاشف دادا!..... اگر آپ یہاں آنا چاہیں تو مجھے خوشی ہو گی۔'' پاشا نے کاشف راجپوت کو دعوت دی تھی۔

کاشف راجپوت کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''شکریہ پاشا، میں یہاں ٹھیک ہوں۔ کبیر دادا نے بھی یہی دعوت دی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا۔''

''مجھے اجازت دیں گے۔'' اس نے دوبارہ کاشف دادا سے اجازت طلب کی۔

کاشف نے کہا۔ ''تمھیں میری اجازت کی ضرورت نہیں تھی، بہ ہر حال عزت افزائی کا شکریہ پلیز

تشریف رکھیں۔''

پاشا نشست سنبھالتا ہوا بولا۔''چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا ہے، شاید آپ لوگوں نے پہلے بھی سنا ہو۔ ایک شخص بوڑھے باپ سے جان چھڑانے کے لیے اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر پہاڑ پر لے گیا۔ جب وہ باپ کو نیچے پھینکنے لگا تو اس کے ساتھ موجود بیٹے نے کہا۔''رسی دادا کے ساتھ نیچے نہ پھینک دینا۔'' باپ نے پوچھا۔''کیوں بیٹا؟''

کہا۔''جب آپ بوڑھے ہو جاؤ گے تو بغیر رسی کے آپ کو یہاں تک کیسے گھسیٹ کر لاؤں گا۔''

''پتا نہیں یہ واقعہ کیوں یاد آ گیا۔ خیر میں کہنے لگا تھا کہ کبیر دادا کا قاتل یا وہ لوگ جو اس سازش میں شریک تھے میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ باقی چند دن پہلے کبیر دادا نے یہاں بیٹھ کر کچھ باتیں کی تھیں۔ وہ سب کو یاد ہوں گی اس لیے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ احکامات اسی طرح جاری رہیں گے۔ آخر میں سب کو متنبہ کر دوں کہ کبیر دادا کی بیوی میری چھوٹی بہن ہے۔ اگر اس کے خلاف کسی کے گندے دماغ میں کوئی غلیظ خیال رینگا، یقین مانو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔ میں صرف متعلقہ شخص کو نہیں اس کے پورے خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹا دوں گا مع دودھ پیتے بچوں کے۔ یہ میرا آخری اور واضح پیغام ہے۔ اور عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میری باتوں سے اختلاف رکھنے والا اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔''

کسی نے بھی زبان کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو تین لمحے انتظار کے بعد پاشا نے کہا۔''تو، بیٹھک ختم ہوئی۔''

سارے ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ صرف کاشف راجپوت وہیں بیٹھا رہا۔ تنہائی ملتے ہی وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''پاشا، تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں، کبیر دادا کو وداع کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا، لیکن مجبور تھا۔ میرے پاس چناؤ کا اختیار ہی نہیں رہا تھا۔''

کاشف نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔''جانتے ہو اب تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔''

''آپ کے سہارے نے حوصلہ دیا ورنہ اتنی ہمت نہ کر پاتا۔''

کاشف راجپوت چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔''ہوشیار رہنا، کچھ لوگوں کو تم بہت زیادہ کھٹک رہے ہو۔'' یہ کہتے ہی وہ چل پڑا۔ اس نے پاشا کا جواب سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

Pakistanipoint.com

☆☆☆

دونوں بیٹھک کے اختتام پر اخلاق حسین کے ٹھکانے پر پہنچے تھے۔ ''مجھے تو پاشا کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔'' بیٹھتے ساتھ اخلاق حسین نے تشویش ظاہر کی۔

نوشاد آفریدی تپتا ہوا بولا۔ ''بھاڑ میں گئے تیور، مجھے تو اس پھل جھڑی کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ کبیر دادا جیسے سانپ کو مار کر بھی خزانہ پہلے جتنا ہی دور دکھائی دے رہا ہے۔''

اخلاق حسین اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ''ہمیں انتظار کرنا پڑے گا، ابھی وہ جذباتی ہو رہا ہے۔ تازہ تازہ استاد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے حرامی نے۔ سنبھلنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔ آہستہ آہستہ بھولے گا اس حادثے کو بھی اور اپنی منہ بولی بہن کو بھی۔ تب کچھ کریں گے۔''

نوشاد نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''دل چاہتا ہے اس سے شادی کر لوں۔''

''بکواس نہ کرو، میں بھی اس کا امیدوار ہوں۔'' اخلاق حسین اسے ڈانٹے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

نوشاد نے منہ بنایا۔ ''دماغ خراب کر دیا فاحشہ نے۔ جتنی کوششیں کی ہیں اتنا ہی قابو سے باہر ہوتی گئی ہے۔ کاش کبیر دادا سے پہلے اس پر میری نظر پڑ جاتی۔''

''خان صاحب، فی الحال اس کے حصول کی خواہش کو مؤخر کرنا پڑے گا، کیوں کہ پاشا کی دھمکی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔''

اخلاق حسین کے مشورے پر نوشاد نے تائیدی انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

☆☆☆

''اب کیا ارادہ ہے۔'' پاشا اس وقت تناوش کے گھر میں ماں بیٹی کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ رخسار اور باقر بھی وہیں موجود تھے۔

تناوش نے کہا۔ ''ہم کراچی چھوڑنا چاہتے ہیں بھیا!..... آپ یہ گھر بیچ کر کسی دوسرے شہر میں سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ دیں۔'' حیرت انگیز طور پر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

وہ اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ''رہائش کی فکر نہ کرو، تمھیں کبیر دادا کے ترکے میں چھوڑے ہوئے کروڑوں روپے ملیں گے۔''

''ایک پائی بھی نہیں چاہیے، سوائے چاندی کے اس چھلے کے۔'' اس نے انگلی میں پہنے ہوئے چھلے کو ہونٹوں سے لگایا۔

''کیوں؟'' پاشا حیران رہ گیا تھا۔

''کیوں کہ ہمیں حرام کا ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے بیٹا۔'' خاموش بیٹھی بشریٰ نے منہ کھولا۔

Pakistanipoint.com

''جیسا آپ چاہیں ماں جی!'' پاشا سعادت مندی سے بولا۔

تناوش نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کب تک کام ہو جائے گا۔''

''زیادہ سے زیادہ دو دن۔''

تناوش نے کہا۔ ''میں بے چینی سے منتظر ہوں۔''

اس کی بے صبری پر پاشا مسکرا دیا تھا۔ ''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے بہنا، جہاں اتنا برداشت کر لیا، دو دن اور سہی۔''

تناوش نے دکھی لہجے کہا۔ ''کاش کبھی ایسا وقت آئے کہ آپ کو میری بے صبری کا ادراک ہو۔ جو مجھ پر بیت رہی ہے اس سے میں یا میرا رب ہی واقف ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' پاشا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''مگر تم نہیں جانتیں کہ آپ لوگوں کے جانے کے بعد میں کتنا اکیلا اور تنہا رہ جاؤں گا۔''

تناوش افسردگی سے مسکرائی۔ ''اس بارے ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔''

''ہونہہ۔'' کہہ کر پاشا نے بشریٰ کے سامنے سر جھکا دیا۔ ''چلتا ہوں ماں جی۔''

بشریٰ نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جیتے رہو بیٹا۔''

پاشا باہر نکل گیا۔

رخسار اور باقر دروازے پر کھڑے سرگوشیوں میں محو گفتگو تھے۔

باقر نے کہا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ کبیر دادا کے قتل میں پاشا دادا کا ہاتھ ہے۔ نہ جانے باجی کی سمجھ میں یہ کیوں نہیں آ رہا۔''

رخسار نے اسے سمجھایا۔ ''چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے۔ اسے ان چال بازیوں کا کیا پتا۔ اور اگر معلوم ہو بھی جائے تو کیا کر لے گی؟''

باقر نے کہا۔ ''کم از کم پاشا دادا کے چہرے پر موجود نقاب تو ہٹ جائے گی۔ اور اسے خلوص و معصومیت سے بھائی سمجھنے والی کو منافقانہ رشتے سے تو نجات ملے گی۔''

رخسار نے مشورہ دیا۔ ''رہنے دو یار، کل پرسوں تک وہ کراچی چھوڑ دیں گی، نہ واسطہ رہے گا اور نہ منہ بولا رشتہ۔''

باقر نے کہا۔ ''اشارے کنایے میں دو تین دفعہ اسے متوجہ کر چکا ہوں، مگر اتنی بھولی ہے اس کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا۔''

''تم نے ضرور مرنا ہے بے وقوف۔'' رخسار نے اسے ڈانٹا۔ ''آئندہ ایسی کوشش نہ کرنا۔''

Pakistanipoint.com

باقر چپ ہو گیا مگر اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ رات کو اسے تناوش سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ ایک بجے تک پہرہ دیتا اور پھر رخسار کو جگا دیتا اور اس نے صبح تک جاگنا ہوتا۔ تناوش اور اس کی ماں کمرے ہی میں سوتی تھیں۔ رات کے وقت تناوش عموماً صحن میں نکل کر گھومنا شروع کر دیتی۔ اس وقت بھی تناوش بے چین ہو کر کمرے سے باہر نکلی اور صحن میں چکرانے لگی۔

باقر ہمت مجتمع کرتا ہوا قریب پہنچا۔ ''باجی ایک بات کہنا تھی''۔

''کہو بھائی۔'' وہ چونکتے ہوئے متوجہ ہوئی۔

''پہلے وعدہ کریں کہ یہ بات ہمارے درمیان راز رہے گی۔'' باقر نے اپنی حفاظت کی گنجائش باقی رکھنا چاہی۔

''شاید آپ بتانا چاہتے ہیں کہ کبیر کی موت میں بھیا ملوث ہے۔'' نہ جانے اس نے کیسے اتنا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

وہ ہکلایا۔ ''جج..... جی باجی۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''کبیر میرے پاس ہی تھے جب انھیں کال وصول ہوئی کہ جلدی سے ساحل والے اڈے پر پہنچیں۔ اور یہ کال بھیا نے کی تھی۔''

باقر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ پہلے سے جانتی ہیں۔''

''ہاں.....'' اس نے افسردگی سے سر ہلا دیا۔

''کم از کم انھیں جتانا تو تھا۔''

''وہ جانتے ہیں کہ مجھے پتا ہے۔ لیکن مجھے وہ چھوٹی بہن ہی کی طرح چاہتے ہیں۔ ان سے دشمنی کر کے میں کبیر کو تو واپس نہیں لا سکوں گی البتہ بھائی اور ان کی ہمدردیوں کو کھو دوں گی۔ کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں مکمل طور پر بے آسرا رہ جاؤں۔''

''نن..... نہیں باجی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' باقر گڑبڑا گیا تھا۔

''بھائی، آپ کی ہمدردی پا کر اچھا لگا۔ اور اگر میری خوشی عزیز ہے تو کبھی بھیا کے ساتھ غداری نہ کرنا۔''

باقر نے خفت سے سر جھکا لیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا کچھ جانتی ہو گی۔ اس کے حوصلے اور ہمت سے بھی وہ خاصا متاثر ہوا تھا۔ محبت کرنے والے شوہر کو کھو کر بھی اس اعصاب کسی جہاں دیدہ عورت کی طرح کام کر رہے تھے۔

☆☆☆

Pakistanipoint.com

تناوش سے ملاقات کے دوسرے دن رات کے دو بجے پاشا کو گمنام نمبر سے کال وصول ہوئی۔ اس کے ''ہیلو'' کہتے ہی ایک شناسا آواز ابھری۔

''میں تین بجے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''میں منتظر ہوں۔'' رابطہ منقطع کر کے وہ سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کار میں تناوش کے گھر کی طرف روانہ تھا۔ محافظوں کو اس نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ تناوش کے گھر کے سامنے کار رکتے ہی باقر نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ آٹو میٹک رائفل اس نے تیار حالت میں پکڑی ہوئی تھی۔ مگر کار سے پاشا کو اترتا دیکھ کر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

''دونوں اپنے ٹھکانے پر پہنچو۔'' پاشا نے اندر گھستے ہی اسے حکم دیا۔

''جی دادا۔'' کہہ کر وہ سوئے ہوئے رخسار کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش بھی ان کی آواز سن کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

''بھیا.....'' اس نے سوالیہ انداز میں پکارا۔

''ہاں گڑیا میں ہوں۔ امی جی کو بھی جگاؤ آپ لوگ ابھی یہاں سے روانہ ہوں گے۔''

''جی بھیا۔'' تناوش کے لہجے میں شامل خوشی باقر اور رخسار کو حیران کر گئی تھی۔ وہ زیادہ سوچنے کی زحمت کیے بغیر باہر نکل گئے۔ سڑک کر چڑھتے ہی انھیں خالی رکشا مل گیا تھا۔

پاشا، ماں بیٹی کا ہاتھ بٹانے کے لیے کمرے میں داخل ہوا مگر وہ سر شام ہی سارا سامان سمیٹ چکی تھیں۔

''کتنی دیر ہے بھیا۔'' تناوش نے بے صبری سے پوچھا۔

''تین بجے تک تمھیں لینے گاڑی پہنچ جائے گی۔''

تناوش نے موبائل کی سکرین روشن کرتے ہوئے وقت دیکھا۔ تین بجنے میں چند منٹ ہی رہتے تھے۔ اور پھر اس کی سماعتوں نے گلی میں گاڑی رکنے کی آواز سنی۔ وہ بے صبری سے دروازے کی طرف بھاگی۔ پاشا اور بشریٰ اس پر ہنس پڑے تھے۔

دروازے تک وہ دوڑتے ہوئے گئی۔ اسی وقت دروازے کو دھکیلتا ہوا شلوار قمیص میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔

تناوش اس کی طرف یوں لپکی جیسے لوہا مقناطیس کی طرف بڑھتا ہے اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں تھی۔

''کبیر.....'' تناوش کے لہجے میں محبت، بے صبری، بے تابی، خلوص اور نہ جانے کون کون سی کیفیات

شامل تھیں۔

''کبیر کی جان۔'' آنے والے نے محبت بھرے انداز میں اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور اس کے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔ اسے سر سے بلند کر کے وہ ہنسا۔

''مجھے یاد کیا تھا۔''

تناوش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بھولے ہی نہیں تھے یاد کیا کرتی۔''

''جھوٹی۔'' شرارتی انداز میں کہتے ہوئے اسے نیچے اتار کر وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پاشا کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ قریب پہنچتے پر وہ اس سے لپٹ کر رو پڑا۔

''پگلے روتے کیوں ہو۔'' کبیر دادا نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

پاشا نے سسکی بھری۔ ''آپ نے میرے کبیر دادا کو مار دیا۔''

کبیر دادا آب دیدہ ہو کر بولا۔ ''ہاں، مگر اس کے بدلے تمھیں بڑے بھائی کا تحفہ بھی تو دیا ہے۔''

''بھیا، آپ لوگوں کی بہت یاد آئے گی۔'' زندگی میں پہلی بار اس نے کبیر دادا کو بھائی کہا تھا۔

کبیر دادا نے اس کے ماتھے پر بوسا دے کر علیحدہ کیا۔ ''خوب دیکھ بھال اور سمجھ داری سے وقت گزارنا۔''

''جی بھیا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو سامان گاڑی میں رکھو۔'' پاشا کو کہہ کر وہ بشریٰ کی جانب بڑھا۔ ''ماں جی، آپ تیار ہیں۔''

''ہاں بیٹا، پچھلے کئی دنوں سے منتظر تھی۔ اور اس پگلی سے تو ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ اچھا ہے تمھارا نیا موبائل فون نمبر اس کے پاس نہیں تھا ورنہ ضرور بھانڈا پھوڑ دیتی۔''

''ماں جی، لگا لیں شکایتیں۔ دیکھ لوں گی آپ کو۔'' تناوش نے دھمکی دینے میں دیر نہیں کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ سوزوکی وین میں اپنا سامان منتقل کر چکے تھے۔ پاشا سے ایک بار پھر محبت بھرے انداز میں مل کر کبیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تناوش بھی بے ساختہ پاشا کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

''بھیا، اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

''تم بھی۔'' اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر پاشا نے اس کے لیے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

آنکھوں میں نمی لیے وہ اچک کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بشریٰ پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ الوداعی ہاتھ لہرا کر کبیر نے وین آگے بڑھا دی۔ پاشا وہیں کھڑا وین کی عقبی بتیوں کو گھورتا رہا۔ وین کے موڑ مڑتے ہی وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''گڑیا، میں دیکھتے ہی جان گیا تھا کہ تم ایسا ہی کچھ کرو گی۔ جہاں رہو خوش رہو میری

Pakistanipoint.com

پیاری بہنا۔''

وہ اب تک وہیں کھڑا تھا۔اچانک ایک کار گلی میں داخل ہوئی اور اس کے قریب آ کر رک گئی۔دو آدمی باہر نکلے۔

ایک نے کہا۔''کام ہو گیا دادا۔''

''تو شروع ہو جاؤ۔''اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

دونوں نے کار کی عقبی نشست سے دو عورتوں کی لاشیں نکالیں اور گھر کے اندر لے گئے۔تھوڑی دیر بعد واپس آ کر انھوں نے کار کی ڈگی سے پٹرول کے کین نکالے اور دوبارہ اندر گھس گئے۔چند منٹ بعد گھر میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔دونوں کاروں کے مکین آگ کا تماشا دیکھنے کے لیے رکے نہیں تھے۔

☆☆☆

(کبیر دادا کی موت سے ہفتہ پہلے)

رات کو کبیر دادا کے سینے پر سر دھرے وہ چاہت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔''میرے لیے کیا قربان کر سکتے ہیں؟''

''تم جانتی ہو۔''کبیر دادا کا جواب حسبِ منشا تھا۔

''کیا یہ سارا ٹھاٹ باٹ، یہ گاڑیاں بنگلے، عیش و آرام کی زندگی یہ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں؟''

وہ بے بسی بھرے لہجے میں بولا۔''ہاں مگر اس کے لیے جان کی قربانی بھی دینا پڑے گی۔''

''عیش و آرام کی زندگی ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔خوب صورت لباس، قیمتی زیورات، حکم ماننے کے لیے نوکروں کی قطار، پُرتعیش خواب گاہ، آرام دہ گاڑیاں یہ سپنوں کی دنیا ہے، زمین ہی پر جنت۔مگر کبیر میری جان! حرام کی دولت پر یہ عیش و آرام ہم کب تک کر پائیں گے۔ایک دن مرنا تو ہے۔کیا ہمارے پاس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے کوئی جواز کوئی بہانہ موجود ہے۔''

کبیر ہنسا۔''لگتا ہے میری زندگی سے تنگ آ گئی ہو۔''

''اگر میں کہوں ہاں، میرے لیے کبیر دادا کو قتل کر دیں تو کیا جواب ملے گا؟''

اس کے ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''کم از کم ناں میں جواب نہیں ملے گا۔''

اس کا چہرہ ملائم ہاتھوں میں بھرتی ہوئی وہ وارفتگی سے بولی۔''اب پیچھے نہ ہٹنا۔''

وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔''کبیر تمھیں پیچھے ہٹنے والا لگتا ہے۔''

''تو سنیں۔''وہ اسے اپنا منصوبہ بتانے لگی۔

اس کی بات کے اختتام پر کبیر دادا نے ہنستے ہوئے کہا۔''یاد ہے ایک دن عظیم کے بیگم صاحبہ کہنے

Pakistanipoint.com

پرتم نے کہا تھا کہ تمھیں تناوش دادی کہا کریں۔''

''ایسے ہی مسخری کر رہی تھی۔'' اس کے ہونٹوں پر حیا آلود مسکراہٹ ابھری۔'' آپ تو کمرے میں گئے تھے، کس نے بتایا۔''

''خود سنا تھا اور بڑی مشکل سے قہقہہ روکا تھا۔''

تناوش وارفتگی سے بولی۔''اور یاد بھی رکھا۔''

''تمھاری کوئی بات بھول سکتی ہے۔'' کبیر دادا نے حسب عادت اس کی ناک کی پھننگ کو مروڑا۔

''یاد کیوں دلایا۔''

''تمھاری تجویز سن کر لگا تناوش دادی والا نام خوب جچے گا۔ گینگ کے ارکان یوں بھی تمھاری سفارش سے کام نکلوانے لگے ہیں۔''

''میں سب کی باجی ٹھیک ہوں۔ خوامخواہ میرا مذاق نہ بنوائیں۔''

''باجی بھی تو بڑی بہن کو کہتے ہیں۔ اور تم اتنی سی ہو۔'' کبیر دادا نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھ کر اشارہ کیا۔

''تنگ نہ کریں اور یہ بتائیں کہ میری تجویز پسند آئی کہ نہیں۔''

''جو خود پسند ہو اس کی ہر بات ہی پسند ہوتی ہے۔''

''مطلب پکا ہو گیا۔''

''کہہ تو دیا ٹھیک ہے یار۔ بس پاشا کو سمجھانا پڑے گا۔''

''وہ میرا کام ہے۔'' مطمئن انداز میں کہتے ہوئے تناوش آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

''بھیا، آپ کہاں ہیں۔'' چائے پیتے ہوئے اسے تناوش کی کال موصول ہوئی تھی۔

اس نے پوچھا۔''میں اپنے کمرے میں ہوں، کیا دادا چلے گئے ہیں؟''

''ہاں۔'' تناوش کا جواب اثبات میں تھا۔

''اچھا میں آ رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تناوش نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ اور پاشا کے نشست سنبھالتے ہی بیٹھ گئی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''کہو، کیا بات ہے۔''

''بھیا، میں انھیں جرم کی دنیا سے نکالنا چاہتی ہوں۔'' تناوش نے بغیر کسی تمہید کے مطلب کی بات

پر آ گئی۔

''کیا.....؟'' پاشا ششدر رہ گیا۔ ''ایسا ہونا ناممکن ہے گڑیا۔''

''ناممکن تو کبیر کا شادی کرنا بھی تھا، ناممکن مجھے بیوی کا درجہ ملنا بھی تھا، ناممکن تو آپ کا مجھے بہن بنانا بھی تھا، ناممکن تو شمشیر دادا کا شکست کھانا بھی تھا..... جب اتنے سارے ناممکن ہو سکتے ہیں تو یہ بھی ہو جائے گا۔''

پاشا نے پوچھا۔ ''کیا تم نے دادا سے بات کی ہے؟''

''ہاں، انھوں نے بھی یہی کہا جو آپ کہہ رہے ہیں۔''

''تو پھر تمھاری سمجھ میں آ جانا چاہیے۔''

تناوش کے چہرے پر حسرت نمودار ہوئی۔ ''دل کو کیسے سمجھاؤں۔''

پاشا فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''دل کی ماننے والے گھاٹے میں رہتے ہیں۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''تب، جب دماغ دل کی مخالفت کر رہا ہو۔''

''اگر تمھیں خطرے کا اندازہ ہوتا تو یقیناً تم ایسا نہ سوچتیں۔''

''میری تجویز سننے کے بعد اگر آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو میں کبھی بھی کبیر کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔''

''بولو۔'' پاشا کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بے دلی سے بولا۔

تھوڑا سا سوچ کر تناوش اپنا منصوبہ بیان کرنے لگی۔ جوں جوں اس کی بات آگے بڑھتی گئی پاشا کی دلچسپی سوا ہوتی گئی۔ بات کے اختتام پر پاشا نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا کبیر دادا کو راضی کر سکتی ہو۔''

وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں انھیں زہر کا بھرا پیالہ پینے کو کہوں تو بھی مجھے ناں سننے کو نہیں ملے گی۔''

پاشا نے پوچھا۔ ''وجہ؟''

''کیوں کہ ان کے لیے جان دینا مجھے اتنا آسان لگتا ہے جتنا باورچی خانے میں جا کر چائے بنانا۔ اور وہ مجھ سے بڑھ کر مجھے چاہتے ہیں۔''

پاشا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے انھیں تیار کرو۔''

وہ مسکرائی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ وہ تیار ہیں۔''

اور پھر پاشا اور کبیر دادا کی مصنوعی چپقلش ہوئی۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے پاشا

Pakistanipoint.com

نے اخلاق حسین اور نوشاد کا ساتھ ڈھونڈا۔ اور جب پاشا نے کبیر دادا کو ساحل والے اڈے کی جانب بلایا، اس وقت ایک ویران سڑک پر وہ کبیر دادا کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی کار کی ڈگی میں ایک لاش چھپائی ہوئی تھی۔ کبیر دادا اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ جیبوں میں موجود سامان اس نے لاش کے کپڑوں میں منتقل کر دیا تھا۔ ذرا دور جا کر انھوں نے ریموٹ کنٹرول بم سے کار اڑا دی۔ کبیر دادا کو اس نے بس اڈے پر اتار دیا۔ کبیر دادا بس میں بیٹھ کر مانسہرہ روانہ ہو گیا جہاں ایک دور دراز گاؤں میں اس نے گھر وغیرہ خریدنا تھا۔ اس سارے منصوبے کی روحِ رواں تناوش ہی تھی۔ صرف نئے شہر کے بارے انھوں نے مل کر طے کیا تھا۔ آخر وہ اپنے کبیر کو جرم کی دنیا سے نکال کر لے گئی تھی۔

☆☆☆

رات کے وقت بھی اچھی خاصی ٹریفک تھی۔ ایک بغلی سڑک پر دو موٹر سائیکل سوار ان کی وین سے ٹکراتے ٹکراتے بچے تھے۔ دونوں نوجوان کافی بگڑے ہوئے تھے۔

''اندھا ہے کیا۔'' موٹر سائیکل چلانے والا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

''بتاتا ہوں۔'' کبیر دادا نے ہینڈ بریک کھینچ کر دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ان احمقوں کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کسے مخاطب ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ کبیر دروازہ کھولتا۔ تناوش نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''کبیر۔'' اس کی محبت بھری سرگوشی کسی موٹی زنجیر سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ وہ ایک دم اس کی جانب متوجہ ہوا۔ تناوش کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکان ابھری۔

''آپ وعدے سے پھر رہے ہیں۔''

کبیر نے بے بسی سے سر جھکا لیا تھا۔ تناوش کھڑکی سے چہرہ نکال کر ان لڑکوں کو مخاطب ہوئی۔

''بھائی، معذرت چاہتی ہوں غلطی ہماری ہے۔ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔''

لڑائی کے لیے تیار لڑکوں کے چہروں پر ہلکی سی ندامت ابھری کہ انھیں بھی اپنی غلطی معلوم تھی۔ موٹر سائیکل چلانے والا فوراً بولا۔

''کوئی بات نہیں بہن جی، بچت ہو گئی ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

''اتنی سی بات تھی۔'' تناوش نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''میں ہوں نا آپ کی ڈانٹ کھانے کے لیے۔ میرے کبیر کا غصہ سستا نہیں ہے کہ ہر ایرے غیرے پر لٹاتا رہے۔''

وہ ہنسا۔ ''اتنی بڑی نہیں ہو جتنی بڑی باتیں کرتی ہو۔''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''عورت کبھی چھوٹی بڑی نہیں ہوتی جناب، وہ بے چاری تو ہمیشہ شوہر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ بادشاہ کی بیوی، وزیر اعظم کی بیوی، سپہ سالار کی بیوی، بھکاری کی بیوی

وغیرہ وغیرہ۔اور میں جس کی بیوی ہوں اس کا رتبہ تو بہت بڑا ہے نا اور اتنا ہی میرے لیے کافی ہے۔''

''یہ بھی خوب کہی۔'' کبیر نے قہقہہ لگایا۔''بھول جاؤ رتبے کو۔''

وہ عقیدت مندی سے بولی۔''اپنا رتبہ اور مقام دیکھنے کے لیے میرے دل میں جھانکیں جی۔''

اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔''اپنی نہیں، لوگوں کی بات کرو۔''

تناوش نے فوراً پوچھا۔''آپ کے نزدیک میں اہم ہوں یا لوگ؟''

وہ محبت سے بولا۔''تمھیں معلوم ہے۔''

''تو پھر لوگوں کی فکر کس لیے؟''

''دفع کرو لوگوں کو، یہ بتاؤ اس دن تمھارے لیے اتنی خریداری کی تھی کیا سارا سامان وہیں چھوڑ آئی ہو؟''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''پاشا نے بتایا ہے۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔''ہاں، میں نے حرام کی دولت سے خریدی ہوئی کوئی بھی چیز ساتھ نہیں لی۔اس موبائل فون کی قیمت بھی پاشا بھائی کو ادا کر دی تھی۔کیوں کہ نئی زندگی کی ابتداء میں حلال کے پیسے سے کرنا چاہتی ہوں اور یہی امی جان کی بھی منشا ہے۔''

کبیر نے عقبی شیشے میں سیٹ سے ٹیک لگا کر اونگھتی ساس پر نگاہ دوڑائی۔نہ جانے اسے سچ مچ نیند آ رہی تھی یا وہ ان دونوں کو آزادی سے بات چیت کرنے کا موقع دینے کے لیے سوتی بنی ہوئی تھی۔

''تمھارا گھر بیچ کر جو رقم وصول ہوئی تھی، اس سے گزارے لائق دین اور ایک کنال زمین خریدی ہے جس پر ابھی تک گھر بنانا ہے۔''

''گھر بنانے کے لیے پیسے نہیں بچے۔''

''کچھ رقم بچ بھی گئی ہے، ان شاء اللہ گھر بن جائے گا۔''

''جب تک گھر نہیں بنے گا رہیں گے کہاں؟''

''جس سے زمین خریدی ہے اس کی بیٹھک چند دنوں کے لیے مانگ لی ہے۔گزارا کر لوگی۔''

''میں آپ کے ساتھ کھلے میدان میں بھی رہ لوں گی۔اور سچ کہوں چھوٹے گھر میں رہنا آپ کے لیے مسئلہ ہے ہم تو عادی ہیں۔'' اس کا مضبوط ہاتھ وہ پیار بھرے انداز میں سہلانے لگی۔

☆☆☆

''بہت برا ہوا یار، میں نے سوچا بھی نہیں تھا پاشا اتنا نیچ، لالچی اور کمینہ نکلے گا۔'' نوشاد کے چہرے

پر گہری پریشانی نظر آ رہی تھی۔

اخلاق نے پھیکے لہجے میں کہا۔ ''وہ اپنی قسمت ہی میں نہیں تھی یار۔''

نوشاد خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''اس ظالم نے کبیر دادا کی دولت و جائیداد کے لیے منہ بولی بہن کو جلا دیا تو اور کسی کے ساتھ کیا اچھائی کرے گا۔ اب سنبھل کر رہنا ہوگا بھائی، یہ کسی اور ذہن کا مالک ہے۔''

اخلاق نے کہا۔ ''صحیح کہہ رہے ہو خان صاحب، اب تو پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کبیر دادا کے بجائے اس کا پتا کاٹنا چاہیے تھا۔''

''شاہ جی، میرے ہاتھ تو کھڑے ہیں، ایسے ظالم کے خلاف کیا سازش کریں گے۔ اور جانتے ہو اس دن کی بیٹھک میں صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ کبیر دادا کے خلاف سازش کرنے والوں کو معاف نہیں کرے گا۔ اور یہ وہ ہمیں سنا رہا تھا۔''

''اب محتاط ہی رہیں گے خان صاحب، یوں بھی دل کی حسرتیں تو دل ہی میں رہ گئیں۔ اس شہزادی کے پھولوں جیسے بدن کو آگ لگاتے وقت دل بھی نہیں کانپا ظالم کا۔ جنازے پر بھی کس بے حیائی سے چہرے پر افسوس طاری کیا ہوا تھا بے غیرت نے۔'' اخلاق حسین نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

نوشاد آفریدی اکثر وہ چہرہ لیے خاموش بیٹھا رہا۔ تناوش کے حصول کی تمام کوششیں رائیگاں گئی تھیں اور اب وہ ہی نہیں رہی تھی تو کوشش کیا کرتے۔

☆☆☆

ابتدائی دو تین ماہ انھیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو بتدریج ختم ہوتی گئیں۔ کبیر نے پرانی زندگی کو یوں بھلا دیا تھا جیسے وہ کبھی غلط کاموں میں ملوث ہی نہ رہا ہو۔ تناوش کی محبت بھری توجہ نے اس کے دل میں کبھی عیش و آرام کی زندگی چھوڑنے کا ملال پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اپنے کبیر کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتی اور اتنی خدمت کرتی کہ بعض اوقات وہ شرمندہ ہو جاتا۔ کریانہ کی دکان کھولنے کے ساتھ وہ سوزکی وین پر گاؤں کے چند بچوں کو شہر کے اسکول لے جاتا لاتا بھی تھا۔ ان کی گزر اوقات بہت اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ تناوش کے زور دینے پر اس نے قرآن مجید دوبارہ حفظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ دیکھ کر وہ خود ہی حیران رہ گیا تھا کہ تین چار ماہ میں اسے پورا قرآن مجید دوبارہ یاد ہو گیا تھا۔ رمضان شریف میں تراویح کی امامت کراتے ہوئے جہاں اس کی خوش الحانی موضوع بحث بنی ہوتی وہیں اس رقیق القلبی کو بھی یاد کیا جاتا۔ دوران تلاوت وہ بے ساختہ رونا شروع ہو جاتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ تناوش نے اسے ایک خوب صورت بیٹی کا تحفہ بھی دیا تھا جس کا نام تناوش نے اس کی بہن اسماء کے نام پر رکھا تھا۔ تناوش بعض اوقات پاشا کو یاد کر کے رو پڑتی

تھی ۔وہ اسے سچ مچ اپنے بھائی شاہ نواز کا نعم البدل لگتا تھا ۔ ایک دن تناوش کو پڑوسی عورت کی زبانی کراچی میں رینجرز کے آپریشن کے بارے پتا چلا ۔وہ سارا دن بے چین رہی تھی ۔رات کو لیٹتے وقت وہ کبیر سے اس موضوع پر بات کرتی رہی ۔

''دیکھو چندا، وہ کوئی بچہ نہیں ہے ۔آتے وقت اس سے وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کام کو چھوڑ دے گا مگر جب وہ نہیں چھوڑنا چاہتا تو میں کیا کر سکتا ہوں ۔''

وہ سسکی ۔''دعا تو کر سکتے ہو نا ۔''

''کیا نہیں کرتا ۔پگلی !''اس کی ناک کی پھننگ مروڑتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔

اس کے بعد وہ روز نہ خبریں سننے پڑوسیوں کے گھر چلی جاتی ۔ایک دن اس نے بہرام پاشا کی گرفتاری کی خبر سنی ۔اس دن وہ بہت روئی تھی ۔دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر رب کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے جانے کتنی دیر وہ مناجات میں مصروف رہی ۔اپنے بھائی کی خیریت اور اس کے راہِ راست پر لوٹنے کی دعائیں مانگتی رہی ۔مگر شاید اس کی دعاؤں میں اثر ختم ہو گیا تھا یا وہ پہلے ہی ضرورت سے زیادہ لے بیٹھی تھی ۔کہ پاشا کی گرفتاری کے ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ اس کے پھانسی ہو جانے کی خبر سن رہی تھی ۔رینجرز کے حکام نے بڑی سرعت اور تیزی سے گینگسٹرز کے خلاف کارروائیاں کی تھیں ۔

چند دنوں میں بہرام پاشا کی پھانسی کی خبر پرانی ہو گئی تھی ،مگر تناوش کے سینے میں لگنے والا یہ زخم اتنی جلدی نہیں بھر سکتا تھا ۔

پاشا کی پھانسی کو دو ماہ ہونے کو تھے ایک دن وہ گھر کے کام ختم کر کے اسماء کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی ۔

بشریٰ نے کہا ۔''ٹھہرو میں دیکھتی ہوں ۔''

''نہیں ماں جی، آپ اسے پکڑیں ۔''اسماء ماں کے حوالے کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی ۔

''کون ؟''دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے آواز دی ۔

نسوانی آواز نے پوچھا ۔''یہ کبیر صاحب کا گھر ہے ۔''

''جی ہاں ۔''اس نے دروازہ کھول دیا ۔یوں تو کبیر کو تمام گاؤں والے حافظ صاحب کہہ کر بلاتے تھے ،وہ عورت یقیناً مقامی نہیں تھی ورنہ یوں مخاطب نہ کرتی ۔

دروازے پر کالا نقاب اوڑھے ایک جوان لڑکی کھڑی تھی ۔

''اندر آجائیں بہن ۔''اس نے ایک طرف ہو کر رستا دیا ،مگر اس کے پیچھے راحت خالہ کو دیکھتے ہی

ماہنامہ ''حکایت'' میں قسط وار چھپنے والا تہلکہ خیز ناول
جس کی ہر قسط کا قارئین کو شدت سے انتظار رہتا ہے۔

ریاض عاقب کوہلر کے سحر انگیز قلم سے

رکھیل

ایک نازک اندام حسینہ کے عزم و ہمت کی داستان
جو ایک پتھر دل میں محبت کی کونپل اگانے چلی تھی۔

اب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قیمت: 800 روپے
صفحات: 320 بڑا سائز

کتاب منگوانے کے لئے: 0323-4329344

وہ چیخ پڑی تھی۔ ''راحت خالہ۔'' وہ شدت سے لپٹ گئی تھی۔

''چل ہٹ بے وفا۔'' راحت خالہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔ ''پچھلے دو سال سے خالہ اپنی بیٹی کی موت کا سوگ منا رہی ہے۔ اب آ کر پتا چلا کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔''

''اچھا آئیں بیٹھیں تو سہی۔'' ندامت بھری ہنسی سے وہ انھیں کھینچنے لگی۔

''میرا شوہر بھی ساتھ ہے۔'' جوان لڑکی اسے مخاطب ہوئی۔ نہ جانے کیوں تناوش کو وہ دیکھی بھالی ہوئی لگ رہی تھی۔

''اندر بلالو بہن۔'' وہ سر پر دوپٹا درست کرنے لگی۔

''آجائیں جی۔'' لڑکی نے آواز دی۔ چہرے پر مفلر لپیٹے ایک لمبا تڑنگا مرد دو بھاری بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ مفلر لپٹے چہرے پر نظر پڑتے ہی تناوش کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے کسی اپنے کی یاد دلا دی تھی۔ اس کی نظریں اجنبی مرد کے چہرے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اس نے تناوش کا زیادہ امتحان نہیں لیا اور اپنے چہرے پر لپٹا مفلر کھول دیا۔

''بھیا!'' تناوش کی چیخ سے صحن گونج اٹھا تھا۔ اس سے لپٹتے ہوئے وہ بے ساختہ رو پڑی۔

''ارے پاگل روتی کیوں ہو۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تھوڑی دیر ہوگئی ہے مگر وعدے کے مطابق آ تو گیا ہوں۔''

''آپ کے متعلق بہت بری خبر سنی تھی۔'' گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ پیچھے ہوئی۔

''اچھی خبر میں سنا دیتا ہوں۔'' اس نے کالے نقاب میں ملبوس لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ اسی وقت لڑکی نے نقاب ہٹایا اور تناوش، رخسانہ بھابی کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ شہاب قصوری کی بیٹی تھی۔

''اچھا مجھے ساری بات بتائیں نا؟'' رخسانہ سے ملتے ہی وہ پاشا کے سر ہوگئی۔

''اس بارے بعد میں بات کرتے ہیں۔ پہلے میں ماں جی سے مل لوں۔'' وہ بشریٰ کی طرف بڑھ گیا۔ تناوش کبیر کو بلانے کے لیے کال کرنے لگی۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے وہ اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ رینجرز کا آپریشن شروع ہوتے ہی اس نے آئی جی رینجرز سے ملاقات کی اور وعدہ معاف گواہ بن کر تمام گینگسٹرز کو پکڑوانے کی آفر کردی۔ آئی جی رینجرز نے اس کی پیش کش قبول کرنے میں تامل نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد وہ واپس اپنے ٹھکانے پر چلا گیا اور تمام گینگسٹرز کی مخبری کر کے گرفتار کرواتا رہا۔ تاہم کاشف راجپوت کو اعتماد میں لے کر اس نے ساری بات بتائی اور اسے لندن فرار کروا دیا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے منصوبے کے مطابق رینجرز کو گرفتاری دی۔

Pakistanipoint.com

اپنے تمام دھندوں کے ثبوت، بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات اور ہر چیز کے بارے اس نے آئی جی رینجرز کو بلاکم وکاست بتا دیا تھا۔ اس سچائی، خلوص اور ایمانداری سے سرکار کا ساتھ دینے پر اسے معافی مل گئی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے پھانسی لگنے کا ڈراما رچایا تاکہ کوئی بچا ہوا دشمن انتقام وغیرہ کے لیے اسے ڈھونڈتا نہ رہے اور پھر آئی جی رینجرز ہی کی وساطت سے اسے ایک نئی شناخت مل گئی تھی۔

''جانتی ہو میرا نیا نام کیا ہے؟'' وہ تناوش کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا کہہ سکتی ہوں بھیا۔'' اس نے لاعلمی کے انداز میں سر ہلایا۔

''اگر تمھیں، میرا نام رکھنے کا کہا جاتا تو کیا رکھتیں؟''

''شاہ نواز۔'' تناوش نے بغیر سوچے دل کی بات ہونٹوں سے نکال دی۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ جس پر شاہ نواز ولد محمد رفیق لکھا ہوا تھا۔

''بھیا۔'' تناوش نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا تھا۔

''جانتی ہو اس شناختی کارڈ کا نمبر اور ساری تفصیلات، شاہ نواز بھائی ہی کی ہیں۔ آپ لوگوں کے کراچی سے آتے وقت میں نے امی جان سے شاہ نواز بھائی کا شناختی کارڈ مانگ لیا تھا۔ اور اب میں قانونی طور پر تمھارا بڑا بھائی ہوں۔ اس لیے خیال کرنا، غلطی کرنے پر سخت پٹائی ہو سکتی ہے۔''

کبیر نے پوچھا۔ ''اوے پٹائی والے بھائی صاحب، اپنے سسر صاحب کے بارے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ شہاب قصوری صاحب کا کیا ہوا۔''

''آپ لوگوں کے کراچی چھوڑنے کے تین ماہ بعد دل کے دورے سے وہ انتقال کر گئے تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد ہی یہ محترمہ میرے گلے پڑیں۔'' پاشا نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے ماحول میں چھائی اداسی دور کرنے کی کوشش کی۔

کبیر دادا صاف گوئی سے بولا۔ ''محترم، گھر میں تین کمرے ہیں ایک کمرہ میرے اور تناوش کے زیر استعمال ہے، ایک میں اماں جی ہوتی ہیں اور اب راحت خالہ بھی ان کے ساتھ رہ لیں گی۔ تیسرے کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنے لیے صاف کر لینا اور جلد از جلد کوئی کام ڈھونڈو، پرانی عیاشیوں کو بھول جاؤ۔''

''کام کرتی ہے میری جوتی، اب بھی کروڑ پتی ہوں۔'' پاشا نے فخر سے چھاتی چوڑی کی۔

''گویا حرام سے اب تک پیچھا نہیں چھڑا پائے۔'' کبیر دادا نے اسے ملامتی نظروں سے گھورا۔ تناوش بھی افسوس بھرے انداز میں اسے تکنے لگی تھی۔

Pakistanipoint.com

''اللہ نہ کرے، کیسی بات کر رہے ہیں۔'' پاشا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''حکومت کی طرف سے دس کروڑ نقد انعام ملا ہے۔''

''بھیا!..... پازیپ، بندیا، موتیوں کا ہار اور بندے لینے ہیں۔'' تناوش فوراً اس کا بازو پکڑتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

کبیر دادا نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ہاں اسے لے کر دو تاکہ لونگ، لاچی والے گانے پر رقص کا وعدہ پورا کر سکے۔''

تناوش منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں لیتی۔'' تمام کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔

پاشا اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اپنی گڑیا کے لیے بہت سے زیورات خریدے ہیں اور اس کے ساتھ بہت سارے کپڑے بھی۔''

''سچ۔'' خوشی سے تناوش کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

پاشا نے کہا۔ ''ہاں اور ایک نیا موبائل فون بھی خریدا ہے، پتا ہے اس میں کون سی وڈیو بھروائی ہے۔''

''کون سی بھیا؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''لونگ لاچی والے گانے کی وڈیو تاکہ میری گڑیا کو وعدہ پورا کرنے میں آسانی رہے۔''

تمام نے زوردار قہقہہ لگایا اور تناوش۔ ''بھیا میں آپ سے بات ہی نہیں کرتی۔'' کہتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

(ختم شُد)

قارئین! ''رکھیل'' ختم ہوا۔ آپ کے خطوط اور فون کالز نے اسے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ اس کی اقساط بے چینی سے انتظار کیا جاتا رہا۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ سے ہم آپ کے لئے محترم ریاض عاقب کوہلر کا نیا معاشرتی ناول ''**لاڈو رانی**'' شروع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

Pakistanipoint.com

طنز و مزاح

بانی ''حکایت'' عنایت اللہ (مرحوم) کی قہقہہ بار تحریر سالنامہ کے لئے خاص

دوستوں کی اس فرمائش پر کہ جنگی اور سنجیدہ مضامین سے ہٹ کر بھی کچھ لکھوں، اپنا ایک مضمون پیش کر رہا ہوں جو آپ کے لئے تو مزاحیہ ہوگا لیکن یہ میرا المیہ ہے۔ (عنایت اللہ)

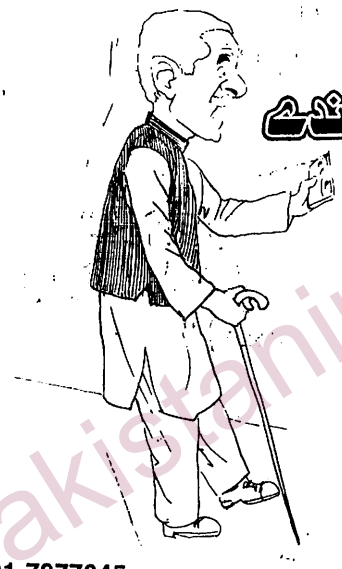

یہ تیرے پُراسرار بندے

0301-7377345

انتخاب: اصغر علی جیدی

نامے جو میرے نام آتے ہیں ان میں اچھے بھی ہوتے ہیں، دلچسپ بھی اور اوٹ پٹانگ بھی۔ جو اچھے لگتے ہیں انہیں پڑھ لیتا ہوں جو اچھے نہیں لگتے انہیں بے دردی سے پھاڑ دیتا ہوں اور ملاقاتی جو میرے ہاں آتے ہیں ان میں بھی خطوں کی طرح بعض اچھے ہوتے ہیں اور بعض اوٹ پٹانگ۔ جو خط اچھا نہیں لگتا اسے تو میں پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں مگر جو ملاقاتی اچھا نہیں لگتا اسے تو میں چیر پھاڑ نہیں سکتا۔ مجھ میں تو اتنی جرأت بھی نہیں کہ ایسے ملاقاتی سے گلوخلاصی کرالیا کروں۔ میں بزدل ہوں جسے علم و ادب کی زبان میں مخلص کہا جاتا ہے۔

میں اگر گلبرگ یا ماڈل ٹاؤن کی کسی کوٹھی میں رہ رہا ہوتا تو میں کوئی ایسا کتا رکھ لیتا جو اچھے بُرے ملاقاتی کو پہچان کر بھونکنے یا دُم ہلانے میں ماہر ہوتا۔ میں ایک محلے میں رہتا ہوں جہاں میرے کمرے کا دروازہ گلی میں کھلتا ہے۔ میرے بے وقت ملاقاتیوں کو معلوم

ہے کہ اس گھر میں کتا نہیں ہے۔ انہیں علم ہے کہ اس گھر میں غریب سا ایک ایڈیٹر رہتا ہے جو کاٹتا نہیں۔ میرا دروازہ جیل خانے کا آہنی گیٹ نہیں، مسکین سے ایڈیٹر کا دروازہ ہے جو ملاقاتی کے ذرا سے دھکے سے کھل جاتا ہے اور مجھے فتح و نصرت سے بھرپور آواز سنائی دیتی ہے۔

''آہاہا، آپ گھر پر ہی ہیں۔ بھئی آپ سے ملے ایک مدت ہوگئی تھی۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ کم بخت پڑوس میں رہتا ہے، کبھی صورت ہی نہیں دکھاتا''۔ اور میں ہتھیار ڈال ہاتھ اٹھا لیتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ جس مدت کا انہوں نے ذکر کیا ہے، اس کی طوالت صرف انیس بیس گھنٹے ہے اور اپنی جس صورت کے متعلق انہوں نے کہا کہ ''کم بخت کبھی دکھاتا ہی نہیں''۔ وہ صورت تو مجھے رات کو خوابوں میں بھی ڈراتی رہتی ہے۔

وہ اس روز بھی آ گئے جس روز میں ایک دردناک افسانہ لکھ رہا تھا۔ میں کرسی گھما کر ان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگے۔ کمرے میں دردناک قسم کا سکوت طاری ہوگیا۔ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے انہوں نے غنودگی کے عالم میں کہا۔ ''اچھا..... اور سنائیے''۔ اور میں سنجیدگی کے عالم میں سوچنے لگا کہ میں نے ابھی انہیں سنایا ہی کیا ہے کہ کچھ اور بھی سناؤں۔ جب انہوں نے تیسری بار کہا۔ ''اچھا ..... اور سنائیے۔'' تو میں نے سوچا کہ یہ حضرت کچھ سنے بغیر تو ٹلیں گے نہیں، کچھ سنا ہی دوں لیکن یہ فیصلہ کرنا محال تھا کہ انہیں پکا گانا سناؤں یا ہلکا پھلکا، فلمی گانا سناؤں یا ملا جلا۔ حالانکہ میں اپنے متعلق اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ میں جب بھی گاتا ہوں تو اس میں سارے ہی راگ راگنیاں ہوتی ہیں اور میرا گانا کسی شریف خاوند کی بیوی کے ہاتھ کے پکے ہوئے پھلکے کی طرح کہیں سے پکا ہوتا ہے کہیں سے کچا۔ میرا گانا سب رس اور سب سُر ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک چیز نہیں ہوتی جسے موسیقی یا شاید موسیقیت کہتے ہیں۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولے۔ ''اچھا..... اور سنائیے۔'' تو میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ میں مسکان کم اور احتجاج زیادہ تھا، مسکین سا اور بے بس سا احتجاج۔

یہ حضرت میرے ملنے والوں کی طویل قطار میں سے ہیں۔ اس روز انیس بیس گھنٹوں کی مدت بعد اس لئے ملنے آئے تھے کہ میں یہ نہ کہہ بیٹھوں کہ ''کم بخت پڑوس میں رہتا ہے، کبھی صورت ہی نہیں دکھائی''۔ کم بختی، تو میری تھی کہ ان کے پڑوس میں مکان لے لیا تھا۔ اس روز وہ اپنی صورت دکھانے آئے تو اڑھائی گھنٹے دکھاتے رہے۔ اونگھتے اونگھتے ان کی نظر میری میز پر اور ریک میں رکھی ہوئی کتابوں پر جا پڑی۔ وہ اچک کر اٹھے اور ریک پر ہلہ بول دیا۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ ہر ملاقات پر ان کی نظر ''اچانک'' کتابوں پر جا پڑتی ہے۔ انہوں نے ہر ملاقات کی طرح اس روز بھی ریک سے ایک کتاب نکالی اور ورق گردانی کرتے ہوئے بولے۔ ''کہو بھئی، آج کل کیا لکھ رہے ہو؟'' پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا انہوں نے یہ کتاب کرسی پر رکھ دی اور ریک سے ایک اور کتاب نکال کر ورق گردانی میں مصروف ہوگئے۔

یہ کتاب بھی انہوں نے کرسی پر رکھ دی اور ان کے ہاتھ میں تیسری کتاب پھڑپھڑانے لگی۔ اس پھڑپھڑ سے آواز آئی۔ ''ہوں ..... اچھا ..... اور سنائیے''۔ حالانکہ میں نے انہیں ابھی تک کچھ نہیں سنایا تھا اور ریک سے کتابوں کے جبری انخلا کو میں بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ تیسری کتاب کو انہوں نے دوسری کرسی پر رکھ دیا اور چوتھی کتاب نکال لی جس کے انہوں نے

تمام ورق ایک منٹ میں الٹ ڈالے اور بولے۔ ''اب کے کس کا انٹرویو دے رہے ہیں؟'' میں ابھی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے ریک سے بیک وقت دو کتابیں نکال لیں اور چوتھی کتاب کو تیسری کرسی پر رکھ دیا۔ معاً دھپ کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا لیکن وہ نہ چونکے۔ میں نے دیکھا، وہ کتاب کرسی کے ٹوٹے ہوئے بید کی راہ فرش پر جا پڑی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''اچھا..... اور سنایئے۔''

پھر ریک سے کتابیں یکے بعد دیگرے نکلتی رہیں، ان کے ورق میرے ملنے والے کے ہاتھ میں پھڑ پھڑاتے رہے اور کتابیں کرسیوں، میز اور تپائی پر بکھرتی رہیں۔ اس تمام عرصے میں ہر پانچ منٹ بعد پھڑ پھڑ کرتے اوراق سے آواز آتی رہی۔ ''اچھا ..... اور سنایئے''۔ ریک خالی ہو گیا تو اسے یوں دیکھنے لگے جیسے ریک انہیں پسند آ گیا ہے اور اٹھا لے جانا چاہتے ہیں۔

آخر مجھے وہ آواز سنائی دی جسے سن کر کسی نے کہا تھا۔ ''تری آواز مکے اور مدینے''۔ انہوں نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ''اچھا بھئی، اجازت دو، چلتا ہوں''۔ لیکن مجھے ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی کیونکہ ریک کے کسی گوشے میں ان کی دست برد سے بچی ہوئی ایک کتاب انہیں نظر آ گئی تھی۔ انہوں نے وہ کتاب بھی نکالی اور کرسی میرے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''آپ تو ہر وقت مصروف رہتے ہیں''۔ اور کتاب اس مرغی کی طرح پھڑ پھڑانے لگی جس کی گردن پر چھری رکھ دی گئی ہو۔ یہ کتاب بھی ایک تپائی پر جا پڑی اور ان کی آواز آئی۔ ''اچھا..... اور سنایئے؟''

آخر وہ واقعی اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی طرف چل پڑے۔ انہیں جاتا دیکھ کر میرے جسم سے نکلتی ہوئی ہوئی جان لوٹ آئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی لوٹ آئے جاتے جاتے ان کی نظر میری میز پر رکھے ہوئے۔ رسالوں پر پڑ گئی تھی۔ انہوں نے رسالوں کے انبار پر جھپٹا مارا اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے رسالوں کو بکھیر ڈالا جس طرح مرغی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو پنجوں سے بکھیرا کرتی ہے۔ آخر ایک رسالہ اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگے۔ بدقسمتی سے اس رسالے میں ایک ایکٹرس کی نیم عریاں تصویر تھی۔ وہ اس صفحے پر یوں رک گئے جیسے وقت و زمانہ ہی اس صفحے پر رک گئے ہوں۔ وہ تصویر کو اور میں انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے رسالے کو آنکھوں سے ذرا دور کر لیا کیونکہ ان کی قریب کی نظر ٹھیک نہیں۔ ان کے چہرے پر رونق آتی جا رہی تھی۔ بہت دیر بعد آہ بھر کے بولے۔ ''ایسے رسالے گھر میں نہ رکھا کریں۔ کتنی ننگی تصویر ہے۔'' انہوں نے جیب سے عینک نکالی اور قمیص کے دامن سے صاف کر کے ناک پر رکھی، ذرا نیچے سرکائی اور کبھی عینک میں سے تصویر کو اور کبھی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ میری یہ کیفیت کہ کبھی ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

وہ کرسی پر بیٹھ کر تصویر کو دیکھنے لگے۔ پیشتر اس کے کہ وہ چمکتی آنکھوں اور رال ٹپکاتے ہونٹوں سے تصویر کی عریانی پر کوئی اور رائے دیتے، رسالے کو بغل میں دبایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''مکے اور مدینے'' سے پھر آواز آئی۔ ''اچھا بھئی، چلتا ہوں۔ کبھی فرصت کے وقت آؤں گا''۔ کس قدر معصوم سی تھی، یہ آواز کتنی سریلی لیکن مجھے ذرہ بھر اچھی نہ لگی کیونکہ انہوں نے میرا حوصلہ بلند رکھنے کے لئے کہا تھا کہ چلتا ہوں۔ پرانے زمانے میں میدانِ جنگ میں ہارتی ہوئی فوج کے گرتے حوصلے کو اسی قسم کے نعروں سے بلند رکھا جاتا تھا۔ ''دشمن پسپا ہو رہا ہے۔ شاباش بہادرو..... وہ دشمن

Pakistanipoint.com

کا جھنڈا گرا''۔

وہ واقعی جا رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی ایکٹرس کی تصویر والا رسالہ بھی جا رہا تھا۔ دروازے سے نکلتے نکلتے کہنے لگے۔''ایسے رسالے گھر میں نہ رکھا کریں''۔ اور وہ رسالہ اپنے گھر میں لے گئے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو اتنا بڑا بک ریک جو اب خالی تھا اور سارے کمرے میں بکھری ہوئی کتابیں مجھے ڈرانے لگیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ تو چلے گئے ہیں لیکن ان کی بدروح کمرے میں رہ گئی ہے۔

ہُو حق سے ویران کمرے میں مجھے ابھی تک اوراق کی دبی دبی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کمرے کا حال حلیہ ایسا تھا جیسے کارپوریشن والے میری جھگی کو ناجائز تعمیرات کے زمرے میں لا کر مسمار کر گئے ہوں اور میرا گھر بار سڑک پر پھینک گئے ہوں۔

سوچا، ان کتابوں کو بکھرا ہی رہنے دوں۔ وہ کہہ گئے تھے کہ کبھی فرصت کے وقت آؤں گا۔ سوچا کہ انہیں پھر سے بکھیرنے کی اور مجھے پھر سے سمیٹنے کی زحمت ہو گی۔ میں نے اس دردناک افسانے پر نگاہ ڈالی جو میں نے ان کے آنے سے پہلے شروع کیا تھا مگر ان کے جانے کے بعد افسانے کا انجام ضرورت سے زیادہ دردناک ہو گیا تھا۔ میں کتابیں سمیٹنے یا نہ سمیٹنے کے متعلق غور کر ہی رہا تھا کہ بیوی کمرے میں آ گئی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ اچھی خاصی ایک بھلے مانس سے افسانہ نویس کی بیوی معلوم ہوتی تھی لیکن اس نے کتابوں کو دیکھا تو اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پہ رکھے، ناک سکیڑ لی اور آنکھوں میں زہر اور چہرے پر قہر پیدا کر کے مجھے یوں دیکھا جیسے اس عورت کو ادب کے نام سے چڑ ہے۔ اس نے مکمل طور پر بے ادب ہو کر کہا۔

''اگر تم میں بس اتنی سی تمیز ہے تو باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر افسانے لکھا کرو۔ صبح مر مر کر کمرے کی ہر چیز ٹھکانے رکھی اور جھاڑی پونچھی تھی۔ ایک کتاب نکالو، اسے دیکھ کر اپنی جگہ رکھو، پھر دوسری کتاب نکالو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں کل ہی ساری کتابیں ردی والے کو تول دوں گی۔ ایسی افسانہ نویسی سے بہتر ہے کہ ضلع کچہری جا کر عرضی نویسی کر لو۔ تم زمین پر بچھے ہوئے بوریے پر بیٹھے زیادہ اچھے لگتے ہو''۔

جنم جنم کے ساتھی کا یہ سلوک دیکھا تو زمانے کی بے وفائی پر بہت رونا آیا۔ بیوی عتاب کا بگولہ بن کر یوں کمرے سے چلی گئی جیسے میکے چلی جائے گی اور میں اس کی واپسی تک افسانہ مکمل کر لوں گا لیکن وہ پھر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑا تھا جس سے اس نے ریک کو صاف کیا اور اس میں کتابیں جمانے لگی۔

ایک ملاقاتی اور ہیں جنہیں میری محبت کھینچ لاتی ہے۔ ہفتے میں ایک دو بار آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''بخدا زمانے میں وہ خلوص ہی نہیں رہا جو ہمارے تمہارے وقتوں میں ہوا کرتا تھا۔ خدا گواہ ہے، میں تو تمہارے سوا کسی اور کے ہاں جاتا ہی نہیں''۔ دراصل یہ صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان وقتوں میں تم ہی ایک بدھو اور بزدل نظر آئے ہو جس میں اتنی سی بات کہنے کی جرأت نہیں کہ بھائی صاحب اس وقت تو میں مصروف ہوں پھر کبھی آیئے گا۔

لیکن اس ملاقاتی کے ساتھ مجھے ہمدردی بھی ہے۔ مظلوم قسم کا شادی شدہ ہے۔ میرا قریبی پڑوسی ہے۔ اس قدر قریبی کہ ہمارے درمیان صرف ایک اینٹ کی دیوار حائل ہے جس کی بلندی ساڑھے سات فٹ ہے۔ اِدھر اُدھر کی سرگوشیاں بھی اُدھر اِدھر سنائی دیتی ہیں لیکن اُدھر کی جو آوازیں اِدھر سنائی دیتی ہیں، وہ اس کی بیوی کی ہوتی ہیں اور وہ سرگوشیاں نہیں ہوتیں۔ میرا دوست تو جیسے گھر میں ہوتا ہی نہیں۔ اکثر میرے ہاں پناہ گزیں ہوتا ہے یا گلی کی نکڑ پر پنواڑی کی

Pakistanipoint.com

دکان پر۔ معزز اور شریف آدمی ہے۔ ہر وہ آدمی جس کی بیوی باتونی اور منہ پھٹ ہو، معزز، شریف اور کم گو ہوتا ہے۔

میرا یہ ملاقاتی گھر میں ہو تو بھی لگتا ہے جیسے گھر میں نہیں ہے۔ اس کی بیوی بولتی کم اور کوستی زیادہ ہے۔ مرد قسم کی مؤنث ہے۔ گھر میں نظم و ضبط کڑا رکھتی ہے۔ جس کی زد میں صرف اس کا خاوند ہی آتا ہے۔ ابھی بچی، بچہ کوئی نہیں ہوا۔ نہ کوئی ایسا خطرہ ہے۔ شادی کو برسوں گزر گئے ہیں۔ بیوی کی صحت نہایت اچھی ہے۔ خاوند کی صحت بے ٹھکانہ رہتی ہے، اکثر متلی اور سر درد کی شکایت کرتا ہے اور کبھی کبھی بیوی کا سر دبایا کرتا ہے۔

میرے ملاقاتیوں کی فہرست میں آنے سے پہلے، یعنی برسوں پہلے، ایک روز اسے علم ہو گیا کہ میں اخبار خریدتا ہوں چنانچہ دوسری صبح وہ ہاکر کے پیچھے پیچھے میرے ملاقاتیوں کی فہرست میں آ گیا۔ آتے ہی آنے کی معافی چاہی۔ ذرا دیر بیٹھنے کی اجازت مانگی اور بغیر اجازت اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے اخبار سے نگاہیں ہٹائیں اور یوں چونک کر مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے مجھ سے پوچھنا چاہتا ہو۔ کہئے صاحب! آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟ لیکن اسے معاً یاد آ گیا کہ میں اس کے گھر نہیں بلکہ وہ میرے گھر بیٹھا ہے، کھسیانہ سا ہو کر کہنے لگا..... اچھا اور سنائیے..... اور وہ دوسرے صفحے پر ٹینڈر نوٹس پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

اس نے گھنٹہ بھر صرف کر کے پورے کا پورا اخبار چاٹ ڈالا اور اخبار کو فرش پر رکھ کر مجھ سے یوں مخاطب ہوا۔ ''کہئے..... کیا خبر ہے؟''..... اور میں ایسا مخلص ثابت ہوا کہ اسے اتنا بھی نہ کہا کہ جناب میں نے تو ابھی اخبار دیکھا ہی نہیں، صبح سے آپ پڑھ رہے ہیں۔

اسے بیٹھے بیٹھے اونگھ آئی اور وہ مراقبے میں چلا گیا۔ میں نے لپک کر اخبار اٹھا لیا تو وہ چونکا اور اونگھتے ہوئے افیمی کی طرح بولا۔ ''اچھا..... اور سنائیے''۔ میں سوچنے ہی لگا تھا کہ اسے کیا سناؤں کہ میرے قریبی پڑوس سے ایک دبنگ آواز ساڑھے سات فٹ کی دیوار پھلانگ کر آئی۔ ''مردود جانے سویرے سویرے کہاں دفان ہو گیا ہے''۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے پڑوسی نے کرسی پر کچھ ایسی بے چینی سے کولہے مٹکائے جیسے دونوں کولہوں پر مچھروں نے کاٹ لیا ہو یا شاید ایک ہی مچھر نے یکے بعد دیگرے دونوں کولہوں کو کاٹ لیا ہو۔ ساڑھے سات فٹ اونچی ایک اینٹ کی دیوار کے پرے سے پھر گھٹا گرجی۔ ''گھر آ لے تو پوچھتی ہوں''۔

میرے پڑوسی نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے اخبار چھین لیا اور اپنے سامنے یوں پھیلا کر پڑھنے لگا جیسے اس کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کی ہو۔ اخباروں کے اتنے بڑے سائز میں یہ خوبی تو ہے کہ ایک اخبار ایک خاوند کو پناہ میں لے لیتا ہے۔

ایک برس گزر گیا ہے۔ میرا یہ ملاقاتی ہر صبح سات سے ساڑھے سات بجے تک میرے ہاں آتا ہے اور مقہور زندگی کا نصف گھنٹہ میرے اخبار کی اوٹ میں چھپ کر گزار جاتا ہے۔ کبھی تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میرا اخبار کم از کم ایک خاوند بھائی کو پناہ میں لے لیتا ہے اور میں ہر صبح اخبار پڑھنے کی علت سے آزاد ہو گیا ہوں لیکن اتنی سی کوفت ضرور ہے کہ وہ اخبار کا ورق الٹتے یہ ضرور کہتا ہے۔ ''کہئے آج کیا تازہ خبر ہے''۔ اور دو منٹ بعد۔ ''اچھا اور سنائیے''۔ وہ شاید یہ جملے کہہ کر یہ یقین کرنا چاہتا ہے کہ میں بھاگ تو نہیں گیا۔

میں اسے بے ضرر ملاقاتی کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ میری کتابوں کو دور سے دیکھتا ہے، ہاتھ نہیں لگاتا۔ صرف ایک روز کہنے لگا۔ ''آپ کی کتابیں دیکھ لوں؟''

اور میرے منہ سے ''دیکھ لیجئے'' یوں نکل گیا جیسے پولیس نے اذیت دے کر مجھ سے اقبال جرم کروا لیا ہو۔ وہ کتابوں کے ریک پر ٹوٹ پڑا۔ دو چار کتابیں دیکھ کر پیچھے ہٹ آیا۔ میں تو اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا، چلتا ہوں''۔ چلتے چلتے کہنے لگا۔ ''ایک کتاب لئے جا رہا ہوں''۔ مجھے کتاب کے چلے جانے کا اتنا ہی غم تھا جتنی اس کے جانے کی خوشی، لہٰذا حساب برابر رہا لیکن میں سراغ نہ لگا سکا کہ اس کے ساتھ کون سی کتاب چلی گئی ہے یا وہ کون سی کتاب کے ساتھ چلا گیا ہے۔

اس کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد ساڑھے سات فٹ اونچی، ایک اینٹ کی دیوار کے اس طرف سے اس کی گھر کی سخت زہریلی اور عتاب آلود آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس عتاب کے طوفان میں مجھے اس ملاقاتی کی دھیمی دھیمی اور ادھوری ادھوری سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں لیکن کوئی بات صاف سنائی نہ دیتی تھی۔ نہ مرد کی، نہ مرد قسم کی بیوی کی۔ اتنا ضرور پتا چلتا تھا کہ خاوند نے ہاتھ دکھتی رگ پر یا پاؤں دُم پر رکھ دیا ہے۔

بیوی کہہ رہی تھی۔ ''عقل خود میں نہیں اور آیا ہے بڑا مولوی مجھے کتابیں پڑھانے۔ ارے کتابیں تُو پڑھ، اپنے پچھلے بھٹیاروں کو پڑھا جا کے کتابیں جو ابھی تک بھٹ جھونک رہے ہیں یہ کتاب اپنی ماں کو پڑھا جس نے تجھ جیسا مورکھ جن کر میرے پلے باندھ دیا ہے۔ جلدی پڑھا اسے، کہیں تجھ جیسا ایک اور ٹٹو نہ جن دے''۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا ملاقاتی، یاس و الم اور شکست کی منہ بولتی تصویر بنا میرے ہاں آیا۔ کہنے لگا۔ ''آپ کی کتاب واپس کرنے آیا ہوں''۔ اس نے کتاب میری میز پر رکھی اور سر جھکائے جس طرح آیا تھا اسی طرح قدم گھسیٹتا دروازے کی طرف چل پڑا۔ دروازے میں رک کر کہنے لگا۔ ''بیوی کے لئے لے گیا تھا یہ کتاب لیکن وہ کہتی ہے کہ اس نے یہ کتاب پڑھی ہوئی ہے''۔ میں نے دیکھا۔ کتاب کا نام تھا۔ ''سگھڑ بیوی'' اس بے چارے شامت کے مارے نے یہ کتاب اپنی بیوی کے ہاتھ میں جا دی تھی۔

یہ تو ہیں میرے ملاقاتیوں کی دو خطرناک قسمیں۔ چند قسمیں اور بھی ہیں۔ ان میں ایک حضرت ہیں جو بڑے حضرت ہیں۔ آٹھویں دسویں روز آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''میں آگے جا رہا تھا۔ آپ کا دروازہ کھلا دیکھا تو چلا آیا۔ سوچا، آپ کو ذرا دیکھتا چلوں''۔

آپ آتے ہیں، بیٹھتے نہیں کہتے ہیں۔ ''جلدی میں ہوں''۔ میں اکتاہٹ سے کرسی پر پہلو بدلتا ہوں تو آپ لپک کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں اور بڑی تیزی اور پیار سے کہتے ہیں۔ ''بیٹھو، بیٹھو، بیٹھے رہو بھئی۔ کیوں تکلف کرتے ہو۔ میں جا رہا ہوں''۔ لیکن وہ جاتے نہیں۔ آہ بھرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''اچھا..... اور سنایئے'' ایسی تین ملاقاتوں میں انہوں نے یوں کیا کہ میری انگیٹھی پر رکھی ٹائم پیس کو کیس سے نکال کر ہر پہلو سے دیکھا۔ الارم کی سوئی گھما کر چابی دی۔ الارم بجنے لگا تو میرے بچے دوڑتے آئے۔ دروازہ کھلا دیکھ کر دو چار بچے محلے کے بھی کمرے میں آ گئے۔ میرے ملاقاتی نے الارم پر بے لاگ تبصرہ کیا۔ پھر انہیں ٹائم پیسوں کی جتنی قسمیں یاد تھیں، ان کے الارموں کی موسیقیت کی راگ راگنیاں سنائیں۔ پھر دنیا بھر کی ٹائم پیسوں کے مختلف ڈیزائنوں پر معلوماتی تقریر کی۔ تقریر کے دوران الارم بجتا رہا اور بچے تالیاں بجاتے رہے۔ مجھے اتنا ہی پلے پڑا کہ انہوں نے ماؤزے تنگ، چیانگ کائشیک، سوئیکارنو اور سہارتو کے نام بھی لئے تھے۔ شاید یہ بتایا تھا کہ یہ لوگ کتنے کتنے بجے کا الارم لگا کر سوتے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد جب میری بیوی نے مجھ

سے بے وقت الارم بجانے پر جواب طلبی کی اور میرا جواب سنا تو بیوی نے بتایا کہ ان کم بختوں کے گھر نہ ٹائم پیس ہے نہ کوئی اور گھڑی۔ لوکو ورکشاپ کے ہوٹر اور اپنے بچے کے رونے سے وقت معلوم کر لیتے ہیں۔

میرے ملنے والوں کی ایک نسل اور بھی ہے۔ یہ بھی ہمارے محلے دار ہیں۔ ایک روز قبرستان میں ایک جنازے پر مل گئے۔ مجھے مرنے والے کی موت کا بہت ہی رنج تھا کیونکہ وہ کوئی میرا ملاقاتی نہیں تھا۔ ہاں تو میرے یہ محلے دار صاحب، قبرستان میں بڑی گرم جوشی سے ملے اور بے تکے قہقہے لگا کر بولے۔ ''آپ تو کبھی ملتے ہی نہیں۔ ہم تو آپ کے قریبی رشتہ دار ہیں''۔ میں نے انہیں سراپا سوالیہ نشان بن کے دیکھا۔ میرے کسی بھی قریبی رشتہ دار کی داڑھی ویت نام کے ہوچی منہ کی طرف نہیں۔ نہ ناک فرانس کے صدر ڈیگال کی طرح ہے۔ انہوں نے ایک اور قہقہہ داغ کر میرے کندھے پر دھپ سے دھپڑ جمایا اور بولے۔ ''رشتہ دار ہی ہوئے نا۔ آپ افسانہ نویس، ہم وثیقہ نویس''۔

وثیقہ نویس صاحب کا رشتہ میرے ساتھ ایسا طے ہوا کہ دسویں بارہویں روز قہقہے لگاتے آتے ہیں اور یک لخت سنجیدہ ہو کر مجھے مسجد میں نماز پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انہیں ان تصویروں سے بڑا ہی پیار ہے جو میرے کمرے میں دیواروں سے لٹک رہی ہیں۔ وثیقہ نویس صاحب نماز کی تلقین کرتے کرتے کرسی گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگاتے ہیں۔ بوٹوں سمیت کرسی پر کھڑے ہو کر ایک تصویر اتارتے ہیں۔ تصویر کے پیچھے جمع شدہ گرد، ان کی داڑھی پر پڑتی ہے تو وہ ہاتھ سے داڑھی کو جھاڑتے اور ''فو فو'' کرتے ہیں۔ کرسی سے اترتے ہیں اور تصویر کو دیکھ کر میز یا کرسی یا تپائی پر رکھ کر میری طرف دیکھتے ہیں اور صدر ڈیگال جیسی ناک اور ہوچی منہ جیسی داڑھی کے درمیان مسکراہٹ کا دھوکا سا پیدا کر کے کہتے ہیں۔ ''بڑی اچھی تصویر ہے۔ ہوں .....اچھا.....اور سنائیے''۔

پیشتر اس کے کہ میں فیصلہ کر پاؤں کہ انہیں پکا گانا سناؤں یا ہلکا پھلکا یا صلواتیں، وہ کرسی گھسیٹ کر ایک اور تصویر اتار رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی ہر ملاقات کے بعد دیواروں سے لٹکتی اور انگیٹھی پر رکھی ہوئی تمام تصویریں، میز، تپائیوں اور کرسیوں پر بکھری ہوئی ہوتی ہیں اور مجھے اتنا بھی یاد نہیں ہوتا کہ کون سی تصویر کہاں سے اتری ہے۔ میں نہایت جلدی سے بیوی کے ڈر سے، تصویریں پھر لٹکا دیتا ہوں۔ اس طرح میرے کمرے کی تصویریں متحرک تصویریں بن گئی ہیں۔

گھر پہ ملنے والوں کی ایک نسل اور بھی ہے جو ذرا زیادہ ہی تشویشناک ہے۔ یہ حضرت مہینے میں ایک بار آتے ہیں اور میرے کسی مضمون یا افسانے کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ کبھی تو مجھے ٹالسٹائی بنا جاتے ہیں، کبھی وکٹر ہیوگو کا خطاب دے جاتے ہیں اور کبھی اوسکر وائلڈ کا ہم پلہ قرار دے جاتے ہیں۔ ایک بار میرے ایک جنگی مضمون پر مجھے نشانِ حیدر بھی دے گئے تھے لیکن میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ان کی ہر ملاقات تقسیم انعامات و تمغہ جات کی تقریب ہوتی ہے۔ اس تقریب کے بعد وہ اپنا ایک افسانہ میرے سامنے رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے ٹھیک ٹھاک کر کے کسی رسالے میں چھپوا دینا۔ ان کے افسانوں کا ایک انبار میرے پاس جمع ہو گیا ہے۔ میرے اس ملاقاتی میں یہ خوبی ہے کہ نیا افسانہ دے کر پرانے افسانے کے متعلق کوئی بات نہیں کرتے۔ شاید وہ گڑے مُردوں کو اکھاڑنا پسند نہیں کرتے۔

ملنے والوں کی ایک نسل اور ہے جو راستے میں ملتی ہے۔ ایک بار اس نسل کے ایک ملاقاتی مل گئے۔ میں سائیکل پر گھر کو آ رہا تھا وہ بھی سائیکل پر پیچھے سے آ

رہے تھے اور ہم دونوں کی سائیکلیں پہلو بہ پہلو چلنے لگیں۔ بدقسمتی سے وہ بھی محلے دار ہے پیار و محبت سے لبریز سلام کیا۔ میرے بچے بچے کی خیریت پوچھی پھر میرے بچوں کی تعریف کی اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میرے بچے شریف ہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''اچھا..... اور سنائیے''۔ کچھ اور سننے سے پہلے ہی پوچھنے لگے۔ ''کارپوریشن میں کسی سے واقفیت ہے؟'' میری شامت جو آئی تو میں نے کہہ دیا۔ ''ایک اہل کار سے راہ و رسم ہے''۔

مجھے سخت پچھتاوا ہوا کیونکہ انہوں نے اپنی ایک درخواست کی داستان شروع کر دی تھی۔ ہم سائیکلوں پر چلے جا رہے تھے اور ان کی زبان موٹر سائیکل کی طرح چل رہی تھی۔ میں اس قدر سمجھ پایا کہ نلکا لگوانے یا نلکا کٹ جانے کی کوئی بات ہو رہی ہے۔ سامنے سے تین رکشے پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو اُڑے آ رہے تھے۔ میں سڑک کے اس کنارے ہو گیا اور میرا ملاقاتی سڑک کے دوسرے کنارے۔ رکشے نکل گئے تو ہماری سائیکلیں پھر اکٹھی ہو گئیں۔ میرے ملاقاتی نے کہا۔ ''اچھا..... اور سنائیے''۔ میری ایک بار پھر شامت آئی تو میں نے کہہ دیا۔ ''آپ کچھ سنا رہے تھے''۔

''اوہ..... ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ کارپوریشن میں آپ کا ملنے والا ہے، اسے یہ کہنا ہے کہ میری درخواست.....'' پھر وہی داستان شروع ہو گئی لیکن وہیں سے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ آگے سڑک پر پانی جمع تھا جس میں سے کاریں کیچڑ اور چھینٹے اچھالتی چلی جا رہی تھیں۔ میں سڑک کے اس کنارے ہو گیا اور میرا ملاقاتی دوسرے کنارے۔ ہماری سائیکلیں دور آگے جا کر پھر قریب ہوئیں تو اس نے کہا۔ ''اچھا..... اور سنائیے''۔ لیکن میں نے چپ سادھ لی اور اس نے اپنی درخواست کی کہانی وہاں سے شروع کی جہاں تین رکشے آ گئے تھے۔

وہ اپنی داستان میں مگن تھا اور میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ آگے گٹر تھا جس کا ڈھکنا غائب تھا۔ میرا ملاقاتی سیدھا گٹر میں جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دیکھ لے گا لیکن وہ اپنی درخواست کی روئیداد سنانے میں اس قدر محو تھا کہ گٹر تک جا پہنچا۔ میں نے اسے گھبرا کر دھکا دیا تو اس کا سائیکل بے قابو ہو کر پرے چلا گیا۔ اس طرح سے وہ گٹر میں گرنے سے بال بال بچ گیا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

وہ بال بال بچ کر پھر بولا۔ ''اچھا اور سنائیے''۔ اور داستان وہاں سے شروع کر دی جہاں کاریں کیچڑ اور چھینٹے اچھالتی گزری تھیں۔ خدا خدا کر کے میری گلی آ گئی اور میں رک گیا وہ بھی رک گیا۔ میں سائیکل سے تو نہ اترا، ایک پاؤں زمین پر رکھ دیا۔ وہ بھی سائیکل سے نہ اترا اور ایک پاؤں زمین پر رکھ دیا اور کہانی جاری رہی۔ میرا کولہا جو سیٹ پر رکھا تھا۔ درد کرنے لگا تو میں نے ٹانگ گھمائی اور سائیکل سے اتر کھڑا ہوا۔ اس نے بھی ٹانگ گھمائی اور سائیکل سے اترنے لگا لیکن وہ سائیکل کو نہ سنبھال سکا۔ سنبھالتے سنبھالتے سائیکل گر پڑا اور وہ سائیکل کے اوپر گرا۔ میں جلدی سے کودا اور سائیکل پر سوار ہو کر گلیوں میں غائب ہو گیا۔

اب یہ حال ہے کہ مجھے آئے دن اس کی درخواست کی کہانی سننا پڑتی ہے اور میں اس انتظار میں ہوں کہ وہ ایک بار پھر میرے ساتھ سائیکل پر سڑک پر چلے اور سامنے بغیر ڈھکنے کے گہرا گٹر آ جائے اور میں اس ملاقاتی کی توجہ اپنی طرف کر لوں اور جب وہ گٹر میں اوندھے منہ گرے تو میں گٹر کے اوپر جھک کر صرف اتنا کہوں۔ ''اچھا..... اور سنائیے''۔

❁❁❁

Pakistanipoint.com

ضرب سکندری
قسط: 3

سانحہ مشرقی پاکستان

پس منظر، اسباب، واقعات

عوامی لیگ کے ایک رہنما نے حوالدار کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا۔
''تمہارا سالا پنجابی کمانڈنگ آفیسر ہم سے زیادہ اہم ہے؟''

☆ سکندر خان بلوچ

سمندری طوفان، فوج اور عوامی لیگ

مشرقی پاکستان طوفانی آندھیوں کی سرزمین ہے۔ کوئی سال ایسا نہیں ہوتا جب وہاں طوفان نہ آتے ہوں اور طوفان اتنے شدید ہوتے ہیں کہ پوری پوری آبادیاں ملیا میٹ ہو جاتی ہیں۔ بعض مقامات پر تو انسانوں کے ساتھ ساتھ ہر چیز تباہی کا نشانہ بن جاتی ہے حتیٰ کہ درخت تک جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ انسانی آبادیوں کا نام ونشاں تک نہیں رہتا۔ ویسے تو خلیج بنگال کا وسیع ساحل غضبناک طوفانوں کو جنم دیتا ہے لیکن دریائے میگھنا کا ڈیلٹا طاقتور طوفانوں کے لئے بہت ہی مشہور ہے۔ اس کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ ان طوفانوں کی وجہ آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ ایک پرانی کہانی کے مطابق اٹھارہویں صدی کے ایک طوفان میں "سینڈوپ" کا پورا جزیرہ ملیا میٹ ہو گیا تھا جو غالباً اس وقت عربوں اور

ملتے

دراوڑ مچھیروں کی آبادی تھی۔ کوئی ذی روح زندہ نہ بچ

12/13 نومبر 1970ء کی رات کو ایک ش

سمندری طوفان سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آیا۔ ش

شروع میں جب بذریعہ ہیلی کاپٹر علاقے کا سروے

گیا تو کوئی بڑی انسانی تباہی نظر نہ آئی صرف ہر جگہ

پانی نظر آیا۔ سول ایڈمنسٹریشن سے فوجی مدد کے لئے پو

گیا تو انہوں نے اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ یہ سب

صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان کی موجودگی میں ہوا جو چی

سے واپسی پر کچھ دیر کے لئے ڈھاکہ میں رکے۔ سو

ایڈمنسٹریشن کو بھی طوفان کی وسعت اور تباہی کا علم نہ

کیونکہ علاقے میں موجود سول افسران میں سے کوئی ز

بچا ہی نہ تھا۔ دو دنوں بعد جب طوفان کا پانی کم ہ

شروع ہوا اور لاشیں تیرنے لگیں تو فوجی انتظامیہ

ہوائی سروے دوبارہ کیا اور وسیع تباہی دیکھ کر حیران

گئی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تیر رہی تھیں۔ بات سو

ایڈمنسٹریشن تک بھی پہنچائی گئی۔ پریس کو بھی پتہ چلا تو انہوں نے 15 نومبر کی صبح کو موٹی موٹی ''ہیڈ لائنز'' لگائیں۔ ''فوج کہاں ہے؟ فوج کیوں نہیں پہنچی؟'' شام تک فوج مختلف مقامات کے لئے روانہ ہوگئی۔ امدادی کاروائیاں فوری طور فوج کی معرفت شروع ہوگئیں۔ مغربی پاکستان میں اس قدرتی آفت کا مکمل ادراک چند دن بعد ہوا اور یہاں بھی ہر قسم کی امدادی کارروائیاں شروع ہوئیں۔

عوامی لیگ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی اور منظم پارٹی تھی۔ اس کے زیادہ تر پارٹی لیڈرز اپنے اپنے طالب علمی کے دور میں بدمعاش قسم کے طالبعلم رہنما رہ چکے تھے لہٰذا ان کا پارٹی کنٹرول غنڈہ گردی اور دھونس دھاندلی کی وجہ سے زیادہ تھا بہ نسبت ان کی ذاتی شرافت اور ذاتی مقبولیت کے۔ مغربی پاکستان کے تمام اخبارات اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کا تجزیہ تھا کہ عوامی لیگ اکثریت تو حاصل کرلے گی لیکن 60 فی صد سے زیادہ نہیں بڑھے گی۔ کم از کم 40 فیصد ووٹ دوسری پارٹیاں حاصل کریں گی جن میں جماعت اسلامی اور مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی سرفہرست تھیں۔

عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں مقبول تو تھی لیکن سنجیدہ حلقوں کے لوگ مخالف تھے کیونکہ وہ عوامی لیگ کی دھونس دھاندلی۔ غنڈہ گردی اور علیحدگی پسندی والی سیاست ناپسند کرتے تھے۔ الیکشن کا اعلان ہو چکا تھا اور عوامی لیگ کو اپنے ذرائع سے پتہ چلا کہ ان کی مقبولیت میں دن بہ دن کمی آرہی ہے۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ سمندری طوفان اور بنگالی نیشنلزم کو الیکشن کا موضوع بنا کر ووٹ حاصل کئے جائیں۔ عوامی لیگ چونکہ غنڈہ گردی میں ماہر تھی۔ ''را'' کی امداد بھی حاصل تھی لہٰذا عوامی لیگ نے مندرجہ ذیل اقدامات اٹھائے۔

اول: طوفان کی تباہی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور اخبارات میں حکومتی بے حسی کا طوفان کھڑا کر دیا جس سے مراد مغربی پاکستان تھا۔

دوم: اخبارات میں فوج کی امدادی کارروائیوں کو بالکل بلیک آؤٹ کرا دیا۔ زیادہ تر فوج کا تعلق چونکہ مغربی پاکستان سے تھا اس لئے اگر صحیح خبریں شائع ہوتیں تو اس کا تمام تر کریڈٹ مغربی پاکستان کو جاتا جو ان کی بنگالی نیشنلزم پالیسی کے خلاف تھا۔ حالانکہ فوج نے دن رات کام کیا اور ہر جگہ امدادی سامان پہنچایا۔

سوم: فوج چونکہ مقامی علاقہ اور بنگالی زبان سے ناواقف تھی لہٰذا عوامی لیگ نے آفت زدہ علاقے میں ہر جگہ اپنے غنڈہ نما رہنما مقرر کر دیئے اور فوج کو مجبور کیا کہ تمام سامان انہی کی معرفت تقسیم کیا جائے۔ لیکن ان لوگوں نے سامان لیا۔ تھوڑا بہت اپنے لوگوں کو دیا اور باقی اپنے پاس سٹوروں میں جمع کرلیا اور بدنام فوج کو کیا کہ وہ امدادی سامان دے ہی نہیں رہی۔ جن لوگوں کو تھوڑا بہت سامان دیا گیا تھا وہ عوامی لیگ کے نام پر تقسیم کیا تاکہ فوج بدنام ہو اور عوام میں عوامی لیگ کی خدمت گزار پارٹی کے طور پر مقبولیت ہو۔ ان لوگوں کی غنڈہ گردی کا یہ عالم تھا کہ مارچ 1971ء میں جب فوجی کاروائی شروع کی گئی تو بہت سے مقامات پر امدادی سامان کے بھرے ہوئے سٹور ملے۔ ان لوگوں نے شاید آنے والے حالات یا کسی متوقع کارروائی کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا تھا۔

چہارم: مغربی پاکستان میں ریلیف ایجنسیوں اور مخیّر حضرات نے فنڈز، ادویات، کمبل اور ضرورت کی بہت سی اشیاء اکٹھی کیں لیکن ان لوگوں نے جب ڈھاکہ حکومت کو مطلع کیا اور اپنی خدمات بمعہ ضروری اشیاء کے پیش کیں تو بنگالی سینئر افسران نے کسی قسم کی مدد قبول کرنے کے لئے لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہاں اکٹھا کیا گیا سامان بعض مقامات پر پڑا پڑا خراب

ہو گیا لیکن ڈھاکہ حکومت کے عدم تعاون کی وجہ سے متاثرین تک نہ پہنچ سکا۔ اس تمام عرصے میں اخبارات نے مغربی پاکستان کی بے حسی اور فوج کی نالائقی کے خلاف ہر قسم کا زہر اگلا۔ اپنی مصیبت کا ذمہ دار مغربی پاکستان اور فوج کو ٹھہرایا۔ مغربی پاکستان میں وہ اخبارات پہنچتے نہ تھے اس لئے وہاں کے حالات کا صحیح پتہ نہ چل سکا اور فوج کو ویسے بولنے کی اجازت نہیں ہوتی سو تمام جوان اور آفیسرز دل ہی دل میں کڑھتے رہتے لیکن انہیں بتایا گیا کہ قومی مفاد میں خاموش رہیں۔

یہ سب کچھ عوامی لیگ کے زیر اثر کیا جا رہا تھا۔ لیکن فیڈرل گورنمنٹ عوامی لیگ کو ہر قیمت پر خوش رکھنا چاہتی تھی نہ جانے کیوں؟ اسلام آباد حکومت انہیں جتنا خوش کرنے کی کوشش کرتی وہ اتنے ہی چوڑے ہوتے۔ عوامی لیگ کے دباؤ کے تحت چار نئی فوجی بٹالین اور بہت سی نیم فوجی تنظیمیں قائم کی گئیں جن میں سو فیصد بنگالی بھرتی کیے گئے۔ چند سال ملازمت والے بنگالی جوانوں کو ترقیاں دے کر NCOS اور JCOS رینک دیئے گئے۔ یہی لوگ آگے چل کر ہمارے خون کے پیاسے بنے اور بھارتیوں کے ساتھ مل کر مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کا خون بہایا۔ یہ سب کچھ عوامی لیگ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔

جب طوفان کا پانی نیچے ہوا اور فوج ہر جگہ امدادی کارروائیوں میں مشغول تھی تو عوامی لیگ کے لیڈروں کو ہیلی کاپٹرز پر تمام متاثرہ علاقوں میں لے جایا گیا تاکہ وہ خود دیکھ سکیں کہ فوج نے کتنی محنت اور ایمانداری سے ہر جگہ امداد پہنچائی ہے۔ ایک ایسے ہی دورے میں شیخ مجیب الرحمن کو تمام اہم مقامات پر لے جایا گیا۔ وہ فوجی کارروائیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ایک سامنے کھڑے ہوئے بنگالی آفیسر کو شاباش دی۔ فوجی آفیسر نے فوری کہا: ”سر یہ بات اگر اخبارات کو بھی بتا دیں تو

ہم شکر گذار ہوں گے''۔ شیخ صاحب نے لاپرواہی سے جواب دیا: ''اوہ! وہ دوسری بات ہے''۔ فوج سارا دن کام بھی کرتی اور عوامی لیگ کے مقامی غنڈوں سے جھاڑیں اور گالیاں بھی کھاتی۔ شکایات کی جاتیں لیکن کوئی کارروائی نہ ہوتی۔ ایک دن نمبر 1 ایسٹ بنگال رجمنٹ کا ایک بنگالی حوالدار ''بھولا'' نامی جزیرے میں ایک چھوٹی کشتی لے کر امدادی سامان کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس علاقے میں اس کی یونٹ امدادی کارروائیاں کر رہی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر اس حوالدار کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر خود امدادی کارروائیاں دیکھنے کسی نزدیکی جگہ گیا۔ اتنی دیر میں عوامی لیگ کا طفیل نامی ایک مقامی رہنما وہاں آیا۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ وہ ساتھ والے جزیرے کا رہائشی تھا اور فوج کی کشتی میں وہاں جا کر اپنے لوگوں پر رعب ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے حوالدار کو حکم دیا کہ وہ اسے اس کشتی پر ساتھ والے جزیرے پر لے جائے۔ حوالدار نے جواب دیا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے اور اپنے کمانڈنگ آفیسر کا انتظار کر رہا ہے۔ مسٹر طفیل نے اسے گالی دے کر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور کہا: ''تمہارا سالا پنجابی کمانڈنگ آفیسر ہم سے زیادہ اہم ہے؟''

یہ حوالدار 1965ء کی جنگ میں مغربی پاکستان میں بیدیاں کے محاذ پر لڑ چکا تھا۔ تھپڑ کھا کر اس نے سرکاری کارروائی کا انتظار کیا۔ عوام میں طفیل صاحب کا بہت رعب و دبدبہ قائم ہو گیا کہ فوجیوں کو بھی تھپڑ مار سکتا ہے۔ بات ساری فوج میں پھیلی۔ رپورٹ اعلیٰ حکام تک گئی لیکن کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ بلکہ بتایا گیا: ''ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگذر کریں''۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ تھا اور فوج کی بہت بڑی تذلیل۔ اس واقعہ سے تمام فوج میں بہت بددلی پھیلی اور بنگالی فوجیوں کو پتہ چل گیا کہ اصل حاکم کون ہیں؟ اس کے بعد سے بنگالی جوانوں میں نہ وہ وفاداری رہی اور نہ مغربی پاکستانی فوجیوں میں بے عزتی کا بدلہ لینے کی جرأت۔ عوامی لیگ کے غنڈے مختلف انداز سے ان پر طنز کرتے۔ گالیاں دیتے، تھوک دیتے بعض اوقات ائیر پورٹ پر کھڑے جوانوں کے سامنے بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں کو قتل کیا گیا۔ جوان دیکھ کر غصے سے رائفل کے بٹ زمین پر دے مارتے لیکن وہ یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

مغربی پاکستان سے جانے والے سیاستدان، جناب ممتاز دولتانہ اور ولی خان کو لوگوں نے ائیر پورٹ پر پکڑ لیا اور ہاتھا پائی کی لیکن حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ فوج کی امدادی کارروائیاں ختم ہونے کے بعد بھی اسے خدمت کے لئے انہی علاقوں میں رکھا گیا جہاں نہ صاف پینے کا پانی تھا نہ مناسب خوراک۔ پانی میں چل چل کر ان لوگوں کے پاؤں گل گئے۔ جونکوں سے جسم زخمی ہو گئے۔ بہت سے لوگ بیمار ہو گئے۔ انہیں صرف اس لئے وہاں پڑا رہنے دیا گیا کہ کہیں عوامی لیگ والے ناراض نہ ہو جائیں۔ فوج کی قیمت پر عوامی لیگ کے لوگ ہیرو بن گئے۔ پھر ظاہر ہے کہ الیکشن میں انہیں کون روک سکتا تھا۔

افسوس کہ ڈرپوک اور عاقبت نااندیش قیادت لے ڈوبی۔ مزید افسوس یہ کہ فوج نے تذلیل برداشت کی۔ ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی صعوبتیں برداشت کیں۔ امدادی کاروائیاں کر کے ہزاروں لوگوں کی جانیں بچائیں۔ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے آخری دم تک لڑی۔ بے پناہ قربانیاں دیں۔ ہزاروں کی تعداد میں شہادتیں قبول کیں۔ ہتھیار ڈالنے اور دشمن کی قید جیسی ذلت برداشت کی۔ لیکن پھر بھی مجرم فوج ہی ٹھہری عیش کرنے والے عیش کر کے چلے گئے۔ فوج کو انصاف کون دے گا؟

(جاری ہے)

PakistanPoint www.pakistanipoint.com